انوار السوانح

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

حیات و خدمات



ڈاکٹر غلام محمد کھچی

اسسٹنٹ پروفیسر۔ واپڈا کالج گڈو، ضلع کشمور

دار الکتاب

انورُالسوانح

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ...... حیات اور علمی خدمات

مرتب

ڈاکٹر غلام محمد کھچی

اسسٹنٹ پروفیسر واپڈا کالج گڈو، ضلع کشمور

دار الکتاب

۳۸- غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

نام کتاب: انوار السوانح

نام مؤلف: پروفیسر ڈاکٹر غلام محمد کھچی

معاونِ خصوصی: علی عثمان حالی

سن اشاعت: ۱۴۳۱ھ مطابق اکتوبر ۲۰۱۰ء

تعداد: 500

قیمت:

ملنے کے پتے

☆ قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی ☆ نور محمد کتب خانہ، آرام باغ کراچی۔

☆ ادارۂ اسلامیات، کراچی، لاہور ☆ دار الاشاعت، کراچی

☆ جامعہ دار العلوم کراچی 14 ☆ بیت الکتب گلشن اقبال، کراچی

☆ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی ☆ بیت العلم، کراچی، لاہور

☆ اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن، کراچی ☆ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور

☆ مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی ☆ ادارۃ الانور، بنوری ٹاؤن، کراچی

☆ مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اُردو بازار لاہور ☆ مکتبۃ المصباح، اُردو بازار لاہور، راولپنڈی

☆ جامعہ فاطمۃ الزہرا للبنات، واپڈا کالونی TPS گڈو بیراج، کشمور

☆ علی عثمان حالی، M-20، واپڈا کالونی TPS گڈو، تحصیل و ضلع کشمور

فون نمبر:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت علامہ انور شاہؒ صاحب
کے
والد محترم کا اظہارِ غم

''میں ہمیشہ سے اس آرزو میں تھا کہ حضرت مرحوم میرا جنازہ پڑھائیں گے اور وقتاً فوقتاً فاتحہ سے یاد فرماتے رہیں گے۔ افسوس کہ خاکسار کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔''

انتساب

اپنے مربی ومحسن استاذ المکرم حضرت مولانا علامہ

سیّد محمد متین ہاشمی نور اللہ مرقدہٗ

کے نام

جن کی خصوصی توجہ اور رہنمائی اور پدرانہ ومربیانہ شفقت سے احقر اس عظیم محدث کی سوانح اور علمی کمالات پر قلم اٹھانے کے قابل ہوا۔

اللہ تعالیٰ محسن موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

فہرست عنوانات

باب: ۱...... ماضی کے آئینہ میں

باب: ۲...... علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا تعارف

باب : ۳...... شاہ صاحب کا ذوقِ تفسیر

باب : ٤...... شاہؒ صاحب علم حدیث کے میدان میں

باب : ۵...... شاہؒ صاحب کی فقہی تحقیق وتدقیق

باب : ٦— علامہ کشمیریؒ کی فلسفہ وکلام کے میدان میں کدوکاوش

باب : ۷...... علامہ کشمیریؒ اور تصوف کا مسلکِ طریقت

باب : ۸...... مولانا کشمیریؒ کا ذوقِ سخن گوئی

باب : ۹...... تحریک ختم نبوت میں علامہ کشمیریؒ کا کردار

باب : ۱۰...... تحریکِ آزادی میں شاہ صاحبؒ کا حصہ

باب : ۱۱...... علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ

باب : ۱۲...... تصانیف اور علمی نگارشات

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله وحده والصلوة و السلام على من لا نبيّ بعده

اعتراف الحقيقة

انّى رأيت انّه لا يكتب انسان كتابا فى يومه الا قال فى غده:

"لو غيّر هذا، لكان أحسن؛ ولو زيد كذا، لكان افضل ؛

ولو قدّم هذا، لكان يستحسن؛

ولو ترك هذا، لكان اجمل۔"

و هذا من اعظم العبر۔ وهو دليل على استيلاء النقص على جملة البشر۔

(للعماد الاصبهانى)

ربّ يسّر ولا تعسّر، وتمّم بالخير! امين!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ از

یادگارِ اسلاف استاذ العلماء مکرمی ومخدومی استاذ گرامی
حضرت مولانا محمد نافع صاحب دامت برکاتہم
جامعہ محمدی شریف، ضلع چنیوٹ ......۰۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ علیہ علمی دنیا کی ایسی عظیم ہستی ہیں۔ جن کے تبحر علمی کے اپنے پرائے سب معترف ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جناب کی شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ اتنی بڑی شخصیت کے بارے کچھ لکھنا بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے محترم پروفیسر ملک غلام محمد کھچی صاحب نے اپنی استعداد کی حد تک سعی کی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اپنے مقالے کا عنوان ''انور السوانح'' یعنی ''حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے علمی کارنامے'' پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیا اور اپنی طالب علمانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر محنت سے جدوجہد کی اور ہمارے ممدوح حضرت علامہ سید محمد متین ہاشمی مرحوم مغفور کی رہنمائی اور مشورے سے مقالہ ھٰذا لکھنے میں کامیاب ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی نے پروفیسر غلام محمد صاحب کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عنایت کی۔

پروفیسر صاحب نے کئی اہم علمی شخصیات کو اپنا مقالہ دکھایا جنہوں نے پسند فرمایا، اب پروفیسر صاحب اپنے مقالے کو عوام وخواص کے استفادہ کیلئے طباعت کرانا چاہتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ کریم جلاشانہ' پروفیسر غلام محمد صاحب کی اس جدوجہد کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صادق آبادی صاحب دامت برکاتہم

خلیفۂ مجاز حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

دار العلوم دیوبند برصغیر بلکہ عالم اسلام کی وہ عظیم دینی درسگاہ ہے جس کا فیض چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیام قیامت پھیلتا رہے گا۔ الحمد للہ! دیوبند کی کوکھ سے جنم لینے والے ہر فرزند نے اپنی مادر علمی کا فیض عام کیا ہے۔ شاید ہی زمین کا کوئی خطہ ایسا ہو جس مین بالواسطہ یا بلا واسطہ دیوبند کا فیض نہ ہو۔ یوں تو اس کا ہر فرزند اپنی جگہ علم وعرفان کا آفتاب ومہتاب ہے، لیکن بعض فضلاء افق عالم پر ایسے آفتاب بن کر چمکے کہ جن کہ انوار وتجلیات سے پورا عالم منور ہوا۔ انہی آفاقی شہرت رکھنے والے علماء میں سے ایک نمایاں ترین نام امام حدیث مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالی کا ہے۔ علم حدیث میں آپ کی امامت مسلّم ہے۔ چناچہ معاصر علماء میں سب سے بڑے مؤرخ علامہ عبدالحی حسنیؒ کی شہادت ہے: وانتہت الیہ رئاسۃ تدریس الحدیث فی الہند. (نزھۃ الخواطر ۸-۱۱۹۸، طبع بیروت) دیگر تمام علوم میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اور اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالی کی بقول آپ ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' تھے۔ نیز آپ خداداد ذہانت وفطانت، فہم وفراست، قوتِ حافظہ، بدیہ گوئی وحاضر دماغی میں عجوبہ روزگار تھے۔

مخدومی جناب ڈاکٹر غلام محمد کچھی صاحب (خلیفۂ مجاز استاذ گرامی حضرت مولانا نذیر

احمد صاحب قدس سرہ، بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد) کو اللہ تعالیٰ نے عظیم سعادت بخشی کہ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کی شخصیت پر قلم اٹھایا اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے علمی کارنامے کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ دی، یہ دراصل ان کا مفصل مقالہ ہے جس پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انہیں پی ایچ ڈی (Ph.D.) کی ڈگری دی گئی۔

کہنے کو تو یہ شاہ صاحب کے علمی کارنامے ہیں لیکن درحقیقت یہ حضرت شاہ صاحب کی مکمل سوانح عمری ہے۔ جن میں ان کی ولادت سے لیکر وفات تک کے مکمل حالات درج ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کا خاندان، حسب نسب، ابتدائی تعلیم، مشہور اساتذہ، تدریس، سفرِ حرمین شریفین، شادی، دارالعلوم کی صدر مدرسی، علالت اور انتقال، قرآنی خدمات، علم حدیث اور شاہ صاحب، فقہی خدمات، فلسفہ وکلام کے میدان میں، علامہ کشمیری اور تصوف، علامہ کشمیری اور شعر وادب، مسئلہ ختم نبوت اور علامہ کشمیری، سیاسی خدمات، علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ اقبال کے روابط، شاہ صاحب کی تصانیف اور علمی نگارشات اور اس قسم کے دیگر رنگارنگ عنوانات سے مزین یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی حیات وخدمات پر ایک جامع تاریخی دستاویز ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب اس عظیم علمی کارنامے پر علمی حلقوں کی طرف سے بالعموم اور اکابر کے احوال وسوانح سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کی جانب سے بالخصوص شکریہ کے مستحق ہیں، دل سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی اس عظیم کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرمالیں۔ ان کے حق میں صدقہ جاریہ سار یہ بنائیں اور علماء وطلبہ کو اس سے کما حقہٗ مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔

محمد ابراہیم

جامع مسجد فاروق اعظم، صادق آباد

۳۰/۰۷/۰۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

علمی و تاریخی شخصیات کے تذکرے دراصل علم و فن کی تاریخ کا ہی ایک پہلو ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اہم شخصیات کے تذکرے اور ان کی خدمات پر مشتمل کتب اور تحقیقی مقالات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ درحقیقت ان کے متعلق منتشر معلومات کو یکجا کرنا ایک اہم علمی اور ملی خدمت ہے۔ البتہ اس ضمن میں جذباتی وابستگی اور ذہنی رجحان کے ساتھ وابستہ رہنے کے بجائے غیر جانبدارانہ اور خالص تحقیقی علمی انداز اختیار کیا جانا چاہیے۔ عقیدت مندانہ مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی کے بجائے ان کے اصل واقعات، حالات زندگی اور اہم کارنامے بیان کئے جائیں اور تحقیق کے ساتھ بحث کے ذریعے ان کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا جائے۔ عوام تو درکنار بعض دفعہ اہل علم بھی بڑی اہم شخصیتوں کی خدمات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے، اس لیے کہ ان کے بارے میں معلومات مختلف کتب میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔

انورالسوانح کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہماری نوجوان نسل اپنے بزرگوں اور تاریخی و علمی شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے کما حقہ واقف ہو سکے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر مقالہ "مولانا انور شاہ کشمیری کے علمی کارنامے" ہے۔ جس کی منظوری دے کر جامعہ پنجاب بالخصوص شعبہ علوم اسلامیہ نے علم پروری کا عملی ثبوت دیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں انیسویں اور بیسویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانہ میں ایک طرف صد سالہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں تو دوسری طرف فکر و نظر کے پرانے سانچے بھی ٹوٹ گئے، نئی نئی علمی اور مذہبی تحریکیں منصۂ شہود پر

آئیں۔ برطانوی عروج کا آفتاب جنگ عظیم دوم کے بعد گہنا گیا اس زمانے میں مسلمانوں کے اندر حصول آزادی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا شوق اجاگر ہوا۔ موافق و مخالف متعدد نظریات اور تحریکات نے جنم لیا، ان کے عمل اور رد عمل کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوگیا کہ جس نے فکر وعمل کی صد ہا راہیں کھولیں۔ جدید سائنسی تحقیقات وانکشافات قدیم مذہبی روایات کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ مذہب کے بارے میں نظریات بدلنے لگے، سماج کے انداز بدلے، سیاست کے اصول بدلے۔ چنانچہ اس ہمہ گیر تبدیلی کے دور میں اسلامی سماج، دین اور معاشرے کا بھی مختلف مسائل سے دوچار ہونا ناگزیر تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے لے کر مولانا انور شاہ کشمیری تک کے دور میں دینی اصلاح وتربیت کی پرخلوص اور مسلسل جدوجہد جاری رہی۔ ان بزرگوں کی راہیں مختلف تھیں، بعض اوقات طریقہ بھی مختلف ہوتا تھا لیکن منزل مقصود ایک تھی۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی تحریک دراصل ولی اللہی تحریک کی ہی توسیع اور تجدید کی ایک کوشش تھی۔ انہوں نے مسلمانان ہند کے بکھرے ہوئے شیرازے کو درس حدیث کے ذریعے منظم کرنا چاہا۔ ان میں غور وفکر کی صلاحیتیں ابھاریں اور اہل علم کے ایک معتدبہ طبقہ میں ایک نئی جان ڈال دی۔ مولانا علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث کی مستند کتابوں کے حواشی اور شروح عربی اور فارسی میں لکھ کر مسلمانان برصغیر پر جو احسان کیا ہے، اُسے اسلامی تاریخ کا طالب علم کبھی فراموش نہیں کر سکتا حقیقت یہ ہے کہ اس صدی میں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی اور سماجی اصلاح وتربیت کا سہرا تحریک ولی اللہ کے علمبرداروں میں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے سر بندھتا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی مذہبی بے راہ روی کو روکنے اور اسلام کے احیاء کے لیے پُرخلوص جدوجہد کی۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی معروف شخصیت کسی مزید ''تعارف محض'' کی محتاج نہیں۔ اس لیے کہ یوں تو ان کی شخصیت ایک چلتی پھرتی تاریخ ہے جس کا ان کے شاگردوں اور مآثر علمی کی صورت میں ہر جگہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کشمیری ان چند ہستیوں میں سے ایک ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ کی جامع شخصیت اور بلند علمی حیثیت کو اہل علم وفضل

نے تسلیم کیا ہے اور یہ حقیقت آپ کی تالیفات مطبوعہ وغیر مطبوعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ متعدد ہم عصر علمائے کرام نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔ مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا مفتی کفایت اللہ، علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ کوثری مصری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ بلکہ آپ کے استاد مکرم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بھی بعض اوقات آپ سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ فلاں مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کی عظمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر بھی گہری نظر تھی۔ آپ کہا کرتے تھے کہ جدید سائنسی انکشافات اور جدید فلسفہ اُقرب اِلی الاسلام ہے۔ اور جدید سائنسی تحقیقات سے اسلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

بنابریں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے علمی و تحقیقی کارناموں کو یکجا مرتب کیا جائے۔ اس سے جدت پسند اور قدامت پسند طبقوں کے اندر جو بعد اور اختلافات پائے جاتے ہیں ان کو کم کرنے اور دونوں طبقوں کو قریب تر لانے میں بڑی مدد ملے گی۔

۱۹۷۸ء ﴿۱۰ جنوری ۱۹۹۲ء بروز جمعہ، ۳ بجے شام محترم استاد موصوف لاہور میں مالکِ حقیقی سے جا ملے﴾ میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے علوم اسلامیہ سے فارغ ہونے کے بعد استاذی المکرم السید محمد متین ہاشمی ڈاکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کی ترغیب پر ''انور السوانح'' لکھنے کا شوق ہوا۔ ان کے تعاون اور مشورے سے راقم الحروف نے ''انور السوانح'' کے بارے میں ابتدائی خاکہ اور کتابیات تیار کیں، بعض اہم موضوعات مثلاً برصغیر پاک و ہند میں اسلامی علوم کا تاریخی پس منظر مختلف علوم مثلاً قرآن، حدیث اور فقہ کی ترویج و اشاعت کے مختلف مراحل، مولانا انور شاہ کشمیری کا تصوف میں مقام، فلسفہ و کلام میں ان کی بصیرت، تحریک آزادیٔ ہند میں ان کا کردار، ہم عصر علماء خصوصاً ڈاکٹر محمد اقبال کے ساتھ علمی روابط کی تفصیل؛ مختلف مقامات پر دینی مدارس کا قیام، اخبارات و رسائل میں شائع کردہ مضامین و تقاریر، آپ کے تبلیغی و اصلاحی دورے اور آپ کے بہت سے شاگردوں میں سے بعض کے

انٹرویوز "انور السوانح" میں شامل کئے گئے ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ راقم کا مقالہ حرف آخر ہے اور غلطیوں سے پاک ہے۔ کوئی بھی انسان خطا ونسیان سے مبرا نہیں ہے، ممکن ہے بعد میں آنے والے اس پر مزید تحقیقات کریں اور تحقیق کے کام کو اور آگے بڑھائیں۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے دوران راقم کو ملک کے مقتدر علماء، لائبریرین حضرات اور دیگر اہم شخصیات کا علمی اور فنی تعاون حاصل رہا۔ جن میں استاد محترم سید محمد متین ہاشمی ڈائریکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ لائبریری لاہور کی شخصیت نمایاں ہے جنہوں نے راقم کی اس کتاب کی ترتیب وتسوید میں آخری وقت تک رہنمائی فرمائی۔ مشہور خطاط سید انور حسین نفیس رقم نے کتاب کے مواد کے حصول میں بڑی مدد دی اور اپنی گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود اس کی جلی سرخیوں کی اپنے دستِ مبارک سے کتابت فرمائی۔ مولانا احمد الرحمان مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی، جناب عبد الحئی مہتمم دارالکتب وقف دارالعلوم کراچی، مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدیر بیّنات، ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم، عظیم درسگاہ اور مؤلف کی مادرِ علمی جامعہ محمدی جھنگ کے ممتاز عالم دین اور استاد مکرم مولانا محمد نافع صاحب، حکیم محمد موسیٰ امرتسری، جناب نصرت علی اثیر چیف لائبریرین پنجاب پبلک لائبریری، حافظ غلام حسین ریسرچ آفیسر ریسرچ سیل، حافظ محمد سعد اللہ اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر ریسرچ سیل، لاہور جیسے علم دوست احباب اور علماء نے مقالہ لکھنے میں بھرپور تعاون کیا۔

راقم ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون ہے۔ جناب اے کے صدیقی چیف انجینئر گڈو پاور اسٹیشن اور جناب عبد الوارث خان ریذیڈنٹ انجینئر تھرمل پاور اسٹیشن گڈو کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی احسان فراموشی ہوگی جنھوں نے کتاب کی تیاری میں ذاتی دلچسپی لی اور راقم کو خاطر خواہ سہولیات فراہم کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان حضرات کی اس قدر توجہ نہ ہوتی تو مؤلف کو کتاب کی تکمیل میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لیے راقم ایک بار پھر ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔

برخورداران مولوی محمد ابوبکر اور علی عثمان حالی نے اس مسودہ کی کتابت، تصحیح اور اشاعت کے تمام مراحل میں بڑی محنت اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب ان کے علمی لگاؤ کا ثبوت ہے۔ خصوصاً علی عثمان حالی نے جامعہ دارالعلوم کراچی میں پڑھائی کے دوران اس کتاب کی کتابت اور تصحیح نہایت ذمہ داری سے اپنی نگرانی میں کروائی۔

اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل اور زندگی میں برکت عطا فرمائے۔

وماتوفیقی الا باللہ

نیازکیش

ڈاکٹر غلام محمد کھچی

اسسٹنٹ پروفیسر واپڈا کالج گڈو

۸شوال المکرم ۱۴۲۹ھ، ۸ا اکتوبر ۲۰۰۸ء بروز بدھ

باب: ۱

ماضی کے آئینہ میں

برصغیر میں اسلام کا نور

برصغیر پاک و ہند کے عرب سے تعلقات تاریخ کی ابتدا ہی سے چلے آرہے ہیں۔ جب اہلِ عرب نے اسلام قبول کیا تو اس وقت ان کی نوآبادیاں ہندوستانی ساحل پر قائم ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جلد ہی اسلام برصغیر میں داخل ہو گیا۔ عربوں کی تبدیلیٔ مذہب کے بعد ہندوستانی ساحل کی یہ عرب نوآبادیاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز بن گئیں۔ پروفیسر آرنلڈ کے بیان کے مطابق اسلام نے زندگی کے متعلق عربوں کے ذہنی رجحانات اور علمی طور طریقوں میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا۔ اس لیے عرب تاجروں کی تبدیلی مذہب ہمسایوں کی توجہ کو جذب کیے بغیر نہ رہ سکی (۱)۔ قبولِ اسلام کے بعد خود مختاری اور مساجد کی ضرورت عربوں کے لیے لازمی ہو گئی، مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل شریعت ہے جسے وہ دوسرے قوانین کی خاطر ترک نہیں کر سکتے۔ اس وقت بھی انہیں اپنی نوآبادیوں میں علانیہ عبادت کا حق حاصل تھا، ان کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ اپنے شخصی اور دیوانی معاملات میں خود اپنی شریعت کا نفاذ کریں (۲)۔

سن ہجری کی ابتدائی صدیوں میں ان نئی نئی آبادیوں کے قیام کا ذکر تاریخ میں بار بار آتا ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد عربوں میں جو تعمیری روح پیدا ہوئی، اس کے اثرات ہر طرف پھیلتے گئے۔ ان کی تجارت وسیع ہو گئی اور ان کی فتوحات نے انہیں بہت سی تجارتی قوموں کا وارث بنا دیا (۳)۔ عرب جہاز دیبل (کراچی)، تھانہ، کھمبایت اور مالابار کی ساحلی بندرگاہوں میں آتے تھے۔

عرب سلطنت چاروں طرف پھیل رہی تھی اور سندھ کی سرحدیں ان کے قریب تھیں۔ سندھی حکمران اپنی ریاستوں میں عربی اثر و رسوخ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے سندھ کے ساحلی علاقوں میں ان کی آبادکاری کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس وقت سندھ کے ساحل پر ڈاکوؤں کے اڈے قائم تھے۔ عربوں کی بحری تجارت کو جو عرب بندرگاہوں، جنوبی ہند اور

سیلون کے تجارتی مرکزوں کے درمیانی ہوتی تھی جب یہ ڈاکو چاہتے تھے درہم برہم کر دیتے تھے (۴)۔ مسلمانوں کی تجارت پر سندھ کی قزاق جماعت جو چھاپے مار رہی تھی اس کے خلاف اموی حکومت سندھی حکمرانوں سے برابر احتجاج کر رہی تھی۔ اس دوران ان ڈاکوؤں نے اس جہاز کو جو فرمانروائے سیلون کے تحائف حاکم عراق حجاج بن یوسف کے لیے لے جا رہا تھا جس میں کچھ مسلمان بچے اور عورتیں بھی سوار تھیں (۵) دیبل کی بندرگاہ سے کچھ فاصلہ پر سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا۔ اب اموی حکومت کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اس کے مطالبہ پر سندھ کے راجہ نے ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تو عربوں نے سندھ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم نے ۹۲ھ/ ۷۱۱ء (۶) میں سندھ کو فتح کر کے اموی سلطنت میں شامل کر لیا (۸)۔

سندھ جب عرب حکومت کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا تو عربوں اور اس سرزمین کے باشندوں کے درمیان گہری راہ ورسم کا دروازہ کھل گیا اور پھر جب عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو دارالحکومت بنایا تو ہند وسندھ سے عربوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا۔ جہاں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراء، علمائے دین اور فضلائے علوم وفنون پیدا ہوئے۔

سندھ کی فتح سے پہلی مرتبہ عرب وہند کے سیاسی تعلقات کا آغاز ہوا۔ دیبل سے لے کر ملتان کے اوپر تک کے سارے علاقہ پر عرب مسلمانوں کی حکومت مضبوط ومستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی اور سندھ ثقافتی وتمدنی لحاظ سے خلافت اسلامیہ کا جزو بن گیا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ دین اسلام، عربی زبان اور اسلامی علوم و فنون کی اشاعت عروج پر تھی۔ دین اسلام اور عربی زبان کے حاملین، قراء وحفاظ اور محدثین ومبلغین بڑے اہتمام کے ساتھ بھیجے جاتے تھے اور کبھی تو علم قرآن وحدیث کے حامل علم و عمل لیے ہوئے خود غازیوں کی صف میں شامل ہو جاتے تھے (۸)۔ اس کی ایک مثال خواجہ حسن بصری کے شاگرد ابوحفص ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء) کی ہے جو اسلامی لشکر میں شریک ہو کر سندھ آئے (۹)۔ اور دوسری مثال محمد بن یعقوب ثقفی کی ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آئے اور الرور (جس کا موجودہ نام روہڑی ہے) کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس

طرح ابوالعباس احمد بن صالح التمیمی اور داؤد اصفہانی (م ۲۷۰ھ/۸۸۳ء) کے ناموں کے علاوہ بہت سے اور علمائے دین کے نام بھی ملتے ہیں (۱۰)۔

حکومت کے قیام کے ساتھ مسلم نو آبادیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ان میں مساجد، مکاتب اور مدارس بھی کھولے گئے۔ ان نو آبادیوں میں سے ایک آبادی منصورہ بھی تھی جسے محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو نے اپنی گورنری کے زمانہ میں آباد کیا تھا (۱۱)۔

سندھ میں نوجوان فاتح محمد بن قاسم نے عوامی خیر خواہی کے اصولوں پر مبنی ایک نظام حکومت نافذ کیا اور اپنی شہرت کو چار چاند لگا دیئے (۱۲)۔ اس فتح سے اسلام کی تاریخ کا ایک نیا اور اہم باب کھلا بلکہ برصغیر کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم کا آغاز ہوا۔

۷۱۷ء میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے تو انھوں نے یہاں کے راجاؤں، ٹھاکروں اور زمینداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جس کا خوشگوار اثر ہوا۔ آپ ہی کی دعوت پر راجہ داہر کا بیٹا جیسہ بھی مسلمان ہو گیا تھا (۱۳)۔ تبلیغی سرگرمیوں کے باعث متعدد سرداروں اور قبیلوں نے بھی اسلام قبول کر لیا (۱۴)۔

اسلام کی ترقی واشاعت

جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہو گئے تو آہستہ آہستہ ہندوؤں نے اسلام کی خوبیوں کا معترف ہو کر اسے قبول کرنا شروع کیا اور مسلمان آبادی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا، لیکن اسلام کی اشاعت مسلمان حکمرانوں کی مرہون منت نہ تھی۔ دراصل ہندوستان میں اسلام ان علماء اور صوفیاء کی تبلیغی، تدریسی اور تصنیفی کوششوں سے پھیلا جنھوں نے اپنی تمام زندگی اس کام کے لیے وقف کر رکھی تھی (۱۵)۔

ابتداء میں تبلیغ اسلام کا کام عربوں کی نو آبادیوں نے کیا مگر جب تصوف کے سلاسل کا فروغ ہوا تو صوفیاء اور مبلغین نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور انھوں نے مسلمانوں کے ذوق و شوق کو برقرار رکھنے اور غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے کے دوگونہ مقصد سے وہیں قدم جما دیئے۔ جنوبی ہند کی ابتدائی تاریخ میں مسلمانوں کی تبلیغی جد و جہد کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ البتہ مالا بار کے آخری راجہ چیرامن پیرومل کے قبول اسلام کی ایک روایت ضرور

منقول ہے جس کا اسلامی نام عبدالرحمان رکھا گیا۔ راجہ کو قبول اسلام کے بعد ایک ہندو ملک حکومت کرنا دشوار معلوم ہوا تو وہ ہجرت کر کے عرب چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ (۱۶)

جن بزرگوں نے برعظیم پاک و ہند میں اشاعت اسلام میں حصہ لیا تھا ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

۱) نطہر ولی (م ۱۲۲۵ء): ان کا تعلق ایشیائے کوچک کے ایک مقتدر خاندان سے تھا مگر انھوں نے اپنی زندگی مذہب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کے مرشد سید علی بادشاہ ہرمزی نے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ جنوبی ہند میں جا کر تبلیغ اسلام کریں۔ آرنلڈ کی تحقیق کے مطابق اس مبلغ اسلام کا نام "نطہر شاہ" ہے۔ (۱۷)

۲) سید ابراہیم شہید (م ۱۲۱۷ء): نطہر ولی کے جانشین سید ابراہیم تھے جن کا مقابلہ پانڈیا راجہ سے ہوا تھا اور وہ ۱۲۱۷ء میں شہید ہوئے اور اریوی میں مدفون ہیں۔ (۱۸)

۳) بابا فخر الدین (م ۱۲۹۴ء): نطہر ولی کے ایک اور مرید بابا فخر الدین ہیں جن کا تعلق صوفیاء کے سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پنوکونڈا کے راجہ کو حلقہ بگوش اسلام بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ڈوڈسے کلاں کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے بابا فخر الدین کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کا مزار پنوکونڈا میں ہے۔ (۱۹)

۴) علی بادشاہ: اس طرح ہمیں علی بادشاہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو گیارہویں صدی عیسوی میں مدورا میں گئے تھے اور ان کے مقبرے کو مقامی آبادی عظمت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ (۲۰)

ان صوفیائے کرام نے اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے عظیم خدمات انجام دیں انھوں نے اپنی حق گوئی، بے باکی اور حسن اخلاق سے بدھوؤں اور ہندوؤں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں بڑا کام کیا لیکن اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تعداد بدھوؤں کی تھی (۲۱)۔ یہ اہل علم صوفیاء بازاروں میں کاروبار کرتے، عوام سے ملتے، اپنی نیک اور سادہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کر کے لوگوں کی زندگی اور ان کی فکر و نظر کو بدل دیتے تھے۔

مشہور انگریزی مصنف پروفیسر ڈبلیو آرنلڈ نے اس حقیقت کا اعتراف یوں کیا

مسلمان فاتحین سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سیلون، مالدیپ، کارومنڈل، گجرات اور مالابار وغیرہ کے علاقوں میں عربوں کی کثیر تعداد آباد ہو گئی۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور اسلام کا پیغام بتدریج ہندوستان میں پھیلتا اور مقبول ہوتا رہا۔

محمد بن قاسم نے صحرائے سندھ میں جو چشمۂ فیض جاری کیا تھا وہ تو خشک نہ ہوا لیکن اس کے عرب جانشین اسے وسعت اور گہرائی نہ دے سکے اور جو نہریں اس چشمۂ فیض سے نکلی تھیں وہ ملتان تک آتے آتے خشک ہو گئیں۔ پنجاب اور شمالی ہند کے باقی علاقے ان لوگوں کی آبیاری سے پھلے پھولے جو عرب سے نہیں بلکہ افغانستان سے آئے تھے۔ سندھ اور ملتان ۷۱۱ء میں فتح ہوئے تھے۔ اس کے بعد کوئی اڑھائی تین سو سال تک راجپوت شمالی ہند میں بے کھٹکے حکومت کرتے رہے۔ ۹۸۰ء کے قریب امیر سبکتگین نے ہندوستان کے شمال مغرب کی طرف نظر اٹھائی اور بعض فوجی مقامات فتح کر کے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ ۹۹۷ء میں امیر سبکتگین نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان محمود علم و ادب کا شیدائی تھا۔ اس نے ۱۰۳۰ء میں عدم کی راہ لی تو مسعود تخت پر بیٹھا۔ محمود کی طرح مسعود بھی اہل علم کا قدردان تھا۔ اس کے دور میں لاہور اسلامی علوم اور مذہب کی اشاعت کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں حضرت علی ہجویری ''المعروف بہ داتا گنج بخش'' لاہور وارد ہوئے تو تبلیغ اسلام اور علوم اسلامیہ کی اشاعت کا ایک نیا باب کھل گیا۔ (۲۵)

مختصر یہ کہ وہ علوم مقدسہ جن کی بنیاد جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ جنہیں خلفائے راشدین نے اپنے سینوں سے لگائے رکھا، جن کے شجر کی آب یاری کے لیے جناب امام حسینؓ نے اپنے خانوادہ سمیت خون دیا۔ جس کی عظمت کی خاطر حضرت زینبؓ کی چادر چھینی گئی اور زین العابدینؒ کو طوق و سلاسل سے کھیلنا پڑا، جن کو جادہ مستقیم پر رکھنے کے لیے امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں زہر آلود لقمہ کھا کر جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا، جن کے پرچم تلے محمد بن قاسم نے سندھ میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جن کی وسعت کی خاطر طارق بن زیاد کو اندلس کے کنارے کشتیاں جلانا پڑیں۔ جن کے سایہ میں غازی صلاح الدین ایوبی نے جنگ صلیب و ہلال کے معرکے سر کیے۔ بطور امانت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہے۔ علمائے دین اور علوم نبیؐ کے وارثین نے پوری ایمانداری اور محنت سے اپنے

آرام وسکون کوقربان کر کے اور راتوں کو جاگ کر ان علوم کا اثاثہ بحفاظت آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا اور تا قیامت ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔

پاک وہند میں دینی مدارس

وسط ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت کا قیام ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں قطب الدین ایبک کے عہد (۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) سے شروع ہوتا ہے۔ ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے جو وہاں کا حکمران تھا ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ مشہور عالم و مصنف قاضی منہاج سراج (م۔۶۵۸ھ/ ۱۲۵۹ء) کا بیان ہے کہ اس مدرسے کا انتظام و انصرام ان کے سپرد تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"دریں سال بعض اربع و عشرین و ستمائه درماه ذی الحجه مدرسه فیروزی چه حواله ایں داعی شد۔" (۲۷)

قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے ماوراء النہر سے ملتان آنے کے موقع پر ایک اور درس گاہ قائم کی تھی جس میں مولانا کاشانی مدتوں تعلیم وتدریس میں مشغول رہے۔ (۲۸)

پاک وہند میں تعلیمی مراکز

آٹھویں صدی ہجری تک ہندوستان میں اسلامی مدارس کے قائم کرنے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ مقریزی کی روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء۔۷۵۲ھ/ ۱۳۵۷ء) کے عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔ مدرسین کے لیے خزانہ شاہی سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک قرآن مجید کی حافظہ اور عالمہ ہوتی تھیں۔ (۲۹)

محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق (۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء۔۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء) نے بڑے اہتمام کے ساتھ مدارس تعمیر کرائے۔ ضیاء برنی دہلی کے مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ مدرسہ اپنی شان، خوبی محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے

اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ ہر وقت سینکڑوں طلباء اور علماء وفضلاء یہاں موجود رہتے تھے۔ (۳۰) فیروز شاہ نے نہ صرف نئے مدارس قائم کرائے بلکہ پرانے مدارس کی بھی تجدید کی اور ان کے لیے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کر دیں۔ (۳۱)

اس نیک دل بادشاہ نے غلاموں اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ غلاموں کو حفظ قرآن مجید کے علاوہ دینی علوم کی تحصیل کا بھی موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ ان کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی تھی۔ شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق عہد فیروزی میں ایک لاکھ اسی ہزار/۱۸۰,۰۰۰ غلاموں نے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ (۳۲) فیروز شاہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھی جداگانہ مدارس قائم کیے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ایک مقام ''ہنور'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں عورتیں حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ میں نے اس شہر میں لڑکیوں کے تیرہ مکاتب دیکھے۔ (۳۳)

گجرات کے فرمانروا سلطان محمد عادل شاہ (۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء۔ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ھ) نے اپنی حدود سلطنت میں مدارس قائم کیے اور حکومت نے ان کی سرپرستی کی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک مدرسہ کے بارے میں لکھا ہے: ''شاگردان را سفرہ آثار آش دنان بوقت بریانی و مزعفر بوقت شام نان گندم و کھچڑی فی اسم یک ہون و بدون این کتاب ہائے فارسی و عربی مدد نمائند''۔ (۳۴)

سلاطین شرقیہ جون پور کے حکمران تھے، انھوں نے صدہا مدرسے تعمیر کرائے اور دنیا بھر سے علماء وفضلاء کو جمع کر کے ان کی عزت افزائی کی۔ جون پور میں اٹالہ مسجد کے ساتھ جو مدرسہ قائم ہوا تھا اس کی عمارت اب تک موجود ہے۔ پاک و ہند کے مشہور بادشاہ شیر شاہ سوری نے اس مسجد کے دار العلوم میں علم حاصل کیا تھا۔ (۳۵) اس کا موجودہ نام ''ہرنوڈ'' ہے۔

جون پور مسلمانوں کے علوم وفنون کا مرکز اور علماء کا مرجع تھا جس کو ''شیراز ہند'' کہا جاتا تھا۔ وہاں بہت سے مدرسے قائم تھے۔ محمد شاہ کے زمانے تک بیس مشہور مدرسے جون پور میں موجود تھے۔ (۳۶) سلطان لودھی نے اپنے عہد حکومت میں بکثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں۔ (۳۷)

لکھنؤ میں شاہ پیر محمد نے مدتوں تک بزم تعلیم گرم رکھی، ان کے بعد ان کے شاگرد ملا غلام محمد نقشبندی نے اس مجلس کو اور زیادہ رونق دی۔ شاہ پیر محمد کا مدرسہ اور خانقاہ لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے ٹیلہ پیر محمد کے نام سے مشہور ہے۔ (۳۸)

مغل بادشاہوں کے عہد میں دینی تعلیمی ادارے

بادشاہ ہمایوں اور اکبر کے عہد میں بھی مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ دہلی میں اکبر کی رضاعی ماں ماہم بیگم نے ایک مدرسہ جاری کیا۔ اس کا نام ''خیر المنازل'' تھا۔ اس کے کھنڈر نئی دہلی میں پرانے قلعے کے نزدیک موجود ہیں۔ (۳۹)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں اپنی تحصیل علم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک دوسرے مدرسے کا رخ کیا، جس کا نام انھوں نے ''مدرسہ دہلی'' لکھا ہے۔ آگے چل کر خود شیخ محدث کی مسند درس بھی اس جگہ بچھی تھی۔ (۴۰)

میر سید غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے علاقے میں مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے۔ (۴۱) بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر ہوئیں۔ مسجد فتح پوری کا مدرسہ اس دور کے ''باقیات الصالحات'' میں سے ہے۔ یہی وہ مسجد تھی جس میں شاہ عبدالقادر دہلوی کا قیام رہا۔ مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی نے اس مسجد میں تحصیل علم کی تھی۔ (۴۲)

۱۰۶۰ھ/ ۱۶۴۹ء میں شاہ جہاں نے جامع مسجد کے قریب ایک عظیم الشان مدرسہ ''دار البقاء'' کے نام سے تعمیر کرایا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی اس مدرسہ میں مقیم رہے ہیں۔ جنگ آزادی میں یہ مدرسہ ختم ہوگیا۔ (۴۳)

مغلوں کے عہد حکومت میں اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکمرانی کی تعلیمی سرگرمیاں عام شہرت رکھتی ہیں۔ اس بادشاہ نے شہروں کے علاوہ دیہات وقصبات میں بھی مدارس جاری کیے۔ لکھنؤ میں فرنگی محل کا دار العلوم مدرسہ نظامیہ اس عہد کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین کو ۱۱۰۵ھ میں اورنگ زیب نے ایک عظیم الشان مکان دیا تھا۔ یہ ''فرنگی محل'' کے نام سے

مشہور تھا۔ اس مدرسہ کا دیا ہوا نصاب تعلیم تین صدیوں سے پاک و ہند کے مدارس عربیہ میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس نصاب کو ''درس نظامی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۴۴)

دہلی میں غازی الدین خان فیروز جنگ اول نے ایک مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب قائم کیا تھا۔ یہی مدرسہ ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں ''دہلی کالج'' کے نام سے مشہور ہوا۔ مولانا رشید الدین خان دہلوی اور مولانا مملوک علی نانوتوی اس کالج کے صدر المدرسین رہے ہیں۔ (۴۵) رام پور میں مدرسہ عالیہ قائم تھا جو اب تک موجود ہے۔ والی رام پور نواب فیض اللہ خان نے بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کو اس کا مدرس مقرر کیا تھا۔ (۴۶)

حکومت کی سرپرستی کے علاوہ مسلمانوں کا ذوق علم جو انہیں وراثت میں ملا تھا، حکومتوں کے خزانہ کا مرہون منت نہیں رہا۔ ہماری قدیم درس گاہیں اپنے لیے مستقل عمارتوں کی محتاج نہ تھیں۔ مسجدوں، خانقاہوں اور علماء و امراء کے مکانات سے لے کر میدانوں تک تعلیم و تعلم کی بزم آراستہ رہتی تھی۔

سیاسی زوال کے ایام میں درسگاہیں

ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کا زمانہ بڑا پر آشوب ہے۔ اسلامی سطوت و عظمت کو زوال آ رہا تھا، تعلیمی سرگرمیاں بھی سرد پڑ رہی تھیں، تخت دہلی پر محمد شاہ متمکن تھا جو اپنے لاابالی پن اور کثرتِ شراب نوشی کے سبب ''رنگیلا بادشاہ'' مشہور تھا مگر بایں ہمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مدرسہ اس دور میں روشنی کا مینار تھا۔ واقعات دار الحکومت دہلی کے مصنف کا بیان ہے کہ ''یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا۔'' (۴۷)

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبد الرحیم کے زمانے میں یہ مدرسہ اس جگہ پر تھا جہاں اب ان حضرات کے مزارات ہیں۔ یہ جگہ ''مہندیوں'' کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانے میں جب طلباء کی تعداد زیادہ ہوگئی تو محمد شاہ نے مدرسہ کے لیے ایک بڑی حویلی عنایت کی۔ یہ جگہ ''کوچۂ چیلاں'' میں تھی۔ غدر کے ہنگامے میں یہ مدرسہ برباد ہوگیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبد العزیز کے مدرسے کے نام

سے آج تک پکارا جاتا ہے۔ (۴۸)

اٹھارویں صدی عیسوی اور ہندی مسلمانوں کی حالت

اٹھارویں صدی عیسوی میں برصغیر پر مسلمانوں کی گرفت باقی نہیں رہی تھی۔ دہلی جو مسلمانوں کی قوت کا مرکز تھا، اس کے نواح میں بھی سکھوں اور جاٹوں کی غارت گری نے زندگی کو مخدوش اور غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ قیاس یہ تھا کہ بڑی تیزی اور تواتر کے ساتھ بھاری بھاری ضربیں لگنے کے باعث دماغ ماؤف ہو گئے ہوں گے اور ان میں گہرے سوچ بچار کی صلاحیت نہ رہی ہو گی۔ اس قسم کے مواقع پر بعض ایسے مفکرین پیدا ہو جاتے ہیں، جو حالات کا تحلیلی جائزہ کرتے ہیں اور قوم پر طاری ہو جانے والے مرض کی تشخیص کرتے ہیں چنانچہ اس قوم کی زبوں حالی نے شاہ ولی اللہ جیسا رجلِ شہیر پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا تعارف

آپ کی ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء میں ہوئی۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا، ساتویں سال نماز اور روزہ کا حکم ہوا۔ اس سال قرآن مجید ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی پڑھی، چودہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی۔ پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوا اور درس دینے کی اجازت مل گئی، سترہ سال کی عمر میں والد بزرگوار رحمت حق سے جا ملے، ان کی وفات کے بعد فقیر بارہ سال تک علوم دینیہ و عقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا۔ (۴۹)

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیم مدرسہ رحیمیہ کے بانی تھے۔ جہاں خود بھی درس دیتے تھے۔ وہ عالم اور صوفی تھے اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ دینیات اور تصوف کے درمیان کشمکش دور ہو جائے۔ تطبیق کی یہ روح ان کی طرف سے ان کے بیٹے شاہ ولی اللہ کو ورثے میں ملی۔ فاضل باپ کا یہ فرزند ایک ہونہار نوجوان تھا جو بہت کم عمری میں اپنے باپ کے مدرسے سے نہ صرف فارغ التحصیل ہو گیا بلکہ اس نے مدرسہ

میں درس دینا بھی شروع کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ مزید تحقیق و مطالعہ اور فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے عرب چلے گئے۔ مدینہ منورہ میں چودہ ماہ تک تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہے، جہاں وہ اپنے استاد شیخ ابوطاہر بن ابراہیم (م۔۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء) کی شخصیت سے بڑے متاثر ہوئے۔ وہ شاہ ولی اللہ کی ذہانت اور جودت طبع کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ:

"إنه كان يسند عني اللفظ و كنت أصحح منه المعنى ۔" (۵۰)

وہ ۹/ جولائی ۱۷۳۲ء کو دہلی واپس آئے اور اس کے بعد ان کی زندگی کا سب سے زیادہ پختہ اور نتیجہ خیز دور کا آغاز ہوا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت

ایک رات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مکہ معظمہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپؐ نے بشارت دی کہ "تمھارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمھارے ذریعے کی جائے" (۵۱)۔ اس بشارت کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ہندوستان کا رخ کیا اور اپنے وطن دہلی میں وارد ہوئے۔ اس وقت دہلی پر ہر طرف سے زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ مرہٹے، سکھ، نادر شاہ، ملک کے لیے قہر الٰہی بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا جسے کسی جھونکے کا انتظار ہو جو اسے ایک ہی تھپیڑے میں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ شاہ صاحب کی غیور طبیعت بھلا اس صورت حال کی خاموش تماشائی کیسے بنی رہتی۔ آپ کے پاس نہ فوج تھی اور نہ اقتدار، آپ کے پاس ذہن رسا، فکر سلیم اور علم راسخ تھا۔ آپ اپنے انھی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان عمل میں اتر آئے۔ اور جب مرہٹوں کی تخت و تاراج نے مسلمانان ہند پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو آپ نے احمد شاہ ابدالی کو بلوا کر پانی پت کے میدان میں ان کا کس بل نکلوا دیا۔ (۵۲) اس موقع سے مغلوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے لیکن اس صورت حال سے انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰۳ء میں مغل بادشاہ

برطانیہ کا وظیفہ خوار ہو گیا۔ (۵۳)

مسلم سلطنت بظاہر ختم ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے احیاء کی کوئی امید نہ تھی لیکن شاہ ولی اللہ کے علاوہ اب بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو افغان بادشاہت سے یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ان کی حمایت کرے گی۔ (۵۴) سیاسی وجوہ کے علاوہ دوسری طرف شاہ ولی اللہ سمجھ گئے کہ وہ خصائص جو کسی حاکم قوم میں ہوا کرتے ہیں مسلمان اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی قسمت کو مستقلاً سنوارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کردار کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالیں اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے طور وطریق اپنائیں۔ آپ کا خیال تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا بنیادی سبب خود اسلام سے ناواقفیت ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات قرآن میں ہیں۔ اس کی تعلیمات کو عام کرنے سے اتحاد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تحریک جامعہ محمدی شریف کے مصنف لکھتے ہیں:

''شاہ صاحبؒ کی ژرف بین نگاہ نے دیکھ لیا کہ مسلمان قوم کا سب سے بڑا مرض ''اختلاف اور باہمی منافرت'' ہے۔ اس مرض نے اس شیر صفت قوم کو روباہ مزاج بنا دیا ہے۔ لہٰذا اس کا علاج ''رفع اختلاف اور باہمی مودت و محبت'' ہے۔'' (۵۵)

برصغیر میں حضرت مجدد صاحبؒ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ ہی تھے جنہوں نے ملک میں فرنگی سامراج کے اثراتِ بد کے دفعیہ و اصلاح کی طرف توجہ دلائی اور دینی علوم کی اشاعت و ترویج کے لیے بھی بھرپور جدوجہد کی۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ ایک غیر ہندوستانی عالم کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ اسے سارے ہندوستان کی سیاحت میں کوئی ایسا عالم نہیں ملا جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو۔ (۵۶) آپ کی اولاد میں سے شاہ عبدالعزیزؒ کو آپ کا جانشین ہونے کی وجہ سے بلند تر مقام حاصل ہوا۔ انہوں نے آپ کے مشن کو جاری رکھا۔ (۵۷) پھر شاہ اسحاقؒ، شاہ عبدالغنی مجددیؒ اور ان کے بعد مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے اس علمی وراثت کو سنبھالا۔ آپ کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کے علوم و معارف کے وارث مولانا محمود الحسنؒ تھے جن کے متعلق مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کہا کرتے تھے کہ ''وہ علم کا کٹھلہ ہے''۔ (۵۸) مولانا گنگوہیؒ، مولانا نانوتویؒ کے ہم سبق و رفیق تھے اور مولانا محمود الحسنؒ کے استاد اور شیخ طریقت تھے۔

مولانا محمود حسنؒ کے جانشین مولانا انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ اس طرح آپ ولی اللہی علوم کے حامل ہوئے جب تک ولی اللہی افکار و علوم زندہ رہیں گے انور شاہ صاحبؒ کے کارناموں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ ایک صاحب طرز محقق تھے، ان کا اپنا تحقیقی اسلوب تھا۔ آپ کی فنی قابلیت کا معیار آپ کی شخصیت کی متانت و سنجیدگی، ذہنی و فکری بلندی پوری طرح آپ کے اسلوب سے نمایاں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے فکری منبع نے مولانا کشمیریؒ کے قلم کو بہت کچھ دیا۔ آپ ولی اللہی افکار اور سلف صالحین کے تصورات کا مرکز ہیں۔ تحریک شاہ ولی اللہ کے ایک سرگرم رکن کی طرح آپ نے علوم و فنون کی اشاعت میں ناقابل فراموش حصہ لیا ہے۔ آپ کے افکار حضرت شاہ ولی اللہؒ سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی شخصیت مغربی افکار کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم سے بھی پوری طرح واقف تھی۔ ان کے دور سے ولی اللہی علوم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ اسی چیز کو انہوں نے اپنے شاگردوں میں پیدا کیا۔

مختصر یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا، مسلمانانِ ہند کو درپیش مسائل کا حل تلاش کیا، دین اور رموزِ دین کا عرفان حاصل کر کے اسے ایک منضبط اور جامع فلسفہ کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس فلسفہ کو آئندہ نسلوں تک منتقل کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے پوری نسل کو متاثر کیا اور جدید نسل میں جینے کا ارمان پیدا کیا۔ ان کی تحریریں انوار پیغمبری سے مستنیر اور ان کا کلام کلام الٰہی سے مستفاد ہے، ان کے نظریات آفاقی ہیں۔ اس لیے ان کے افکار و نظریات میں پائیداری ہے اور انقلاب دوراں کا کوئی جھونکا ان کی عظمت کو متاثر نہیں کر سکتا۔

فلسفۂ شاہ ولی اللہؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ

فلسفہ الجمع بین المختلفات تحریک شاہ ولی اللہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ اس فلسفہ کے امین مولانا انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ آپ بھی اپنے سینے میں شاہ ولی اللہؒ کی طرح ایک حساس اور درد مند دل رکھتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ علماء متشددانہ طریقہ کار کو چھوڑ کر اعتدال کی راہ اختیار

کریں تا کہ امت کے اندر نفرت، بغض، عداوت، کینہ اور باہمی دشمنی کے بجائے محبت، غم خواری، خیر خواہی اور انسان دوستی جیسی صفات پیدا ہوں۔ مصر کے عالم سید محمد رشید رضاؒ ۲۷/ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ/ ۱۵/ اپریل ۱۹۱۲ء کو دارالعلوم دیوبند میں آئے، آپ نے اس موقع پر جو تقریر کی اس میں اس اصول کی وضاحت کی مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے اساتذہ و مشائخ کے بارے میں بتایا کہ ان کا طریقہ کس قدر معقول تھا، کہتے ہیں:

"فمشائخنا يتوسطون فی مثل هذا لا ياخذون بالتشدد ولا بالتساهل ويوجهون الأحاديث المتعارضة بتوجيهات يكاد يقبلها من يسمعها۔" (۵۹)

یعنی تعارف حدیث کے باب میں ہمارے مشائخ توسط کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ نہ تشدد کرتے ہیں نہ تساہل برتتے ہیں۔ بلکہ اسی نوع کی روایات کی ایسی تطبیق و توجیہ کر دیتے ہیں جسے سامع قبول کر لیتا ہے۔

آگے کہتے ہیں:

"وطريقة مشائخنا فی الحديث و فقه الحديث طريقة معتدلة مثلی بتوسطون بين الاطراف" (۶۰)

حدیث و فقہ حدیث (یعنی مفہوم و معنی حدیث) کے متعلق ہمارے اکابر کا یہ معقول طریقہ ہے کہ درمیانی راہ لیتے ہیں (نہ حدیث کا انکار کرتے ہیں نہ اس کو ظاہر پر چھوڑتے ہیں۔)

آپ نے کہا کہ مجتہد فیہ مسائل میں حق کسی ایک امام کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر امام کے لیے ممکن ہے۔ ائمہ اربعہ کا بھی یہی نقطہ نظر تھا وہ خود کو حق کا اجارہ دار قرار دے کر دوسرے مجتہد کو باطل نہیں سمجھتے تھے، میں بھی اسی نقطۂ نظر کا حامل ہوں۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیری تحریک شاہ ولی اللہ کے اصولوں سے کس طرح متفق تھے۔ شروع میں آپ کی خدمات و مساعی کا زیادہ تعلق فقہ حنفی کی تائید سے تھا اور فقہاء ثلاثہ کے مقابلہ میں فقہ حنفی کو ترجیح دینا آپ کا خاص موضوع تھا لیکن جلد ہی آپ نے محسوس کر لیا کہ دین اسلام اس سے بلند تر ہے، ان حدود کے اندر اسے پابند کرنا،

دین کی روح سے انحراف ہے۔ جلد ہی آپ نے اپنا موقف بدل لیا۔ اب انھیں اپنی گذشتہ کوششوں پر سخت رنج وملال ہوتا تھا، جو ایک خاص نقطہ نگاہ سے کی تھیں۔

محمد اقبال قریشی لکھتے ہیں :

''شاہ صاحبؒ کہتے تھے کہ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر اور توانائی کا بڑا حصہ اور درسِ حدیث کا اہم موضوع حنفیت اور شافعیت کو بنائے رکھا۔'' (۶۱)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو تحریکِ شاہ ولی اللہ کے ساتھ جو دلچسپی تھی، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے جو مولانا محمد منظور نعمانی نے نقل کیا ہے۔

''آپ نے ایک دن عصر کے بعد طلبہ سے خطاب فرمایا :

''ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے صرف کیے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے میں اطمینان ہو جائے'' سو الحمدللہ اس محنت اور تحقیق کے بعد میں مطمئن ہوں۔ اس کے بعد یوں مخاطب ہوئے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے۔ کاش! میرا یہ وقت دین کے زیادہ اہم اور ضروری کام میں صرف ہوتا تو آخرت میں اس کے کام آنے کی زیادہ امید کر سکتا تھا۔'' (۶۲)

مولانا شمس تبریز خان آروی کہتے ہیں کہ ان ضروری کاموں سے وہ مقدم تفسیر قرآن کو سمجھتے تھے۔ (۶۳) جس طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کر کے اس کی تعلیمات کو عام کرنا چاہا تا کہ مسلمان براہ راست اپنی الہامی کتاب کو سمجھیں اسی طرح مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی قرآن مجید کی تفسیر کو سب سے زیادہ اہم اور ضروری کام سمجھتے تھے۔

جامعہ رحیمیہ اور تحریک شاہ ولی اللہ

گیارہویں صدی ہجری / ۱۷ ویں صدی عیسوی کے رُبع آخر (۶۴) کی صبح بڑی مبارک اور روح پرور صبح تھی جبکہ دہلی میں ''مہندیوں'' کے محلے کے نزدیک ایک ادارہ ''جامعہ رحیمیہ'' کے نام سے قائم کیا گیا۔ (۶۵) بیج اچھا تھا اور اس کے بونے والا بھی خلوص کا

پیکر اور ملت اسلامیہ کا حقیقی ہمدرد تھا یعنی شیخ عبدالرحیمؒ، اس لیے یہ ادارہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔ آپ شاہ ولی اللہؒ کے والد تھے۔ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اکبر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ رحیمیہ قائم کر کے درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کی وفات ۱۱۳۱ھ/ ۱۹-۱۷۱۸ء میں ہوئی۔ آپ ایک بلند پایۂ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کی رائے جو وہ اپنے والد کے متعلق رکھتے تھے، اُسے شیخ محمد اکرام نقل کرتے ہیں کہ ''انہوں (شاہ ولی اللہؒ) نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ اور حدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو''۔ (۶۶)

جامعہ رحیمیہ کوئی معمولی درس گاہ نہیں تھی بلکہ مختلف اعتبار سے اس کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے صدر نشینوں، معلمین اور مستندین کی کوشش نے ڈیڑھ سو سال تک اس کو برصغیر کی ایک ممتاز ترین درس گاہ بنائے رکھا۔ اور جب تسلسل حوادث نے اس ادارہ کو ختم کر دیا تو ملک اور بیرون ملک اس طرز کے اور بہت سے مدارس قائم ہو گئے۔

جامعہ رحیمیہ کی انقلابی خصوصیات واقدام

''جامعہ رحیمیہ'' صرف ایک درس گاہ نہیں تھی بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا۔ اسے ایک خانقاہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہاں کردار بنائے جاتے تھے، یہاں انسان ڈھالے جاتے تھے اور مجاہدین کی تربیت کی جاتی تھی۔ اسے ایک اکیڈمی کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کے سربراہوں کے قلم اور ذہن تحقیق و تدقیق کے میدان میں بھی گرم رفتار رہے۔ اس کی سیاسی خدمات کا باب بھی دوسرے باب سے کم اہم نہیں ہے۔ یہاں وقت کے مغل بادشاہوں نے حاضری دی ہے۔ پانی پت کا تاریخی معرکۂ کارزار اسی مدرسہ کے ایک فرد کا برپا کیا ہوا تھا۔ سرحد اور پنجاب کے میدانوں میں رنجیت سنگھ کی فوجوں سے جن سرفروشوں کی محاذ آرائی ہوئی وہ اسی جامعہ، اسی مدرسہ اور اسی خانقاہ سے درس جہاد لے کر نکلے تھے۔ جزائر انڈمان کی قبروں میں اسی درس گاہ کے متعلمین محوِ خواب ہیں۔ (۶۷)

گویا جامعہ رحیمیہ کی ایک ایک اینٹ تاریخ مسلمانان ہند کا ایک ایک باب ہے۔ ہم شاہ عبدالرحیم کے علاوہ اس دور کے کسی معلم کے متعلق کوئی خبر نہیں پاتے، اس دور میں طلباء کی

تعداد زیادہ نہیں تھی، سب سے نمایاں طالب علم شاہ ولی اللہؒ اور شیخ بدر الحق پھلتیؒ تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ کی وفات کے بعد ۱۱۴۲ھ میں شاہ ولی اللہؒ نے شیخ پھلتیؒ کو سند دی تھی۔ (۶۸)

جامعہ رحیمیہ کا زمانۂ عروج

''جامعہ رحیمیہ'' کا اصل اور روشن دور، شاہ ولی اللہؒ کا دور ہے۔ شاہ صاحب اپنے والد کی حیات ہی میں درس دینے لگے اور ان کی وفات کے بعد زیادہ احساس ذمہ داری اور زیادہ انہماک کے ساتھ تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے مسند درس پر متمکن ہونے کے بعد نصابِ تعلیم میں بھی ترمیم کی اور درس قرآن کریم کو جزو نصاب قرار دیا۔ (۶۹) اس دور کے کسی دوسرے معلم کا نام نہیں ملتا ہے لیکن شاہ صاحبؒ کے ۳۵ شاگردوں کے نام تاریخ نے محفوظ کئے ہیں، جن میں شاہ محمد عاشقؒ، شاہ نور اللہ پھلتیؒ، شاہ اہل اللہؒ اور خواجہ محمد امین کشمیریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۷۰)

جامعہ رحیمیہ کا تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب اہتمام کا بار شاہ عبدالعزیزؒ جیسے پختہ کار جوان نے اٹھایا۔ جامعہ کا یہ دور اپنے ماقبل کے ادوار سے ہر اعتبار اور ہر پہلو سے ایک تابناک اور روشن دور تھا۔ اس دور کے مستفیدین و تلامذہ کی تعداد ناقابل شمار ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ جب ریح البواسیر کے عوارض کا شکار اور نابینا ہو گئے تو جامعہ کی صدارت پر شاہ رفیع الدینؒ عہدہ برآ ہوئے اور جب ۱۸۱۷ء میں وہ رحلت فرما گئے تو شاہ محمد اسحاقؒ کی نوجوانی نے حوادث کی دعوت مبارزت کو لبیک کہا اور شاہ عبدالعزیزؒ کی نگرانی میں جامعہ کے لیے خدمات انجام دیں اور ۱۸۲۳ء کے بعد تو وہی تمام شعبوں میں نانا کے جانشین ہوئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ:

> ''شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ (درس و تدریس) جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسہ کی خدمات اپنے ذمہ لے لیں۔ (۷۱)''

اس واقعہ کو شیخ محمد اکرام نے بھی اپنی کتاب رود کوثر میں نقل کیا ہے۔ جامعہ کا چوتھا دور، متاخرین کا دور ہے اس وقت صدارت کی گدی پر شاہ محمد اسحاق متمکن تھے۔

مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں کہ:

”۱۲۵۶ھ میں شاہ محمد اسحاق مع اہل وعیال حجاز مقدس ہجرت کر گئے۔ اب مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے، چوہان کسان غریب لوگ رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مسجد آپ کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں آپ نماز پڑھتے تھے۔ اب یہ کل جائیداد رائے شیو پرشاد کی ہے اس لیے اس گلی پر 'مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس' کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔“ (۷۲)

شاہ محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد اس عظیم الشان جامعہ کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا اختتام ہو گیا۔ پانچواں دور ۱۳۰۸ھ میں شروع ہوا اور بہت جلد ختم ہو گیا یہ دور تجدیدِ احیاءِ جامعہ کی ایک نیک دلانہ خواہش کا جوش تھا اور صرف برائے نام کامیابی پر منتج ہو کر بہت جلد ختم ہو گیا۔

برصغیر پر برطانوی تسلط

سیاسی طاقت کے اعتبار سے مغلوں کا عہد حکمرانی ۱۷۶۱ء میں ختم ہو گیا تھا تقریباً ایک سو سال کے عرصے میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوپاک کو رفتہ رفتہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے ملک کی سیاسی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس عرصہ میں ہندوستانیوں کو سخت مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

کمپنی نے اپنی صد سالہ حکومت کے ایام میں رعایا کی تعلیم اور معاشرتی ترقی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ملازم زیادہ تر تجارتی فائدے کے خیال میں مگن رہتے تھے۔ اس لیے لوگوں کی معاشرتی اور اقتصادی حالت ابتر ہو گئی۔ مذہبی خیالات کی بنا پر مسلمانانِ ہند عام طور پر مغربی تعلیم کے سخت مخالف تھے اور انہیں یقین ہو چکا تھا کہ ۱۸۵۶ء کی عام تعلیم کی تجویز لوگوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے پاس کی گئی ہے۔ (۷۳)

علم وادب کی حالت

مسلم ریاستوں کے ختم ہو جانے سے مسلمانوں کے لیے اور بھی کئی طرح کے مسائل پیدا ہو گئے۔ مختلف دربار علم وفضل، شاعری، ادب، فنون اور دست کاریوں کے سرپرست تھے۔ اس زمانے میں بھی جب کہ مغل بادشاہ خود ایک وظیفہ خوار تھا وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ کی سرپرستی کرتا تھا۔(۷۴) جب دہلی کا دربار بالکل غریب ہوگیا تو شاعروں نے لکھنؤ کی طرف ہجرت شروع کردی۔(۷۵) ۱۸۵۶ء تک لکھنؤ کا دربار بھی رخصت ہوا تو مذاق سخن کی پرورش کے لیے کوئی داعیہ باقی نہ رہا۔

اقتصادی حالت

مسلم دست کار جو مختلف اشیاء تیار کرتے تھے ان کی بہت زیادہ کھپت درباروں میں ہوتی تھی۔ درباروں کے غائب ہوتے ہی ان کی مانگ ختم ہوگئی۔ اس بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشی حالت میں بھی انحطاط ہوگیا۔ کمپنی کے ملازمین نے ایسے طریقے اختیار کئے جن سے بنگال کی صنعت پارچہ بافی مستقلاً مجروح ہوگئی۔(۷۶) ابتداء میں ہندوستان سے مقابلہ برطانیہ کی نوخیز صنعت پارچہ بافی کے لیے بھی تکلیف دہ تھا۔(۷۷) مگر بعد میں کایاپلٹ گئی کیونکہ برطانیہ کی صنعت کو تحفظ دیا گیا اور صنعتی پیداوار کے لیے جدید طریقے اختیار کئے گئے۔(۷۸)

مشرقی سمندروں میں یورپی ممالک کی قوت بڑھ جانے سے مسلم تجارت کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔(۷۹) کمپنی زیادہ تر حکمت عملی کے طور پر ہندو تاجروں سے کاروبار کرتی تھی، اس کے گماشتے سب کے سب ہندو ہوتے تھے، اس طرح مسلم تجارت کو عالمِ وجود سے خارج کردیا گیا۔

تعلیمی حالت

مسلمان تعلیم کے معاملے میں بھی ہر طرح سے متاثر ہوئے، مسلم ریاستوں کے ختم ہو جانے سے ان کے نظام تعلیم کے لیے حکومت کی سرپرستی ختم ہوگئی۔ وارن ہسٹنگز نے

کمپنی کی ملازمت کے لیے مسلمانوں کو تربیت دینے کی غرض سے کلکتہ میں "مدرستہ العالیہ" قائم کیا۔ کیونکہ اس زمانے میں ضروری سمجھا جاتا تھا کہ فوجداری عدالتوں کے انتظام اور پولیس کے بعض شعبوں کو مسلمان حاکموں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔(۸۰) ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ کمپنی کی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں کے علم وفضل کو بہتر بنانے میں یہی ایک مثال تھی۔(۸۱) آگے لکھتا ہے کہ کمپنی کے ماتحت مسلم تعلیمی اوقاف کی کہانی بڑی افسوس ناک ہے۔ان مسلم اوقاف کا سرمایہ حکومت کے عام ادارے چلانے کے لیے منتقل کر دیا گیا اور مسلمانوں کے مفاد کو خاص طور پر محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔(۸۲)

برصغیر پاک وہند کے طول وعرض میں دینی مقاصد کے لیے بہت سی زمینیں لوگوں کے پاس انعام کے طور پر تھیں۔ ان میں سے اکثر کی آمدنی تعلیم کے لیے مخصوص تھی۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ان واقعات کے متعلق ایک سخت تحقیق کرائی گئی، غیر معقول ثبوت طلب کیے گئے اور جاگیروں کی ایک بڑی تعداد ضبط کر لی گئی۔(۸۳)

مذہبی حالت

مسلمانوں نے حکومت کے تعلیمی اداروں سے اس لیے احتراز کیا تھا کہ انہیں اپنی ثقافت اور روایات پر فخر وناز تھا۔(۸۴) ان کے نزدیک علم کو عقیدے سے جدا کرنا غیر ممکن تھا۔ اپنی پوری تاریخ میں وہ اس تصور کے عادی ہو چکے تھے کہ تمام علم ان اقدار پر مبنی ہو جن کی تعلیم مذہب نے دی ہے۔ اب ان سے دفعتاً یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے عقیدے کو ترک کر دیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکے اگرچہ اس عمل کی پاداش میں انھیں نقصانات عظیم برداشت کرنے پڑے۔ برطانوی حلقے اس کا یقین واثق رکھتے تھے کہ جدید علوم کی روشنی سے "ہندوستانی توہمات" خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ لارڈ میکالے نے مغربی علوم کی اس نئی پالیسی کے نتیجہ خیز اثرات کو محسوس کرتے ہوئے ۱۲/۱ اکتوبر ۱۸۳۶ء میں اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا کہ جدید تعلیم کے اجراء کے بعد تیس (۳۰) سال کی مدت میں بنگال کے اندر ایک بھی بت پرست باقی نہیں رہے گا۔(۸۵)

مسیحی مبلغوں نے بھی اپنی امیدوں کو پردۂ راز میں نہیں رکھا اور اعلان کر دیا

کہ مغربی تعلیم کی اشاعت کے نتیجے میں دینی مذہب کی عمارتیں مسمار ہو جائیں گی۔ (۸۶)

برصغیر میں جب اس تعلیم کی ابتداء ہوئی تو اس پر مسیحی مبلغین کا زبردست رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن ہندوؤں نے اسے پہلے حاصل کیا ان میں سے بہت سوں نے مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ اس وقت بہت سے ایسے عیسائی ادارے موجود تھے جو عیسائی تعلیم دینے کی کوشش کرتے تھے۔

مسیحی مبلغین کا توہین آمیز رویہ

مسلمان ان طریقوں سے خوش نہیں تھے جو مسیحی مبلغین نے اختیار کئے تھے، ان کے اصول کار توہین آمیز اور بھونڈے تھے۔ (۸۷) ۱۹ ویں صدی کے پہلے نصف میں کمپنی کے دیوانی اور فوجی حکام میں تبلیغی جوش وخروش عام تھا۔ (۸۸) وہ ان بیانات سے متأثر تھے جو پارلیمنٹ میں دیئے گئے تھے اور جن میں یہ کہا جاتا تھا کہ اگر اس وسیع علاقے کو مسیح کے لیے فتح نہ کیا گیا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ (۸۹)

۱۸۳۷ء میں ایک بڑا قحط پڑا۔ ان یتیموں اور دوسرے بچوں کو جن کے سرپرست ان کی کفالت کرنے کے قابل نہیں تھے، عیسائی مبلغین کے حوالے کر دیا گیا۔ جو ہندو یا مسلمان اپنے ہم مذہب بچوں کی پرورش کرنا چاہتے تھے انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ (۹۰)

عام آدمی کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ کمپنی کی حکومت تمام باشندوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ مذہبی معاملات میں غیر جانبداری، جس کا دعویٰ حکومت نے بڑی شدومد سے کیا، بعد کی بات ہے جب کہ ایک غلط حکمت عملی کے الم ناک نتائج بڑی قوت کے ساتھ ظاہر ہو چکے تھے۔ اس معاملہ میں ہندو اور مسلم یکساں حساس تھے۔ اگرچہ زیادہ بھیڑیں ہندوؤں کے گلے سے مسیحی مبلغوں کے ہاتھ آئی تھیں۔

مسلمان اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ وہ انگریزوں کو ایسی طاقت سمجھتے تھے جو ان کے مصائب کی ذمہ دار تھی۔ کچھ مراعات دی گئیں تو وہ بھی ہندوؤں کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ کمپنی کے حکام مسلمانوں کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے تھے، ان کا نسلی

تکبر نا قابل برداشت ہو گیا تھا۔(۹۱) یہاں تک کہ سر سید (احمد خان) جیسے انگریزوں کے وفادار انسان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ اوسط درجے کا انگریز یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں شرفاء ہوتے ہی نہیں۔(۹۲) مسلمان اس قسم کی سبکیوں کو بہت محسوس کرتے تھے۔

مسلمان ناراض ہوا اور وہ اپنی شکایتوں کو دل ہی دل میں رکھتا رہا، انگریز نے اس کے لیے ناممکن بنا دیا کہ وہ اپنے غصے پر قابو پا سکے۔ یہ آگ اسی طرح سلگتی رہی حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں بھڑک اٹھی۔(۹۳) برصغیر کے باشندوں نے خونریز انقلابی جد و جہد سے سفید فام آقاؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دراصل بدیشی راج کے ختم کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ پہلی متحدہ سعی عظیم تھی جسے پنجابیوں، سکھوں، پٹھانوں اور اکثر والیان ریاست کی غداری کے باعث ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔(۹۴)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات

مسلمانوں کا تنزل جو ۱۷۱۲ء میں شروع ہوا تھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اپنی انتہاء کو پہنچ گیا۔ اسلامی حکومت کا چراغ گل ہو گیا۔ تخت حکومت تختہ دار میں تبدیل ہو گیا۔ بادشاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔(۹۵) مغل شہزادے جو کبھی حریر و دیبا کے بستروں پر سویا کرتے تھے، دلی کی گلیوں میں ٹھوکریں کھانے لگے۔ وہ شہزادیاں جن کے آنچلوں کو فرشتوں کی آنکھوں نے بھی نہ دیکھا تھا ان کی ناموس سر بازار رسوا ہو رہی تھی۔ دہلی کے لال قلعہ پر برطانوی پرچم لہرا رہا تھا۔ جامع مسجد کے مینار یہ اندوہ ناک منظر دیکھ کر چپکے چپکے آنسو بہا رہے تھے۔ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص میں ہُو کا عالم تھا۔ سہاگ لٹ رہے تھے۔ چوڑیاں ٹوٹ رہی تھیں، مانگیں اجڑ رہی تھیں اور حوض قاضی کے چوراہے پر ان گنت لاشیں ابھی تک تختہ دار پر لٹک رہی تھیں۔ انہیں اتار کر کوئی دفن کرنے والا نہ تھا۔ یہ لاشیں حقیقت میں انسانوں کی لاشیں نہیں تھیں۔ آٹھ سو سالہ اقتدار کی، مسلمانوں کی عظمت کی، مغلوں کی سطوت و جبروت کی لاشیں تھیں۔ خانقاہوں میں اندھیر تھا۔ مدارس کی دیواریں اونگھ رہی تھیں۔ جمنا میں پانی کے بجائے مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ ہر طرف آگ تھی، شعلہ تھا، دھواں تھا، فریاد و نوحہ کی صدائیں تھیں اور ان سب کے بیچ میں دہلی اس

بیوہ عورت کی طرح کھڑی تھی جس کی مانگ سے ابھی ابھی سندور کھرچا گیا ہو یا اس ماں کی طرح جس کی گود سے اس کا پالا پوسا بچہ چھین کر اس کی نگاہوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا ہو۔

یہ حال صرف دہلی کا نہیں تھا بلکہ اس آگ میں پورا برصغیر جل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ حالات سدھرے اور ملک میں امن وامان قائم ہوا۔ لیکن اب مسلمان انگریزوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔ انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے یہ بغاوت برپا کی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہر جگہ رسوا کرنا شروع کیا۔ اور دھیرے دھیرے مسلمان سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ مناصب سے محروم ہو گئے۔ (۹۶) مسلمانوں نے اس برصغیر پر تقریباً آٹھ صدیوں تک حکومت کی تھی۔ وہ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کا طوطی بولتا تھا اور اب وہ اپنے ہی ملک میں انتہائی ذلت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ولیم رسل لکھتے ہیں کہ "سب سے زیادہ قابل مذمت وہ سزائیں ہیں جو مظلوموں کے مذہبی جذبات کی توہین کرتی ہیں۔ باغی کا یہ بھی حق ہے کہ اسے ایک مہذب طریقے سے پھانسی دی جائے۔ مسلمانوں کو سور کی کھالوں میں سلوانا اور ہندوؤں کے منہ میں گائے کا گوشت ٹھونسنا قطعاً غیر ضروری تھا"۔ (۹۷) یہی مصنف آگے لکھتے ہیں کہ "انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی مسلمانوں پر سوروں کا خون ملا گیا اور ان کی لاشوں کے اعضاء کاٹے گئے۔ تو یہ ایک مہذب حکومت کے لیے تعریف کی بات نہیں ہے"۔ (۹۸) سمتھ اپنی قوم کی سفاکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دہلی کی مسلم آبادی کے اس طبقے کو جو شہر پر انگریزوں کے تسلط سے قبل فرار نہیں ہو گیا تھا، مشتعل فاتح سپاہیوں کے حملے کی شدت پوری طرح برداشت کرنا پڑی۔ (۹۹)

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے انتقام لینے کے لیے ظلم وتشدد کا جو بازار گرم رکھا اس کی تفصیل سید طفیل احمد منگلوری یوں پیش کرتے ہیں:

"دہلی میں تمام لوگوں کے مکانوں کو لوٹ کر انہیں شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ ہزاروں عورتیں فوج کے خوف سے کنوؤں میں گر پڑیں یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہو گئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنویں سے نکالنا چاہا تو انہوں نے کہا ہمیں گولی سے مارو، نکالو نہیں ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں۔" (۱۰۰)

ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "The Indian Musalmans" میں مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"یہ لوگ (مسلمان) اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قومیت کے متعلق اپنے پرانے شدید جذبے اور سپاہیانہ مہم کی صلاحیت و قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر دوسرے اور تمام اعتبارات سے وہ ایک ایسی قوم ہے جو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ ہو چکی ہے۔" (۱۰۱)

ان حالات میں مسلمانوں پر اضمحلال و جمود کا طاری ہونا فطری تھا۔ ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی اور مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ اب تک ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اب فارسی کو نکال کر انگریزی کو رائج کیا جارہا تھا جس سے مسلمان نابلد تھے۔ کوئی ایسی قیادت سامنے نہیں تھی جو اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو تیار کرتی، قوم عجیب مادی بے سروسامانی، فکری دیوالیہ پن اور ذہنی کشمکش سے دوچار تھی، ایسے حالات میں مسلمانوں کی جہالت اور پستی کو دور کرنے کے لیے چند تعلیمی اداروں نے خاصی سرگرمی دکھائی۔ وہ ادارے یہ ہیں۔

۱) فرنگی محل کا مدرسہ: اس مدرسہ نے ملا نظام الدینؒ جیسے عالم کو پیدا کیا جس نے "درس نظامی" کا نصاب مرتب کیا۔

۲) بریلی کا مدرسہ مظاہر الاسلام: اس کے بانی مولانا احمد رضا خان تھے۔

۳) ندوۃ العلماء: اس مدرسے کی بنیاد ۱۸۹۷ء میں مولانا سید محمد علی مونگیری نے رکھی۔

۴) جامعہ ملیہ دہلی: ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا، اس کے بانی محمد علی جوہرؒ تھے۔

۵) علی گڑھ تحریک: اس تحریک کا آغاز ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس کے بانی سر سید احمد خان تھے۔

۶) مظاہر علوم سہارنپور: ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں بنیاد رکھی گئی اور بانی مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ تھے۔ (۱۰۲)

۷) دار العلوم دیوبند: اس کی بنیاد ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰/مئی ۱۸۶۷ء کو رکھی گئی۔

اب ہم دارالعلوم دیو بند کی نہایت مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں علوم عربیہ واسلامیہ دوسری صدی ہجری میں داخل ہوئے تو ملتان کو پہلا ''مدینۃ العلم'' بننے کا شرف حاصل ہوا۔ پھر سلاطین غزنویہ کے عہد میں لاہور مرکز بنا، اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں دہلی علوم وفنون کا مرکز بنی، بعد ازاں دہلی کے اربابِ فضل وکمال سے جونپور میں علم کی مسند بچھی، جونپور کے علم کی روشنی سے لکھنؤ منور ہوا جس نے پورب کے ہر قصبے کو انوار علم سے جگمگا دیا۔ علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیر آباد اور بہار و بنگال کی علمی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں۔ شاہ جہاں بادشاہ جسے ''پورب ماشیراز ما است'' کہا کرتے تھے۔(۱۰۳)

مغل سلطنت کے آخری دور میں اس سرزمین میں حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسا عالم اٹھا جس کے علمی فیض سے ایشیاء کے اکثر ممالک آج تک سیراب ہو رہے ہیں۔ اس وقت برصغیر میں علوم دینیہ بالخصوص تفسیر وحدیث کے جتنے سلسلے موجود ہیں ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہوتا ہے۔(۱۰۴) ان کے بعد پھر مسلمان علمی لحاظ سے زوال کا شکار ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے دور میں ان کی علمی درس گاہیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم زوال کی آخری حد تک پہنچ گئے۔

مصر کے مشہور عالم سید رشید رضاؒ اسی علمی پستی و زوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بالخصوص علم حدیث تو پوری اسلامی دنیا میں ضعف کا شکار ہو چکا ہے۔ اب علمائے ہند کی کوششیں ہی اس سلسلے میں قابل تعریف ہیں چنانچہ رقم طراز ہیں:

"لولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فی هذا العصر لقضی عليها بالزوال من امصار المشرق فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق و الحجاز منذ القرن العاشر للجهره حتی بلغت منتهی الضعف لما فی اوائل هذا القرن الرابع العشر"۔(۱۰۵)

جنگ آزادی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ولی اللّٰہی تحریک کے ارباب حل وعقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سر نو شاہ عبدالعزیزؒ کے نمونے کا کوئی مدرسہ

ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "The Indian Musalmans" میں مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"یہ لوگ (مسلمان) اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قومیت کے متعلق اپنے پرانے شدید جذبے اور سپاہیانہ مہم کی صلاحیت و قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر دوسرے اور تمام اعتبارات سے وہ ایک ایسی قوم ہے جو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ ہو چکی ہے۔" (۱۰۱)

ان حالات میں مسلمانوں پر اضمحلال و جمود کا طاری ہونا فطری تھا۔ ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی اور مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ اب تک ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اب فارسی کو نکال کر انگریزی کو رائج کیا جارہا تھا جس سے مسلمان نابلد تھے۔ کوئی ایسی قیادت سامنے نہیں تھی جو اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو تیار کرتی، قوم عجیب مادی بے سروسامانی، فکری دیوالیہ پن اور ذہنی کشمکش سے دوچار تھی، ایسے حالات میں مسلمانوں کی جہالت اور پستی کو دور کرنے کے لیے چند تعلیمی اداروں نے خاصی سرگرمی دکھائی۔

وہ ادارے یہ ہیں۔

۱) فرنگی محل کا مدرسہ: اس مدرسہ نے ملا نظام الدینؒ جیسے عالم کو پیدا کیا جس نے "درس نظامی" کا نصاب مرتب کیا۔

۲) بریلی کا مدرسہ مظاہر الاسلام: اس کے بانی مولانا احمد رضا خان تھے۔

۳) ندوۃ العلماء: اس مدرسے کی بنیاد ۱۸۹۷ء میں مولانا سید محمد علی مونگیری نے رکھی۔

۴) جامعہ ملیہ دہلی: ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا، اس کے بانی محمد علی جوہرؒ تھے۔

۵) علی گڑھ تحریک: اس تحریک کا آغاز ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس کے بانی سرسید احمد خان تھے۔

۶) مظاھر علوم سہارنپور: ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں بنیاد رکھی گئی اور بانی مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ تھے۔ (۱۰۲)

۷) دارالعلوم دیوبند: اس کی بنیاد ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰/مئی ۱۸۶۷ء کو رکھی گئی۔

اب ہم دارالعلوم دیوبند کی نہایت مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں علوم عربیہ و اسلامیہ دوسری صدی ہجری میں داخل ہوئے تو ملتان کو پہلا "مدینۃ العلم" بننے کا شرف حاصل ہوا۔ پھر سلاطین غزنویہ کے عہد میں لاہور مرکز بنا، اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں دہلی علوم وفنون کا مرکز بنی، بعد ازاں دہلی کے ارباب فضل وکمال سے جونپور میں علم کی مسند بچھی، جونپور کے علم کی روشنی سے لکھنؤ منور ہوا جس نے پورب کے ہر قصبے کو انوار علم سے جگمگا دیا۔ علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیر آباد اور بہار و بنگال کی علمی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں۔ شاہ جہاں بادشاہ جسے "پورب ماشیراز ما است" کہا کرتے تھے۔ (۱۰۳)

مغل سلطنت کے آخری دور میں اس سرزمین میں حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسا عالم اٹھا جس کے علمی فیض سے ایشیاء کے اکثر ممالک آج تک سیراب ہو رہے ہیں۔ اس وقت برصغیر میں علوم دینیہ بالخصوص تفسیر وحدیث کے جتنے سلسلے موجود ہیں ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہوتا ہے۔ (۱۰۴) ان کے بعد پھر مسلمان علمی لحاظ سے زوال کا شکار ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے دور میں ان کی علمی درسگاہیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم زوال کی آخری حد تک پہنچ گئے۔

مصر کے مشہور عالم سید رشید رضاؒ اسی علمی پستی و زوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بالخصوص علم حدیث تو پوری اسلامی دنیا میں ضعف کا شکار ہو چکا ہے۔ اب علمائے ہند کی کوششیں ہی اس سلسلے میں قابل تعریف ہیں چنانچہ رقم طراز ہیں:

"لولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فی هذا العصر لقضی عليها بالزوال من امصار المشرق فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق و الحجاز منذ القرن العاشر للجهره حتی بلغت منتهی الضعف لما فی اوائل هذا القرن الرابع العشر"۔ (۱۰۵)

جنگ آزادی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ولی اللہی تحریک کے ارباب حل وعقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سر نو شاہ عبدالعزیزؒ کے نمونے کا کوئی مدرسہ

قائم کیا جائے جو ولی اللّٰہی تحریک کا مرکز بن سکے۔(۱۰۶) مولانا فضل الرحمانؒ، مولانا ذوالفقارؒ اور ایک صوفی بزرگ حاجی عابد حسینؒ نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کیا جائے۔ چنانچہ سقوط دِلی کے دس سال بعد ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰/مئی ۱۸۶۷ء (۱۰۷) کو دِلی سے ایک سو چوالیس کلومیٹر کے فاصلے بر شمال کی سمت میں ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی مشہور چھتہ والی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس درس گاہ کا آغاز ہوا۔ اس درس گاہ کے سب سے پہلے طالب علم محمود (شیخ الہندؒ) اور پہلے استاد محمودؒ تھے۔(۱۰۸) جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حاجی عابد حسینؒ تھے، تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے۔ ۱۹/محرم کو ایک اشتہار کے ذریعے قیامِ مدرسہ کا اعلان کیا گیا۔ پہلے سال کے اختتام پر طلبہ کی تعداد ۷۸ ہو گئی۔ مدرسے کے مہتمم شاہ رفیع الدینؒ مقرر ہوئے جو شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے خلیفۂ ارشد تھے اور صدر المدرسین مولانا محمد یعقوبؒ مقرر ہوئے۔(۱۰۹)

اس مدرسہ کا بنیادی خیال حاجی امداد اللہؒ نے مکہ معظمہ میں سوچا تھا اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سات سال کی مسلسل کوشش سے اسے عملی شکل دی، مدرسہ کا نصاب، نظامِ عمل اور اساسی قواعد آپ ہی نے مرتب کئے اور اس طرح شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسہ اور ولی اللّٰہی تحریک کے مقاصد کو دارالعلوم دیوبند کی صورت میں محفوظ کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند دراصل اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا محمد اسحاقؒ کے ہجرت کرنے کے بعد ان کے پیروکاروں نے ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی، اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے مولانا مملوک علیؒ صدر مدرس دہلی کالج کے لیے مخصوص رہی۔ جنگ آزادی کے بعد یہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سرسید احمد خان نے اسی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔ یہ دونوں حضرات مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے۔(۱۱۰)

حسن اتفاق سے دارالعلوم دیوبند کو بڑا فروغ نصیب ہوا اور اس مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء ہزاروں کی تعداد میں اطرافِ ہند میں پھیل گئے۔

دارالعلوم کی تاریخ کا پہلا دور جو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وفات کے ساتھ ۱۹۰۵ء

میں ختم ہوتا ہے، علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لیے مخصوص رہا۔ ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے علمائے دیوبند کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کر دیا۔ اور اس ضمن میں آپ نے کالج پارٹی کے انقلابی عنصر کو بھی ساتھ ملا دیا۔ آپ نے ایک طرف عربی پڑھے ہوئے علماء کو ایک نظام میں جمع کیا تو دوسری طرف مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر انصاریؒ اور انگریزی کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ دارالعلوم اور کالج کے حریت پسند افراد باہم مل کر کام کریں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے موقع پر ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اپنی صدارتی تقریر میں طلبہ سے کہا:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس دور کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں و کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔'' (۱۱۱)

شیخ الہندؒ نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا وہ ۱۹۰۶ء میں ''جمعیت الانصار'' کا قیام تھا۔ اس کے سیکرٹری مولانا عبیداللہ سندھیؒ جو ''حضرت کے دماغ گنے جاتے تھے مقرر کئے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اپنا کام دہلی منتقل کر لیا اور ۱۹۱۳ء میں وہاں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کی بنیاد ڈالی، اس کے سرپرست مولانا محمود حسنؒ ہی تھے۔ (۱۱۲) آپ جب حرمین شریفین کی طرف سفر کرنے لگے تو آپ نے اپنے قابل اعتماد شاگرد اور ولی اللٰہی علوم کے جامع مولانا انورشاہ کشمیریؒ کو اپنی نیابت کے لیے منتخب کیا۔ مولانا محمد میاں کہتے ہیں کہ:

> ''دارالعلوم کی جانشینی ایک ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحبؒ کے قامت موزوں پر راست آرہا تھا۔'' (۱۱۳)

اس طرح تحریک شاہ ولی اللہؒ کی قیادت مولانا انورشاہ کشمیریؒ کے ہاتھ میں آئی،

انھوں نے ایک کامیاب قائد کی حیثیت سے اس کاروان تحریک کو منزل کے قریب تر کر دیا۔ آپ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ اس عرصہ میں تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا۔ (۱۱۴)

دارالعلوم کی مجالس: دارالعلوم دیوبند کی حسب ذیل تین مجالس (کمیٹیاں) تھیں:

۱) مجلس شوریٰ ۲) مجلس عاملہ ۳) مجلس علمیہ

سطور ذیل میں ان مجالس کا اجمالی تعارف پیش خدمت ہے:

۱) مجلس شوریٰ: یہ دارالعلوم کی سب سے بڑی با اختیار مجلس ہے۔ ادارہ کا تمام نظم و نسق چلاتی ہے اس کے کل ممبر ۲۱ ہیں۔ ادارہ کے مہتمم اور صدر مدرس بھی اس کے ممبر ہوتے ہیں۔ سال میں دو اجلاس ہوتے ہیں۔ ایک محرم میں اور دوسرا رجب میں۔

۲) مجلس عاملہ: یہ مجلس شوریٰ کا ذیلی ادارہ ہے۔ مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور تجاویز کا نفاذ، نظم و تعلیم اور دفاتر کے حساب کی نگرانی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ممبران کی تعداد نو ہے۔ مہتمم اور صدر مدرس مستقل ممبر ہیں۔ باقی ارکان مجلس شوریٰ سے ایک سال کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ سال میں چار اجلاس ہوتے ہیں۔

۳) مجلس علمیہ: یہ صدر المدرسین کی کابینہ ہے اور اسے مختلف امور کے بارے میں مشورے دیتی ہے۔

دارالعلوم کے شعبہ جات: دارالعلوم دیوبند کے شعبہ جات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) تعلیمی شعبہ جات (ب) انتظامی شعبہ جات (ج) مالی شعبہ جات تعلیمی شعبہ جات کے چودہ، انتظامی کے پندرہ اور مالی کے چار ذیلی شعبہ جات ہیں:

دارالعلوم کا نصاب: درجاتِ عربیہ کا نصاب گیارہ سال کا ہے اور اس میں ۲۲ علوم و فنون داخل ہیں۔ جن میں کچھ علوم عالیہ ہیں جو مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور کچھ علوم آلیہ ہیں جو علوم عالیہ کے لیے مدد و معاون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علوم عالیہ: قرآن عظیم، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام، علم الاحسان (تصوف) علم الفرائض والمواریث۔

علوم آلیہ: صرف، نحو، معانی و بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض وقوافی، مناظرہ، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، تجوید وقراۃ

حال ہی میں درجات عربیہ میں جغرافیہ، تاریخ، مبادی سائنس اور معلومات عامہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔(۱۱۵)

جرائد دار العلوم: دار العلوم سے دو رسالے نکلتے ہیں:

۱) رسالہ دار العلوم۔ یہ رسالہ اردو زبان میں شائع ہوتا ہے۔

۲) دعوت الحق۔ یہ رسالہ عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔(۱۱۶)

دار العلوم کا صد سالہ ریکارڈ: ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ایک سو سال کی مدت میں ۶۵۷۲ فضلاء اور طلبہ نے دار العلوم سے استفادہ کیا۔ ان میں ۶۹۸۶ وہ فارغ التحصیل ہیں جن کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ ۳۱۹۱ پاکستانی اس ادارہ سے فیض یاب ہوئے۔ اسی طرح ۳۷۹۵ ہندوستان کے باشندے ہیں جنہوں نے اکتساب فیض کیا۔ ۴۳۱ بیرونی ممالک سے آنے والے ہیں جو زیور تعلیم سے آراستہ ہوکر اوطان کو لوٹے۔ بیرونی ممالک سے آنے والے طلبہ کا تعلق زیادہ تر افغانستان، سائبیریا، چین، برما، ملائیشیا، انڈونیشیا، عراق، کویت، ایران، سیلون، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، شام اور یمن سے ہے۔ اس ایک صدی کے عرصہ میں ادارہ نے ۵۳۶ مشائخ طریقت" ۵۸۸۸ مدرسین، ۱۱۶۴ مصنفین، ۱۷۸۴ مفتی، ۱۵۴۰ مناظر، ۶۸۴ صحافی، ۴۲۸۸ خطیب و مبلغین، ۲۸۸ طبیب اور ۷۴۸ ایسے علماء جن کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے تھا پیدا کئے۔ اور اس ایک سو سال کے اندر ابنائے دار العلوم نے ۸۹۳۶ مدارس ومکاتب قائم کئے۔(۱۱۷)

دار العلوم کے اعلیٰ عہدے: اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے چار ہیں:

(۱) سرپرستی (۲) اہتمام (۳) صدارت تدریس (۴) افتاء

دار العلوم دیوبند کے مندرجہ ذیل حضرات سرپرست رہے ہیں:

۱) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء تا ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء

۲) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ: ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء تا ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء

۳) مولانا محمود حسنؒ: ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء تا ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء اولاً

۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء تا ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء ثانیاً

۴) مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ: ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء تا ۱۳۳۷/۱۹۱۸ء

۵۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ: ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء تا ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء

اس کے بعد آپ نے سرپرستی کے عہدہ سے استعفاء دے دیا۔ آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔ (۱۱۸)

مہتمم: دارالعلوم کے مہتمم کے عہدہ پر مندرجہ ذیل حضرات فائز رہے ہیں:

۱۔ حاجی سید عابد حسینؒ: اولاً۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء تا ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء

ثانیاً۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء تا ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء

ثالثاً۔ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء تا شعبان ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء

۲) مولانا شاہ رفیع الدینؒ: اولاً۔ شعبان ۱۲۹۴ھ/۱۸۶۸ء تا ۱۲۹۵ھ/۱۸۶۹ء۔ ثانیاً۔ ذی قعد ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۳ء تا ربیع الاول ۱۳۰۶/۸۸۹ء

۳) حاجی محمد فضل حقؒ: شعبان ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء تا ذوالقعدۃ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء

۴) مولانا محمد منیر نانوتویؒ: ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء تا جمادی الاولیٰ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء

۵) حافظ محمد احمد نانوتویؒ: جمادی الثانیہ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء تا جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء

۶) مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ: جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء تا شعبان ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء

۷) مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ: ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء تا ۹/اگست ۱۹۸۲ء

۹/اگست کو قاری صاحبؒ نے مجلس شوریٰ میں اپنا استعفاء دے دیا جسے دارالعلوم کے حق میں بہتر خیال کرتے ہوئے مجلس نے منظور کرلیا گیا، اس ضمن میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا محمد طیب ''مہتمم ادارہ ہذا کو مہتمم کے عہدے سے معطل کیا گیا، اور ان کی جگہ مولانا مرغوب الرحمان کو مہتمم مقرر کیا گیا۔'' (۱۱۹)

اس واقعہ کے ایک سال بعد ۶/شوال ۱۴۰۳ھ/اگست ۱۹۸۳ء کو مولانا قاری محمد طیبؒ راہی ملک عدم ہوئے۔

صدر مدرس

۱) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ: ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء تا ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۶ء

۲) مولانا سید احمد دہلویؒ: ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۶ء تا ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء

۳) مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ: ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء تا ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء

۴) مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (صاحب سوانح): ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء تا ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء تا اوائل ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء۔

پھر دار العلوم میں اصلاحی تحریک کے سلسلے میں آپ نے احتجاجاً استعفاء دے دیا۔ جسے مجلس شوری نے منظور کرلیا اس کے بعد آپ ڈابھیل چلے گئے۔

۵) مولانا سید حسین احمد مدنیؒ: شوال ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء تا جمادی الاول ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء

۶) مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ: ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء تا ۱۳۸۲ھ (۱۲۰)

۷) مولانا معراج الحق: رجب ۱۴۰۱ھ میں صدارت تدریس کے خالی منصب پر مولانا مذکور کا تقرر ہوا۔ (۱۲۱)

دار العلوم کی خدمات پر تبصرہ

دار العلوم دیوبند ظاہر ہے ایک قدیم طرز کی اسلامی درس گاہ ہے۔ اس میں اسلامی علوم وفنون کی ایک خاص انداز سے تعلیم دی جاتی ہے، اگر اس کا موازنہ جدید علمی درس گاہوں سے کریں تو اس معیار پر پہنچنے میں دار العلوم ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی ہے۔

دینی مدارس کے سلسلہ میں استاذی المکرم مولانا سید محمد متین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے دینی مدارس کا نصاب تعلیم وہی صدیوں پرانے درس نظامی کا نصاب تعلیم تھا جو دور جدید میں اپنی افادیت کھو چکا تھا۔ ضرورت تھی کہ عصری مقتضیات کے تحت اس میں تبدیلی کی جاتی اور جدید علوم داخل کئے جاتے تاکہ طلباء میں مؤمنانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا

حل پیش کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی لیکن علماء اپنے اسلاف کی چٹائیوں پر بیٹھ کر انھی کتب کا درس دیتے اور لیتے رہے جنہیں اسلاف کرام نے پڑھا اور پڑھایا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک اور جامد رجحان تھا اور اس کی اصلاح ضروری تھی۔'' (۱۲۳)

دارالعلوم دیوبند کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے فارغ التحصیل افراد تفکّر و تدبرّ، ذہانت و فطانت اور اخلاق و سیرت کے بلند معیار پر ہیں۔ ان میں دوسرے دینی مدارس اور مکاتب فکر کی نسبت وسعت قلبی، بلند نظری، علم دوستی، عصری تقاضوں پر نگاہ، کام کی عظمت اور اخلاص و عمل کی صلاحیتیں مقابلتاً زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نصاب اتنا جامد اور غیر لچکدار نہیں ہے جتنا دوسری درس گاہوں کا ہے اور ارباب دارالعلوم وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔

دارالعلوم اپنے طلباء کو محض ملائے مکتبی یا دو رکعت کے امام بنانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس نے ہمیشہ اپنے طلبہ کے اندر عزت نفس کا جوہر پیدا کیا ہے۔ حالات اور وقت کے مطابق ارباب دارالعلوم نے اپنے طلبہ کو جدید علوم و فنون کے مطالعہ اور غور و فکر کا موقع دیا ہے۔ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علم ہیئت، فلسفہ، سائنس، اقتصادیات اور سیاسیات جیسے علوم پڑھائے ہیں تاکہ وہ ہر پہلو پر محققانہ نظر رکھتے ہوں۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو مختلف صنعتوں اور دستکاریوں کی تربیت بھی دی ہے تاکہ عملی زندگی میں وہ دوسروں کے دست نگر نہ بنیں اور باعزت طور پر روزی کما سکیں۔ یہ اقدامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کو دوسرے دینی مدارس کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہے۔

ذرا اس حقیقت پر بھی نگاہ ڈالیے کہ ارباب دارالعلوم کا دعویٰ ہے کہ وہ ولی اللٰہی مکتب فکر کے حامل اور امین ہیں اور انہی علوم کی حفاظت اور ترویج کے لیے یہ ادارہ قائم کیا ہے لیکن دارالعلوم کے گیارہ سالہ نصابِ تعلیم کو دیکھئے جس کی تفصیل قاری محمد طیبؒ نے ایک کتابچے ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے تیرہ صفحات پر دی ہے۔ اس میں سوائے ''الفوز الکبیر'' کے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کوئی کتاب داخل نصاب نہیں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ دارالعلوم کے

نصاب میں ان کی تصانیف کو نمایاں مقام حاصل ہوتا تاکہ نوجوان نسل ان کے افکار سے آگاہ ہو کر عملی زندگی میں انقلاب پیدا کرتی جو آپ اپنی قوم کے ہر فرد میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

شیخ محمد اکرام دارالعلوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گذشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دورِ حاضر کے مصری علماء کی تصانیف سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی بعض علماء کو ہے لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے۔ وہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں۔ جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے۔ مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی۔ یہ درست ہے کہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں بہت باخبر نہیں لیکن آخر ان میں تقویٰ، پرہیزگاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ صرف اسی کا فیض ملک کے دور دراز حصوں میں پہنچانا ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت ہے اور اس کے علاوہ اگرچہ دیوبند میں نئے علوم سے بہت واقفیت نہیں، لیکن ان کمیوں کا احساس ہو رہا ہے۔'' (۱۲۴)

آگے لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار و مرتبہ حاصل کر لیا ہے، وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واقعی ثبوت ہے اور انہیں اس پر فخر کا جائز حق ہے۔ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ دیوبند کی کامیابی علمی فتوحات کی وجہ سے کم اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے زیادہ ہوئی ہے اور اس کی عملی تشکیل میں چند ایک باتیں ابھی نظر میں کھٹکتی ہیں۔ ایک تو بعض ایسی شخصی اور انتظامی الجھنیں، جنھوں نے دوسرے اسلامی اداروں کی ترقی روک رکھی ہے، وہاں بھی پیدا ہوگئی ہیں ان کا سد باب لازمی ہے۔ دوسرے اگرچہ

دارالعلوم کا معیار بلند ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کی مرکزی اسلامی درس گاہ سے جو توقعات ہوسکتی ہیں وہ پوری ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مولانا محمود حسنؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے شائستہ طرز تحریر کے باوجود، تصنیف و تالیف کے میدان میں حضرات دیوبند ابھی ندوہ کے اہل قلم سے پیچھے ہیں۔" (۱۲۵)

شیخ موصوف اپنا مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ارباب دیوبند کو اپنے کام سے مطمئن ہونے کا حق اس وقت ہوگا جب اسلامی دنیا میں دیوبند کی جگہ تعداد طلبہ، اثر و رسوخ، نصاب، طریق تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے کم از کم مصر کی جامعہ الازہر کے ساتھ ہو اور طلبہ میں فقط تعداد کا خیال نہ ہو بلکہ کوشش ہو کہ ان میں سے کم از کم ایک آدھ تو اخلاقی جرأت، حکیمانہ ژرف نگاہی اور وسعت علمی کے لحاظ سے دارالعلوم کے موسس اعلیٰ شاہ ولی اللہؒ کا صحیح جانشین ہوسکے"۔ (۱۲۶)

شیخ صاحب نے اپنی تحریر میں تعریف و تنقید کا ملا جلا انداز اختیار کیا ہے اور آخر میں بڑے حسرت بھرے انداز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ دیوبند سے کم از کم ایک آدھا تو ایسا مرد آہن پیدا ہوتا جس میں اخلاقی جرأت، حکیمانہ ژرف نگاہی اور وسعت علمی جیسی اعلیٰ صفات ہوتیں۔

حالانکہ شیخ صاحب نے ایسی صفات دیوبند کے بہت سے سپوتوں میں خود ملاحظہ کی ہیں اور مولانا محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، اور علامہ عثمانیؒ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"یہ لوگ زہد و تقویٰ، راست گوئی، بے ریائی اور بے حرصی میں اسلاف کے بہترین علماء و صلحاء کا نمونہ تھے"۔ (۱۲۷)

درحقیقت مولانا انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم کے وہ عظیم سپوت ہیں جن میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا "صحیح جانشین" بننے کے لیے ضروری ہیں اور اس دور میں ان کی مثال "جامعہ الازہر" بھی پیش کرنے سے عاجز ہے بلکہ خود مصر کے مشہور زمانہ عالم سید رشید رضا مولانا انور شاہؒ کشمیری کی اخلاقی جرأت، حکیمانہ ژرف نگاہی اور وسعت علمی کے معترف ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں مولانا انور شاہ کشمیری کی عربی زبان میں فصیح و بلیغ تقریر سن کر بے ساختہ کہا:

" مارأيت مثل هذا الأستاذ الجليل " (١٢٨)

جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سید صاحب نے دارالعلوم اور مولانا انور شاہ کشمیری کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کئے:

"اگر میں دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتادیا کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں اور شیخ انور شاہؒ نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے ہیں اور جو مسلک مشائخ کا مجھے بتایا ہے، میں اس کو پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں"۔(١٢٩)

علامہ علی حنبلیؒ مصری نے آپ کا عربی قصیدہ پڑھا تو کہا اس قصیدے سے زمانۂ جہالت کے شعراء کی فصاحت و بلاغت کی مہک آرہی ہے۔(١٣٠)

مختصر یہ کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ہی وہ شخصیت ہیں جو اخلاقی جرأت، ژرف نگاہی اور وسعت علمی کے لحاظ سے دارالعلوم کے مؤسس اعلیٰ شاہ ولی اللہؒ کے صحیح جانشین کہلا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

١ Preaching of Islam. P.409-419

٢ برصغیر کی ملت اسلامیہ۔ ص٦

٣ فتوح البلدان۔ ص٣٥٥

٤ عجائب الہند۔ ص١٤٨، ١٦٥

٥ شمع نامہ۔ ص٨٩

٦ تاریخ ادبیات پاکستان وہند، عربی ادب۔ (٧١٢ء۔١٩٧٢ء) ج٢ ص٢

٧ آب کوثر ص٣١

٨ تاریخ ادبیات پاکستان وہند، عربی ادب۔ ج٢ ص٢

٩ تاریخ ادبیات پاکستان وہند ج٢ ص٢

١٠ ایضاً

١١ فتوح البلدان ص٤٤

١٢ The Administration of the Sultanate of Delhi, P.2,3

١٣ تاریخ ادبیات پاکستان وہند ج٢ ص٣٥

١٤ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ ص٧

١٧ Preaching of Islam.P.267

١٨ Preaching of Islam.P.267

١٩ South Indian Musalmans. P.39

٢٠ The Madura Country. V.3, P.70

٢١ The History of India as told by its own Historians.P.62

۲۲ Preaching of Islam.P.254

۲۳ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند۔(عربی ادب) ج ۲ ص ۵۲ تا ۵۶

۲۴ سفر نامہ ابن حوقل ص ۳۲۵

۲۵ آب کوثر ص ۵۵،۶۰

۲۶ طبقات ناصری ص ۱۲۴

۲۷ آب کوثر ص ۱۱۵

۲۸ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۸

۲۹ کتاب الخطط ج ۲ ص ۱۳۴

۳۰ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹

۳۱ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۵۱

۳۲ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۱،۱۹۲۰

۳۳ سفر نامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) ص ۲۰۷

۳۴ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ص ۴۱۹

۳۵ سیر المتاخرین۔ج ۱ ص ۱۴۰

۳۶ مسلمانوں کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ص ۴۲

۳۷ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۷

۳۸ حیات شبلی ص ۱۵

۳۹ تاریخ دارالعلوم دیو بند ص ۷۶

۴۰ اخبار الاخیار ص ۴۹۲

۴۱ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۔۲۳

۴۲ تاریخ دارالعلوم دیو بند ص ۷۷

۴۳ سوانح قاسمی ص ۴۹

۴۴ المعارف لاہور جنوری ۱۹۸۰ء ص ۳۱

۴۵ المعارف لاہور جنوری ۱۹۸۰ء ص ۳۱

۴۶ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۳۳

۴۷ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۱۰،۱۲

۴۸ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۷۳

۴۹ انفاس العارفین مع الجزاء اللطیف اردو ترجمہ ص ۴۰۵،۴۰۶ والرجم ص ۱۱

۵۰ الفرقان ''شاہ ولی اللہ نمبر'' ص ۱۷۱

۵۱ تحریک جامعہ محمدی ص ۱۶

۵۲ History of British India. Vol.I, P.496

۵۳ History of British India. Vol.3, P.324-26

۵۴ P.283-84

۵۵ تحریک جامعہ محمدی ص ۱۸

۵۶ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۸۲

۵۷ بینات ص ۶۱۳

۵۸ بینات ''مولانا بنوری نمبر'' ۱۳۹۸ھ ص ۶۱۳

۵۹ الرشید (صفر۔ربیع الاول ۱۳۹۶ھ) ص ۲۴۳

۶۰ ایضاً ص ۲۴۴

۶۱ مولانا انور شاہ کے علوم و معارف ص ۳۱

۶۲ حیات انور ج ۱ ص ۱۶۶

۶۳ حیات انور ج ۲ ص ۱۵۷

۶۴ شاہ ولی اللہ اوران کا خاندان۔ص ۸۲

۶۵ رودکوثر ص ۵۳۵

۶۶ ایضاً

۶۷ شاہ ولی اللہ اوران کا خاندان ص ۸۱

۶۸ التفہیمات الالٰہیہ ج ۱ ص ۲۳۷، ۹

۶۹ التفہیمات الالٰہیہ ج ۱ ص ۸۳

۷۰ ایضاً ص ۹۴

۷۱ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص ۱۶۵

۷۲ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۶۷

۷۳ تاریخ مسلمانان عالم ص ۸۳۴

۷۴ History of the Urdu Literature, P.261,263

۷۵ آب حیات ص ۲۵۱

۷۶ Translation of Indian Affairs. P.191

۷۷ Economic History of American People. P.391

۷۸ History of British India. (1805-35), Vol.I, P.378

۷۹ منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۳

۸۰ Selections from Educational Records. Vol.I, (1781-1839), P.709

۸۱ The Indian Musalmans.P.193

۸۲ The Indian Musalmans.P.178

۸۳ The Indian Musalmans.P.176,178

۸۴ Ramble & Recollections. Vol.2, P.53

۸۵ Rise & Fullfilment of British Rule in India. P.319

۸۶ The Indian Musalmans.P.136

۸۷ The Muhammadan Controversy & the Indian Article. P.41,42

۸۸ Eighteen Fifty Seven. P.10,12

۸۹ The Indian War of Independence. P.51,52

۹۰ رسالہ اسباب بغاوت ہند ص ۱۳

۹۱ Men & Events of My Time in India. P.502

۹۲ رسالہ اسباب بغاوتِ ہند ص ۳۴

۹۳ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ص ۲۹۷

۹۴ تاریخ مسلمانان عالم ص ۸۳۸

۹۵ Ambridgement of the History of India.P.510-11

۹۶ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۹۶

۹۷ My Indian Mutiny Diary.P.161

۹۸ My Indian Mutiny Diary.P.161

۹۹ Life of Lord Lawrence. P.146

۱۰۰ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۱۶

۱۰۱ The Indian Musalmans.P.143-44

۱۰۲ علمائے مظاہر علوم سہارنپور ج ۱ ص ۴۰

۱۰۳ تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۱۴۷

۱۰۴ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۸۲

۱۰۵ مقدمہ مفتاح کنوز السنہ ص ''ق''

۱۰۶ مولانا سندھی کے سیاسی افکار ص ۳۵۸

۱۰۷ الرشید ساہیوال ''دار العلوم دیوبند نمبر'' ص ۳۳۰

۱۰۸ تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۱ ص ۱۵۵

۱۰۹ الرشید ساہیوال ص ۴۹۰

۱۱۰ موج کوثر ص ۲۰۳

۱۱۱ موج کوثر ص ۲۰۳

۱۱۲ ایضاً

۱۱۳ الانوار ص ۱۶۷

۱۱۴ تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۶۴

۱۱۵ تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۳۲

۱۱۶ ایضاً

۱۱۷ ماخوذ از تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۵۰ تا ۸۶

۱۱۸ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۳

۱۱۹ دارالعلوم کا قضیہ ص ۱۹

۱۲۰ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۸

۱۲۱ دارالعلوم کا قضیہ ص ۳۔۱۶

۱۲۲ موج کوثر ص ۲۰۹

۱۲۳ تحریک جامعہ محمدی ص ۵۲

۱۲۴ موج کوثر ص ۲۱۰

۱۲۵ موج کوثر ص ۲۱۱

۱۲۶ موج کوثر ص ۲۱۱

۱۲۷ ایضاً ص ۲۰۹

۱۲۸ الانوار ص ۵۵۵

۱۲۹ الرشید ساہیوال ''دارالعلوم دیوبند نمبر'' ص ۲۳۰

۱۳۰ الانوار ص ۵۹۶

باب: ۲

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا تعارف

مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے قبل برصغیر کے حالات و واقعات

آپ کی پیدائش سے ۱۳۵ سال قبل ۱۷۴۰ء (۱) سے برصغیر کی ملت اسلامیہ کے زوال و انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسلامی معاشرے کی عظیم الشان عمارت مختلف رخنوں کے باعث آہستہ آہستہ گرتی رہی۔ پہلے اخلاقی اور معاشرتی برائیوں نے جنم لیا۔ عیش پرستی و تن آسانی کی رغبت عام ہوئی پھر تفرقہ بازی، منافرت اور منافقت کی باد سموم نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پورا معاشرہ خلفشار و انتشار کا شکار ہو گیا۔ آپ سے قبل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دور رس نگاہ نے آنے والے خطرات کو بھانپ کر ملت کے ذمہ دار اور اسلامی ہند کے با اثر طبقوں کو خبر دار کر دیا تھا مگر ان کی کوتاہ اندیشی سے ملت کی ڈگمگاتی کشتی بھنور سے نہ نکل سکی۔ سکھوں نے ملتان، کشمیر اور پشاور کے علاقے مسلمانوں سے چھین لیے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے اس یورش کو روکنے کی کوشش کی اور جہاد میں شہید ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعد دیگرے مسلمانوں کے علاقوں پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ اس طرح صدیوں تک حکمران رہنے والی قوم غلامی کے گڑھے کے کنارے پر جا کھڑی ہوئی، ہمدردان ملت کو اس کا شدت سے احساس ہوا۔ سنبھلنے کی ایک پرعزم کوشش کی اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن بکھری ہوئی طاقت مجتمع نہ ہو سکی اور یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتائج مسلمان قوم کے لیے بڑے مہلک اور خطرناک ثابت ہوئے۔ ایک طرف مسلمان اپنی سیاسی سیادت ختم کر چکے تھے، جبکہ دوسری طرف انگریزوں نے مسلمانوں کو ہر اعتبار سے کچلنے کا عزم کر لیا۔ ہندو نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ موم کی ناک ثابت ہوا۔ وہ پہلے بھی غلام رہ چکا تھا اور اسے نئی غلامی کو قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی۔ اس نے انگریز کے ساتھ بھرپور تعاون کیا، فائدے اور منافع حاصل کیے۔ انھیں بڑے عہدے اور منصب مل گئے لیکن ایک بہادر اور تنومند

مسلمان کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، حکومت نے تمام عہدوں اور منصبوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے۔ برطانوی حکمرانوں نے جو نیا نظامِ تعلیم نافذ کیا، اس میں مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کر دیا۔ مسلمانوں کے اوقاف کی آمدنی غلط مصارف پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس طرح برصغیر کی حکمران قوم اپنے ہی ملک میں سیاسی، اقتصادی، تمدنی، معاشرتی، مذہبی اور علمی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی، عزت والے ذلت و رسوائی کی انتہائی پستیوں میں جا پہنچے۔

انگریز نے نیا نظامِ تعلیم رائج کر کے مسلمانوں کی قدیم سرکاری زبان کو یک قلم موقوف کر دیا۔ ان کے علوم کو از کار رفتہ قرار دے دیا۔ اب عظیم درس گاہوں میں صرف مساجد کے ائمہ پیدا ہونے لگے۔ عربی زبان اور علوم اسلامیہ کے مدارس ویران ہو گئے۔ انگریزی اسکولوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے سے مسلمان کوئی قابل عزت مقام حاصل نہ کر سکے۔ وہ انگریز کی نظر میں مشکوک اور ہندو کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ چنانچہ تمام عہدے صرف ہنود کے لیے مختص ہو کر رہ گئے۔ (۲)

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف یورپ سے عیسائی پادریوں کا جو سیلاب امنڈ آیا تھا وہ ہر جگہ ملتِ اسلامیہ کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ ان پادریوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات پر اعتراضات کیئے، بانیٔ اسلامؐ کے اخلاق و عادات پر قسم قسم کی نکتہ چینیاں شروع کر دیں۔ (۳) اس موقع پر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولوی احسنؒ، ڈاکٹر وزیر خانؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پادریوں کے ساتھ مقابلہ کی پوری کوشش کی، ان کے ساتھ مناظرے کیئے اور ان کے جوابات میں کتابیں لکھیں۔

دوسرا خطرہ سیاست سے متعلق تھا۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا حریف خیال کرتے تھے، وہ ان کے دین کو سرکشی، بغاوت اور فساد پر اکسانے والا دین خیال کرتے تھے (۴) تیسرا خطرہ اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا کیونکہ یہ تعلیم پادریوں کے طریقۂ وعظ و تبلیغ سے زیادہ خطرناک تھی۔ یہی تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ اور انھیں اپنے ماضی سے متنفر کرنے کا باعث بنی تھی۔ (۵)

الغرض یہ وہ حالات تھے جن سے ملتِ اسلامیہ دوچار تھی اور یہ وہ خطرات تھے جن میں اسلام گھرا ہوا تھا۔ ایسے موقع پر ایک طرف تو علماء کی کوشش کام آئی جنھوں نے ہر حالت میں اسلامی علوم اور عربی زبان کی حفاظت و ترویج کو اپنا مشغلہ بنایا اور دوسری طرف سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کی سرگرمیوں نے ایک تحریک کی شکل میں قوم مسلم کو بیدار کیا۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ بھی ان علمائے دین میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، جنھوں نے اس یاس و نا امیدی کے دور میں ملت اسلامیہ کو سہارا دیا۔ آپ نے جب ہوش سنبھالا تو برصغیر پر برطانوی راج قائم ہو چکا تھا۔ اور خود کشمیر پر خاندان ڈوگرہ کی حکومت اپنا تسلط جمائے بیٹھی تھی۔ جنگِ عظیم دوم کے خطرناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اپنے محسن و مربی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کو انگریزوں کے ہاتھوں جزیرہ مالٹا جیسے دشوار گزار علاقے میں قید ہوتے دیکھا۔ ان حالات نے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کو متأثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تعلیمات نے ملت اسلامیہ خصوصاً مسلمانان ہند پر گہرا اثر ڈالا۔ اس دور میں آپ کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ آپ نے اپنے انقلابی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فعال عناصر پر مشتمل ایک جماعت کی تربیت کی جنہوں نے مذہب، سیاست، اقتصادیات اور تہذیب و تمدن کے ہر میدان میں مسلمانان ہند کی رہنمائی کی۔

کشمیر کی اہمیت

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی و کشش، جاذبیت و دلکشی، شادابی و سرسبزی میں عالمی شہرت رکھتا ہے۔ جس کی حسن پرور فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوشگواری، مناظر کا حسن، قدیم زمانے سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا ہے۔ بادشاہوں نے یہاں بارِعیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیاء اس کے جمال دلفروز میں پاگرفتہ ہوئے، کشمیر جنت نظیر، خُلدِ جاں، روح پرور، وسیع چراگاہوں، گھنے جنگلوں اور گل ریز مرغزاروں کا حامل ایک ملک ہے۔ یہ زعفران زاروں، پھلدار درختوں،

سفیداروں، بیدوں اور چناروں کا وطن ہے۔ یہ جھیلوں، آبشاروں، ندی نالوں اور چشموں اور کوہساروں کی جگہ ہے۔ یہ صحت بخش آب وہوا، مختلف موسموں کے لحاظ سے بہاروں کی سرزمین ہے۔

یہ عابدوں، پرہیزگاروں اور دینداروں کی دنیا ہے۔ اس میں مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ بستے ہیں جو نازک اندام مگر مردانہ جذبات رکھتے ہیں اور نجیب و چرب دست وتر دماغ ہیں۔

یہ وہی کشمیر ہے جس نے حضرت سید علی ہمدانیؒ، میر سید کرمانیؒ اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مورثِ اعلیٰ شیخ مسعود نروریؒ کے قدم روک لیے۔ یہ وہی کشمیر ہے جس کے لالہ زاروں سے ڈاکٹر محمد اقبالؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے علاوہ علم وفن کے اور بہت سے ماہرین پیدا ہوئے۔

مولانا انور شاہؒ کے اسلاف کا وطن

آپ نے اپنی متعدد تالیفات میں اپنے بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”وفی “المکتوبات الخطیه“ عند خلف الشیخ (مسعود) ان سلفه جاؤا من ” بغداد “ الی الهند ودخلوا ملتان “ ثم ارتحلوا الی بلده ” لاهور“ ثم الی ” الکشمیر“۔(۲)

حضرت شیخ مسعودؒ کے اخلاف کے پاس قدیم قلمی تحریرات میں درج ہے کہ موصوف کے اسلاف بغداد سے ہندوستان آئے اور ملتان میں وارد ہوئے پھر وہاں سے لاہور میں آبسے اور بعد ازاں کشمیر کی طرف منتقل ہوئے۔

کشمیر کی تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا انور شاہؒ کے مورثِ اعلیٰ شیخ مسعودؒ ۹۵۰ھ یا اس سے بھی کچھ مدت قبل سری نگر میں آئے تھے اور گذشتہ پانچ سو سال کی مدت میں آپ کے خاندان نے کشمیر کے مختلف مقامات میں توطن کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ شیخ مسعودؒ ۹۵۰ھ میں ایک باوجاہت تاجر تھے جو ۹۶۰ھ میں تارک الدنیا،

زاہد و عابد اور ۹۷۰ھ میں ایک شیخ وقت ہونے کے لحاظ سے سلسلہ سہروردیہ کے عظیم الشان پیران طریقت سید احمد کرمانیؒ اور سید محمد مسافرؒ کی خلافت کا تاج سر پر پہنے ہوئے تھے۔

۹۸۰ھ سے ۹۹۰ھ تک آپ دیگر مشائخ وقت حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہؒ، علامہ محمد یعقوب صوفیؒ، مخدوم احمد قادریؒ اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے دوش بدوش چک خاندان کے ان ظالم و جابر بادشاہوں کے خلاف مصروف عمل نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے ظلم وتشدد سے کشمیری عوام کی زندگی اجیرن بنادی تھی۔(۷)

۹۷۶ھ میں شاہ کرمان نے شیخ مسعود نروریؒ کو ایک خاص تحریر خلافت کے ساتھ کچھ تبرکات عطا کئے اور دستاویز خلافت میں لکھا:

''یہ تبرکات میرے بزرگوں سے حاصل ہوئے ہیں اور اب میں انھیں شیخ مسعود نروریؒ کے سپرد کرتا ہوں''۔(۸)

مختصر یہ کہ بارہویں صدی ہجری کے دوران اولاد شیخ مسعودؒ کی وہ شاخ جس کا تعلق مولانا انور شاہ صاحبؒ سے ہے، وادیٔ کشمیر کے شمالی حصہ یعنی علاقہ کامراج اور خاص کر'' لولاب''میں اپنا ٹھکانہ بنالیتی ہے۔(۹)

وادیٔ لولاب

دلسر وادیٔ کشمیر کی سب سے بڑی تقریباً ۱۶ کلومیٹر لمبی جھیل ہے۔ دریائے جہلم اس جھیل میں سے ہوکر گزرتا ہے۔ یہاں سے آگے کشمیر کی مشہور وادیٔ لولاب ہے۔ اس وادی کا مشہور مقام کپواڑہ، سوپور سے ۴۰ کلومیٹر پر ہے۔(۱۰)

علامہ اقبالؒ اور وادیٔ لولاب: حکیم مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے ایک طویل نظم ''ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض''، لکھی ہے۔ جس میں وادیٔ لولاب کے حسین قدرتی مناظر کی تعریف بھی کی گئی ہے اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ صاحب کی طرف تلمیحات اور اشارات بھی پائے جاتے ہیں:

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیٔ لولاب!
اگر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دین بندۂ حوض کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیٔ لولاب!
ہیں ساز پہ موقوف نواہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہیں مضراب
اے وادیٔ لولاب!
مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سُود ہے مے خانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیٔ لولاب!
بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب!(۱۱)

حضرت بابا مسعود نروریؒ کے سب سے بڑے فرزند بابا عبداللہؒ کے ایک پوتے بابا عارف ابن بابا علی بن بابا عبداللہ کی اولاد اس وادی میں تبلیغ دین کے لیے آئی اور پھر یہیں کی ہو رہی۔ اب نئے دور میں اسی وادی کے ایک موضع ''ورنو'' کو مولانا انور شاہ صاحبؒ کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے شہرت عامہ حاصل ہوگئی ہے۔(۱۲)

۱۲۳۴ھ میں جب ریاست جموں و کشمیر پر رنجیت سنگھی حکومت کا مذہبی تعصب نا قابل برداشت ہوگیا تو مولانا انور شاہؒ کے جد امجد شاہ عبدالکبیرؒ وادیٔ لولاب کو خیر باد کہہ کر وادیٔ نیلم میں جا بستے ہیں۔(۱۳)

تیرہویں صدی ہجری کے آخری اور چودھویں صدی ہجری کے ابتدائی زمانہ میں مولانا معظم شاہؒ مولانا انور شاہؒ کے والد ماجد اپنے سسرال والوں کے اصرار سے واپس وادیٔ لولاب میں آجاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک موضع دودھواں میں ٹھہرتے ہیں اور بعد ازاں وادیٔ

لولاب کے موضع ''ورنو'' میں قیام کرتے ہیں۔(۱۴) اس موضع میں علامہ کشمیریؒ کے والد کا ایک مکان ہے۔(۱۵) موضع ورنو میں مولانا معظم شاہؒ کی قیام گاہ ہے۔آپ کی مسجد اور مزار کے سامنے سے ایک ندی گزرتی ہے، اس کے ایک طرف لہلہاتے کھیت ہیں اور دوسری طرف پہاڑ کی ڈھلوان پر دیودار اور چیل کا دلکش جنگل ہے، بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جو اب حضرت معظم شاہؒ اور ان کے فوت شدہ فرزندوں کی آخری آرام گاہ ہے۔(۱۶)

محل وقوع: پاکستان کے شمال میں چوراسی ہزار (۸۴۰۰۰) مربع میل پر جہاں یہ وادی موجود ہے وہیں پاکستان، مشرقی پنجاب (بھارت) اور چینی ترکستان کی سرحدیں اس کے حسن کو چھونے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ وادی تیرہ ضلعوں میں بٹی ہوئی ہے۔(۱۷)

آبادی: وادیٔ کشمیر کی چالیس (۴۰) لاکھ آبادی میں سے بتیس (۳۲) لاکھ آبادی مسلمان ہے، صوبہ کشمیر میں ۹۵ فیصد مسلمان آباد تھے اور صوبہ جموں میں ۶۷ فیصد۔

زیارت گاہیں: یوں تو پوری وادی صناعی قدرت کا ایک دلآویز اور دست خالق کا تیار کردہ حسین گلدستہ ہے لیکن پھر بھی قدرتی مناظر میں گلمرگ، پہلگام، چشمہ، شاہی، جھیل، ڈل دریا، خاص سری نگر میں شالیمار، نسیم باغ اور بہت سے مناظر سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

مقدس مقامات: مقدس مقامات میں خانقاہ معلیٰ، خانقاہ شاہ ہمدان، مقبرہ سلطان زین العابدین مسجد مدن، خانقاہ بابا مسعود نروریؒ (صاحب سوانح کے مورثِ اعلیٰ) مقبرہ حضرت بُڈشاہ حضرت بل اور زیارت مخدوم شاہ ہیں۔(۱۸)

مشہور شہر: سری نگر، اسلام آباد، قاضی کنڈ، بارہ مولا، ہندواڑہ، لپواڑہ، سوپور ہیں۔ کشمیر کا حسین ترین حصہ وادیٔ لولاب ہے۔ جس کے سبز پوش سلسلہ کوہسار پر اودے اودے بادل اکثر موجود رہتے ہیں اور اس کی زمین پر بہتے ہوئے دریا اور رواں دواں چشمے ہیں۔(۱۹)

کشمیر آئینہ تاریخ میں: ۱۳۳۰ء میں کشمیر پر مسلم سلاطین کشمیر کی حکومت کا آغاز ہوا۔ کشمیر کا راجہ شہزادہ رینچن شاہ جو بدھ مت کا پیرو تھا ۷۲۵ھ میں سید شریف الدین عبدالرحمان بلبل شاہؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور صدرالدین کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ پھر سلطان جمشیدؒ، سلطان علاءالدینؒ اور پھر سلطان شہاب الدینؒ جو زبردست فاتح گزرے ہیں، انھوں نے

حکومت کی۔اس کے بعد سلطان قطب الدینؒ، سلطان حیدرؒ، سلطان حسن شاہؒ، سلطان محمد شاہؒ، فتح شاہؒ، سلطان ابراہیمؒ، سلطان محمد شاہ بار پنجمؒ، سلطان شمس الدینؒ، سلطان اسماعیلؒ، سلطان ابراہیم ثانیؒ، سلطان نازک شاہؒ، اسماعیل ثانیؒ اور حبیب شاہؒ نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ یہ دور حکومت ۲۳۵ یا ۲۴۰ سال تک رہا۔ جو شاہ میری دور حکومت کہلاتا ہے۔ اس کے بعد خاندان چک کی حکومت شروع ہوئی، یہ بھی کشمیری مسلمان ہی تھے، ان میں غازی شاہ، حسین شاہ، علی شاہ، یوسف شاہ، سید مبارک خان بیہقی، لوہر شاہ یوسف، شاہ بار دوم اور یعقوب شاہ نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ ان کا دور حکومت ۳۳ سالہ تھا۔ اس کے بعد ۱۵۸۶ء سے مغل خاندان ہند کی حکومت شروع ہوئی جو تقریباً دوسو (۲۰۰) سال کشمیر پر رہی۔ ۱۷۵۲ء سے ۶۰، ۷۰ سال تک کشمیر پر پٹھانوں کی حکومت رہی۔ ۱۸۱۹ء سے ۲۷، ۲۸ برس تک سکھوں نے کشمیر پر حکومت کی۔ ۱۸۴۶ء سے ڈوگرہ خاندان کی حکومت رہی جو ایک سو برس یعنی ۱۹۴۷ء تک رہی۔(۲۰)

کشمیر کا غلط الحاق: ۱۹۴۷ء میں جب متحدہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو کشمیریوں نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف مسلح جنگ آزادی شروع کر دی، مہاراجہ نے عوام کی مرضی کے خلاف ریاست جموں و کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دیا۔(۲۱)

آزاد کشمیر: جموں و کشمیر کے غلط الحاق کی وجہ سے مسلح جنگ آزادی شروع ہوئی، مجاہدین نے ۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو "آزاد کشمیر" حکومت قائم کر لی اور خواجہ غلام نبی گلکار انور اس کے پہلے بانی صدر تھے۔(۲۲) آج خطہ جموں و کشمیر دو نہیں بلکہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جہاں بھارتی درندے تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ دوسرا حصہ آزاد کشمیر ہے جو پاکستان کے زیر اثر ہے اور تیسرا حصہ گلگت ہے جس پر براہ راست پاکستان کا عمل دخل ہے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اسے پاکستان کی شہ رگ قرار دیا ہے۔ اس علاقے کی مسلم آبادی نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک لگاتار آزادی کے لیے جدوجہد کی اور بیش بہا جانی و مالی قربانیاں پیش کی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سلامتی کونسل کا فیصلہ: خود بھارت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پیش کر دیا۔ سلامتی کونسل نے بڑی بحثوں کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ کشمیر کے مستقبل کے متعلق ریاست

کے لوگوں کی رائے معلوم کی جائے۔ پاکستان اور بھارت دونوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرلیا مگر ۶۰ سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک سلامتی کونسل بھارت سے اپنے فیصلوں پر عمل نہ کرا سکی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ: بھارت کے جابرانہ تسلط اور سلامتی کونسل کی بے حسی پر ۷، ۸ اگست ۱۹۶۵ء کو مجاہدین آزادی کشمیر نے ریاست میں گوریلا جنگ شروع کردی۔ بھارت نے حد متارکہ عبور کر کے آزاد کشمیر کے علاقے پر حملہ کردیا۔ آزاد کشمیر کی فوجوں نے بھارت کا حملہ پسپا کردیا۔ اس ناکامی کے بعد بھارت نے بغیر اعلان جنگ کئے، پاکستان پر کئی محاذوں سے زبردست حملہ کردیا۔ سترہ دن تک پاکستان اور بھارت میں زبردست جنگ رہی۔ پاکستان نے پیش قدمی کر کے بھارت کے سولہ سو مربع میل علاقے پر قبضہ کرلیا۔

سلامتی کونسل نے ۲۳/ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بند کرادی اور یہ طے پایا کہ کشمیر میں آزادانہ رائے شماری کا جائزہ لیا جائے گا۔ مگر مجاہدین نے اعلان کردیا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لیے اپنا جہاد جاری رکھیں گے خواہ اس کے لیے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں۔

بھارت نے رائے شماری کا پرزور مطالبہ کرنے والے کشمیری لیڈروں مولانا محمد سعید مسعودی، غلام محی الدین قرہ، خواجہ محمد اسحاق، مولانا محمد فاروق اور دیگر تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا۔ غیر ملکی اخبارات کے مطابق کشمیر کی جنگ آزادی طالب علموں اور طالبات کے ذریعے چل رہی ہے۔ (۲۳)

خانوادۂ انوری کے ایک عظیم مجاہد

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے ایک عظیم مجاہد مولانا محمد سعید مسعودیؒ ہیں اور علم و فضل میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ ایک وسیع النظر محقق اور مفکر ہیں۔ سیاسی میدان کے آزمودہ کار اور بے لوث رہنما ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ خاندان انوری کے ایک مایۂ ناز عالم اور بزرگ ہیں۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے لیے صاحب البیت ہیں۔ (۲۴)

مولانا مسعودیؒ نے اپنی زندگی کو تحریک حریت کشمیر کے لیے وقف کردیا ہے جس کی

پاداش میں آپ کو بار بار قید و بند اور طوق وسلاسل سے کھیلنا پڑا۔ ریاست جموں و کشمیر میں آزادانہ رائے شماری کرانے کے پرزور مطالبہ کرنے والے کشمیری رہنماؤں میں آپ بھی شامل ہیں۔

مولانا معظم شاہؒ

آپ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے والد ہیں۔ ضلع مظفر آباد، تحصیل کرناؤ میں ولادت ہوئی۔ ان کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

"الراشد المسترشد العابد الزاهد ملجا القوم فی النوائب و ملاذ هم فی المهمات الد ینیه و الد نیو یه "(۲۵)

مولانا نظر شاہ مسعودیؒ لکھتے ہیں :

"آپ سہروردیہ سلسلہ میں مجازِ طریقت تھے۔(۲۶)

عبدالرحمان کوندوؒ لکھتے ہیں:

معظم شاہؒ فارسی زبان کے قادرالکلام شاعر، مناظرت فطرت کے رمز شناس اور دلدادہ تھے۔(۲۷)

مولانا معظم شاہؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد سال یا دو سال تک بقید حیات رہے اور ۱۲۵ سال کی عمر میں ورنو "وادیٔ لولاب"، ضلع بارہ مولا میں ۱۳۵۶ھ کو وفات پائی۔ آپ نے دو شادیاں کی تھیں جن سے اولادیں ہوئیں۔ پہلی اہلیہ سے اولاد ذکور کی تعداد پانچ ہے جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:

۱) مولانا محمد یاسین شاہؒ
۲) مولانا محمد انور شاہؒ (صاحب سوانح)
۳) مولانا عبداللہ شاہؒ
۴) صاحبزادہ سلیمان شاہؒ
۵) نظام الدین شاہؒ

دوسری اہلیہ سے ایک ہی لڑکا ہوا جن کا نام محمد شاہؒ ہے۔(۲۸)

خاندان

حسب نسب : مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے سوانح نگاروں میں آپ کے حسب نسب اور خاندان کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض آپ کا سلسلہ نسب خاندان نعمانی (امام ابوحنیفہؒ) سے ملاتے ہیں اور بعض آپ کا خاندانی سلسلہ سادات سے ملحق کرتے ہیں۔ ان میں آپ کے فرزند مولانا انظر شاہ مسعودی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا انور شاہ صاحبؒ کے حالات زندگی پر "نقش دوام" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس میں مؤلف نے بڑی دلچسپی کے ساتھ حسب نسب کی بحث کو چھیڑا ہے جو تقریباً آٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا خاندان سادات سے متعلق ہے۔ ہم نے اپنی تحقیق کے مطابق جو تاریخی شواہد حاصل کئے ہیں وہ پیش کرتے ہیں :

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی بعض تصانیف کے آخر میں اپنے آباؤ واجداد کا شجرۂ نسب شیخ نوریؒ تک اس طرح تحریر کیا ہے:

"محمد انور شاہ ابن محمد معظم شاہ ابن الشاہ عبدالکبیر ابن شاہ عبدالخالق ابن الشاہ محمد اکبر ابن الشاہ حیدر ابن الشاہ محمد عارف ابن الشاہ علی ابن الشیخ عبداللہ ابن الشیخ مسعود النروری الکشمیری ۔" (۲۹)

آپ کے بعض شاگردوں نے جو آپ کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ انہوں نے بھی شجرہ نسب یہاں تک لکھا ہے۔

منشی محمد الدین فوقؒ نے مولانا انور شاہؒ کے بھائی سلیمان شاہؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان (سلیمان شاہ) کے والد نے ایک شجرۂ نسب مرتب کیا تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ کا تصحیح شدہ ہے۔ اس شجرہ کے مطابق آپ کا سلسلۂ نسب سلاطین فارسی سے ملتا ہے۔ (۳۰)

مولانا احمد رضا بجنوری جو مولانا انور شاہ کے داماد ہیں آپ کے حسب نسب کے بارے میں لکھتے ہیں :

''حضرت کا سلسلہ نسب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان سے ملحق ہو جاتا ہے۔(۳۱)

جب مولانا بجنوری دسمبر ۱۹۸۱ء میں لاہور آئے تو راقم الحروف نے مولانا انور شاہ کے حسب نسب کے بارے میں دریافت کیا تو جواب تھا'' آپ سید نہیں ہیں۔'' (۳۲)

حضرت شیخ نوریؒ کو تذکرہ الاولیاء کشمیر کے تمام مصنفین نے ان اولیاء کرام اور مشائخ میں سے شمار کیا ہے جو نسباً سید نہ تھے۔(۳۳)

بابا داؤد مشکوٰتی نے شیخ مسعود نوریؒ، بابا عبداللہؒ، بابا حاجیؒ اور بابا مجنونؒ کا تذکرہ مشائخ اور علماء کے اُس باب میں لکھا ہے جو سادات میں نہ تھے۔(۳۴)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تردید

ایک بار کسی اخبار نویس نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ سید لکھا تو آپ نے اس کی تردید ان الفاظ میں کی:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل واولاد کا غلام ہوں اور محب عترت ہوں مگر سید نہیں ہوں۔'' (۳۵)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ہم عصر مشہور مؤرخ منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں:

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنا شجرہ نسب لکھا ہے اور کسی بزرگ کے نام کے ساتھ ''سید'' کا لفظ نہیں لکھا۔

البتہ لاہور کی جو شاخ آپ کو سید لکھتی ہے اس نے شیخ مسعود نوری کے فرزند شیخ عبداللہ کو سید عبداللہ لکھا ہے۔(۳۶)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے والد محمد معظم شاہ محمد الدین فوق کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ شیخ مسعودؒ کی ذریت جہاں کہیں بھی ہے وہ سید نہیں ہے اور اکثر وجوہ یہی ہیں کہ شیخ مسعودؒ امام العالم ابوحنیفہؒ کی اولاد سے ہیں۔(۳۷)

مولانا محمد امینؒ بانی مدرسہ امینہ دہلی لکھتے ہیں کہ بڑی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا انور شاہ صاحبؒ امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے ہیں۔(۳۸)

مولانا حفیظ الرحمان واسف لکھتے ہیں کہ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام اعظمؒ سے ملتا ہے۔(۳۹)

مولانا انظر شاہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر ننھیال سادات سے ہوتو اس کی جانب انتساب کرتے ہوئے خود کو''سید'' کہنا اور لکھنا جائز ہے۔

اس بارے میں مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ بھی ملاحظہ کیجیے۔مسئلہ سیادت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''سیادت کا مدار حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ہے پس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو اولاد حضرت فاطمہؓ سے ہے وہ تو سید ہے اور جو دوسری بی بی سے ہے وہ سید نہیں ہے۔اسی طرح ایک شخص کا باپ سید نہ ہو اور ماں سید ہو تو قواعد کے مطابق وہ سید نہیں۔اگرچہ ماں کی سیادت کی وجہ سے ایک گونہ شرف اس کو حاصل ہے۔''(۴۰)

عبدالرحمان کوندوؒ لکھتے ہیں کہ:

''خود شاہ صاحبؒ کے والد ماجد مولانا معظم شاہ صاحبؒ کے پاس بھی اپنے قدیمی کاغذات میں حضرت مسعودؒ سے حضرت امام اعظمؒ تک ایک شجرہ نسب تھا جس کو موصوف نے کسی تفریح طبع کے طور پر فارسی زبان میں نظم میں ڈھالا تھا۔ اس شجرے سے ملتا جلتا ایک شجرہ نزورہ میں زیارت ''علم صاحب'' کے سجادہ نشین بھی پیش کرتے ہیں۔اس شجرے کی موجودگی سے علی الاقل (کم از کم) یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے بعض اہل علم ایسے چلے آرہے ہیں جو شیخ مسعود نزوریؒ کے متعلق اس بات کے قائل تھے کہ آپ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔''(۴۱)

یہ دو شجرے ہیں جو کشمیر کے خانوادہ انوری میں موجود ہیں اور قدرے اشتراک کے ساتھ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ لکھتے ہیں کہ :

''میمون شاہ، قاسم شاہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تو ان کا نام موصوف نے اپنے نام پر قاسم شاہ رکھا۔'' (۴۴)

لیکن عبدالرحمان کوندوؒ کہتے ہیں کہ:

''حضرت مسعودؒ کے والد کا نام جنید تھا اور ان کے والد کا نام قاسم تھا جن کو تجارتی اور کاروباری حلقوں میں قاسم میمون کے نام سے پکارا جاتا تھا۔'' (۴۵)

امام صاحبؒ کے مشہور فرزند حماد تھے، ان کے دو بیٹے تھے۔

۱) اسماعیل

۲) ابوحیان

حضرت مسعود نروریؒ کا نسب نامہ ابوحیان سے متصل ہوتا ہے۔ دوسری روایت یوں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے دادا کا نام بھی نعمان تھا۔ اس نعمان کے دو فرزند تھے ایک ثابت بن نعمان زوطی۔ یہ امام صاحبؒ کے والد ہیں۔ اور دوسرے حارث بن نعمان زوطی۔ یہ امام صاحب کے چچا ہیں۔ شیخ مسعود نروریؒ کے آباؤ اجداد امام صاحب کے چچا کی اولاد سے ہیں۔ (۴۶)

زوطی کون تھے؟

جس زمانے میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ جاری تھی اسی زمانے میں ہندوستان کے جاٹ اپنا آبائی مذہب اور وطن چھوڑ کر اسلام اختیار کرنے کے لیے عراق میں جا کر آباد ہونے لگے تھے۔ ان نومسلم جاٹوں کو عرب لوگ ''قوم زط'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ (۴۷)

۱۴ھ کے زمانہ میں محاصرۂ تستر کے موقع پر جاٹوں کے سردار نے اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت ابوموسی اشعریؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر ہماری چند شرائط مان لیں تو ہم مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ پھر عراق میں جا کر آباد ہوئے۔ مسلمانوں نے ان نو مسلم بھائیوں کی بڑی عزت کی اور ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے علماء اور صلحاء پیدا ہوئے۔ اس زط قوم کا تذکرہ بار بار تاریخوں میں آتا ہے۔ حضرت

امام اعظمؒ اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔(۴۸) اس طرح مولانا انور شاہ کشمیریؒ جونسباً امام اعظمؒ سے تعلق رکھتے ہیں، سندھی الاصل ہیں اور سندھ کی اسی جٹ (زط) قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔نسب کے لحاظ سے مولانا انور شاہؒ کی والدہ بی بی مال دیدی بھی چند پشتیں اوپر جاکر شیخ مسعود نروری کی اولاد سے ہیں۔(۴۹)

"بابا" یا "شاہ": بابا یا شاہ کشمیر میں کسی خاص قبیلہ کا نام نہ تھا بلکہ یہ عرف علم تھا۔اعمال صالحہ اور افعال شائستہ ہونے پر "بابا" اور بعض لوگ "شاہ" بھی کہلائے جاتے تھے۔کشمیر کی تاریخوں میں اکثر مشائخ وسادات کے ساتھ بابا کا لفظ درج ہے جوان کی بزرگی پر دلالت کرتا ہے، بابا یا شاہ طبقہ میں مسلمانوں کی تقریباً تمام اقوام بٹ، سید، قریش، گنائی اور افغان وغیرہ شامل ہیں۔(۵۰) کشمیر میں یہ ضروری نہیں کہ شاہ کا لفظ صرف سید کے ساتھ ہو وہاں بابزادے اور بعض اور لوگ بھی شاہ کہلواتے ہیں جو حقیقت میں سید نہیں۔مگر ہندوستان میں شاہ کا لفظ صرف سادات کے لیے لکھا جاتا ہے۔(۵۱) بابا مسعود نروریؒ کی اولاد کشمیر کے علاوہ پنجاب اور ہندوستان میں بھی ہے۔مولانا انور شاہ کشمیری اور لاہور کے پیر عبدالغفار شاہؒ بابا موصوف کی اولاد ہی سے تھے۔(۵۲) مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ "شاہ" کے نام سے مشہور تھے۔آپ کے اکثر شاگرد اپنے خیال میں انھیں سید ہی سمجھتے رہے اور اسی بناء پر ان کے صاحبزادے مولانا ازہر شاہ اور مولانا انظر شاہ جو دیوبند ہی میں رہے ہیں اور کشمیر کے حالات ورسومات سے عموماً ناواقف ہیں اپنے آپ کو اپنی تصانیف اور اپنی تحریروں میں "سید" لکھا کرتے ہیں حالانکہ ان کے والد مولانا موصوف، ان کے جد امجد پیر محمد معظم شاہؒ اور ان کے چچاؤں نے کبھی سیادت کا دعویٰ نہیں کیا۔(۵۳)

ولادت: علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ ۲۷/شوال المکرّم ۱۲۹۲ھ/ ۱۶/ اکتوبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ بوقت سحر اپنی ننھیال موضع "دودھواں" علاقہ لولاب کشمیر میں پیدا ہوئے۔(۵۴)

باپ کا نام: آپ کے والد کا نام محمد معظم شاہؒ ہے، جن کا مختصر سا حال گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔

آپ کی والدہ کا نام بی بی مال دیدی ہے۔(۵۵) وہ بڑی زاہدہ اور عبادت گذار تھیں۔
مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

"کانت یتیمة دھرھا فی الورع و الزھد و العبادة "(۵۶)

شیخ ابوغدہؒ لکھتے ہیں:

"کانت والدته صالحة عابدة ________منشأ فی بیت علم و صلاح ، فی رعایة د قیقة، و تربیة عجیبة "(۵۷)

ترجمہ: ان کی والدہ نیک اور عبادت گزار تھیں، انہوں نے علم وعمل کے ماحول میں آنکھ کھولی، بڑے عجیب طریقے سے ان کی تربیت کی گئی۔

ابتدائی تعلیم وتربیت: علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی پرورش اور طفولیت کا ابتدائی دور ایسے والدین کی آغوش میں گزرا جن سے زہد وقناعت نیکی وولایت کے اولین سبق ملے۔ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد ماجد محمد معظم شاہؒ نے کی۔عمر کا پانچواں سال شروع ہوا تو والد سے قرآن کریم پڑھنا شروع کیا اور مختصر سی مدت میں قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم ختم کرلی۔سات سال کی عمر میں فارسی زبان کے اس زمانے میں مروج نصاب کی ابتدائی کتابیں نام حق، کریمہ اور پند نامہ شیخ عطار اور ایسے ہی چند چھوٹے بڑے رسالے اور فارسی کی صرف ونحو کے قواعد "دستور الصبیان" وغیرہ ختم کرلیے۔(۵۸) پھر آپ نے شیخ سعدی شیرازی، النظامی، اُمیر خسرو دہلوی، المعارف المحقق الجامی اور المحقق جلال الدین عوانی کی فارسی ادب کے نظم ونثر، انشاء واخلاق کی وہ کتابیں پڑھنی شروع کیں جن کا پڑھنا آپ کے شہر والوں میں معروف ومتوارث تھا۔آپ ان کتب فارسیہ اور علوم متعارفہ کے جامع بن گئے۔یہاں تک کہ آپ نے اپنے امثال واقران پر فوقیت حاصل کرلی۔(۵۹) علمی دنیا میں آپ کا یہ مقام ہوگیا کہ شہر کے علماء فضلاء آپ کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے تھے۔مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

" واشیر الیه من فضلاء بلده بالبنان " (۶۰)

اس وقت تک آپ نے اپنی عمر عزیز کی پوری بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ آپ کو فارسی نظم ونثر لکھنے پر پورا ملکہ حاصل ہوگیا تھا۔(۶۱) فارسی سے فراغت کے بعد مولانا غلام محمدؒ

رسونی پورہ سے عربی شروع کی اور دو ہی سال میں صرف ونحو اور علوم متداولہ میں فقہ، اصول اور منطق وغیرہ کی تکمیل کر لی۔ اس طرح مولانا انور شاہ کشمیری کی تعلیم کے ابتدائی مراحل نہایت تیزی کے ساتھ طے ہو گئے۔ آپ کے والد پیر محمد معظم شاہؒ بیان کرتے ہیں کہ:

''جب انور شاہؒ نے فقہ حنفی کی کتاب ''مختصر القدوری'' مجھ سے پڑھنی شروع کی تو دوران سبق بعض ایسے مسائل کے متعلق سوالات پوچھتے تھے کہ فقہ کی مبسوط کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ان کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ ہر چند میں انہیں صرف کتاب کے متن کو قابو میں لانے کی تلقین کرتا لیکن محض اپنی کتاب کی عبارت کے مفہوم تک محدود رہ کر چلنا ان کے بس کی بات نہ تھی''۔ (۶۲)

آخر ان کے والد نے ان کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا مگر دوسرے استاد کو بھی یہی پریشانی ہوئی۔ وادیٔ نیلم کے ایک گاؤں ''کبان'' میں اس زمانے کے ایک مشہور عارف نظام الدین نقشبندی مجددیؒ رہتے تھے انہوں نے مولانا انور شاہ کو دیکھا تو کہا کہ:

''انشاء اللہ! یہ اپنے وقت کے ان علماء میں سے ہوں گے جن سے دنیائے اسلام کو فیض پہنچے گا۔ اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو فروغ ملے گا''۔ (۶۳)

ایک دن مولانا انور شاہ کشمیری منطق اور نحو کے بعض ابتدائی رسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم وہاں آئے تو انہوں نے ان کتابوں کو اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ ان کتابوں پر مولانا انور شاہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی تھے، ان کی ذہانت کو دیکھ کر بولے: ''یہ بچہ تو اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالیؒ ہوگا۔'' (۶۴)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ کے حوالے سے آپ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"کنت أفتي للناس بكشمير حين بلغت من عمري اثنىٰ عشرة سنة و كنت أطالع الشروح من كتب الفقه و النحو حين تم من سني "تسع حجج"۔ (۶۵)

بارہ سال کی عمر تک اپنے گھر میں اپنے والد سے اور گھر کے قرب و جوار میں بعض

علماء سے علم حاصل کیا۔ آپ نے زبان فارسی، گلستان و بوستان اور پنج گنج نظامی اور عربی کی بنیادی صرف ونحو اور علم فقہ کی ابتدائی کتابیں ختم کر لیں۔ اس دوران آپ نے جن اساتذہ سے تحصیل علم کی ان میں سے اکثر کے نام معلوم نہیں ہیں صرف چند اساتذہ کے نام ملتے ہیں، جو کہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ آپ کے والد پیر محمد معظم شاہؒ

۲۔ مولوی عبدالجبارؒ

۳۔ مولوی غلام محمدؒ رسونی پورہ

۴۔ محمد جوجندلؒ (۶۶)

مولانا انور شاہ صاحبؒ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں تیرہ سال کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہزارہ چلے گئے۔ (۶۷) اس وقت آپ کے چار قریبی رشتے دار، آپ کے پھوپھازاد بھائی حیدر شاہ، چچازاد بھائی عبدالمجید شاہ اور دوسرے رشتہ دار پیر مختار شاہ اور عبدالاحد شاہ ضلع ہزارہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ (۶۸) ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۰۸ھ تک تین سال وہاں علماء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تحصیل کی اور منطق، فلسفہ اور علم ہیئت کا بھی مطالعہ کیا۔ (۶۹)

ہزارہ سے واپسی: ضلع ہزارہ کے مدارس سے تین سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا انور شاہؒ ۱۳۰۸ھ میں لولاب واپس آ گئے۔ آپ کی عمر سولہ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، آپ میں ذہنی اور جسمانی اعتبار سے پختگی آ چکی تھی۔ آپ سال بھر کے لیے گھر ہی میں ٹھہرے رہے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۳۰۹ھ میں وادئ لولاب میں اشتمال اراضی کا کام ہو رہا تھا۔ جا بجا اشتمال اراضی کا عملہ زمین کی پیمائش کر رہا تھا اور شجرے خسرے مرتب کئے جا رہے تھے۔ آپ کو اس علم سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی اور سال بھر تک پیمائش و مساحت ارض اور طریقہ بندوبست کے دیگر لوازمات سے دلچسپی لیتے رہے۔ (۷۰)

دارالعلوم میں داخلہ

مدارس ہزارہ سے علوم مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے بلادِ ہند کے عظیم علمی مرکز دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں داخلہ لے لیا۔ (۷۱)

اس وقت دارالعلوم کے مہتمم منشی فضل حقؒ اور صدر المدرسین شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ لکھتے ہیں :

"مولانا انور شاہ کئی دن تک دیوبند میں بھوکے رہے اور ابتداء مسجد قاضی میں رہے۔ متولی مسجد قاضی احمد حسن نے اس نوجوان کے چہرے پر فاقہ کشی کے آثار دیکھے تو کھانا کھلایا اور مولانا محمود حسنؒ کی خدمت میں لے گئے۔ (۷۲)

ان کی اس بات میں کوئی وزن نہیں کیونکہ مولانا انور شاہ صاحب کے داخلہ سے پہلے آپ کے چچازاد بھائی مولوی عبدالمجید شاہؒ ہزارہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لے چکے تھے اور انھوں نے خط لکھ کر آپ کو بھی دارالعلوم آنے کی ترغیب دی۔ ۱۳۱۰ھ میں جب آپ دیوبند پہنچے تو آپ کے بھائی نے ہی داخلہ کے سلسلہ میں آپ سے تعاون کیا۔ جب رجسٹر میں نام کا اندراج ہو رہا تھا تو انھوں نے مولانا انور شاہؒ کے نام کے ساتھ مظفر آبادی بھی لکھوا دیا تھا۔ (۷۳)

ابتدائی قیام: جس زمانے میں آپ نے دارالعلوم میں داخلہ لیا، ان دنوں مطبخ میں طلبہ کے کھانا پکانے کا انتظام بہت محدود تھا۔ دوسرے ہوسٹل میں رہائش کا مسئلہ تھا۔ ہوسٹل میں گنجائش کی کمی کی وجہ سے بعض طلبہ کو دیوبند کی مساجد کے حجروں میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس لیے شروع شروع میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کو بھی مولوی مشیت اللہ بجنوریؒ کے ساتھ ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرنا پڑا۔ (۷۴)

مولانا مشیت اللہؒ بجنور کے ایک زمیندار کے لڑکے تھے، بعد میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ابتداء میں طالب علمی کے زمانے میں کافی عرصہ تک مولانا انور شاہ کشمیری کے ساتھ مسجد کے حجرے میں اکٹھے رہے اور دونوں عمر بھر کے رفیق بن گئے۔ مولانا مشیت اللہؒ بیان کرتے ہیں :

''جن دنوں بحیثیت طالب علم شاہ صاحبؒ اور میں دیوبند کی ایک مسجد کے حجرے میں قیام پذیر تھے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ میرا یہ ہم عمر کشمیری نوجوان رات گئے تک کتب بینی میں محو رہتا اور نصف شب کے بعد نیند کا غلبہ ہوتا تو وہیں کنڈلی مار کر لیٹ جاتا، تھوڑی دیر کے بعد آنکھ جھپک کر اٹھ بیٹھتا اور وضو کر کے نوافل تہجد میں مشغول ہو جاتا۔ نوافل سے فارغ ہوتے ہی پھر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔'' (۷۵)

درسی کتب: داخلہ کے اگلے سال یعنی ۱۲۔۱۳۱۱ھ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔ حدیث کی کتابوں کے ساتھ ہی تفسیر میں جلالین اور فقہ میں ہدایہ جلد ثانی پڑھی اور اسی سال منطق میں قاضی مبارک پڑھی۔ ۱۳۱۳ھ میں آپ نے حدیث میں ابوداؤد شریف اور مسلم شریف پڑھی، تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح شرح چغمنی اور صدرا پڑھیں۔ امتحانات میں اوّل درجے کی کامیابی حاصل کی۔ ۱۳۱۴ھ میں آپ نے موطا امام مالک، نسائی اور ابن ماجہ اور فنون میں شمس بازغہ اور نفیسی کا امتحان دیا۔ (۷۶)

مولانا انور شاہؒ کے مشہور اساتذہ

دارالعلوم میں جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی ان میں سے یہ نام قابل ذکر ہیں:

۱) مولانا محمود حسنؒ
۲) خلیل احمد سہارنپوریؒ
۳) محمد اسحاق کشمیری ثم مدنیؒ
۴) غلام رسول ہزارویؒ (۷۷)
۵) حکیم محمد حسنؒ
۶) مولانا عبدالعلی (۷۸)

ابوغدہؒ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور ہدایہ اُخیرین مولانا محمود حسنؒ سے اور صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، شیخ محمد اسحاق کشمیریؒ سے پڑھیں۔ (۷۹)

معاصر طلبہ: آپ کے تقریباً چار سالہ دور طالب علمی میں جن طلبہ نے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر تعلیم پائی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱) مولانا محمد کفایت اللہؒ
۲) مولانا عبیداللہ سندھیؒ
۳) مولانا محمد ضیاء الحق دیوبندیؒ
۴) مولانا امین الدینؒ، بانی مدرسہ امینیہ
۵) مولانا ضرغام الدینؒ، بانی مدرسہ حنفیہ فیض آباد
۶) مولانا محمد صادقؒ، بانی مدرسہ اسلامیہ کراچی
۷) مولانا محمد شفیعؒ، صدر المدرسین مدرسہ عبدالرب، دہلی
۸) مولانا سید احمد مہاجر مدنیؒ، بانی مدرسۃ الشرع مدینہ منورہ۔ (۸۰)
۹) مولانا سید صدیق احمد مہاجر مدنیؒ۔

تکمیل تعلیم: دارالعلوم دیوبند میں تقریباً چار سال رہ کر مروجہ علوم میں آپ نے وہاں کے علماء سے ۱۳۱۴ھ میں سند فراغت حاصل کر لی۔

دورۂ حدیث سے فراغت کی ایک سند صدر المدرسین مولانا محمود حسنؒ نے بھی دی جس میں انھوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر کئے ہیں:

"خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہؒ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب کو جمع کر دیا ہے۔" (۸۱)

دوسری سند مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دی تھی۔

دیوبند کے بعد گنگوہ: مولانا انور شاہؒ ۱۳۱۴ھ میں دورہ حدیث مکمل کر کے دارالعلوم سے فارغ ہو گئے تو آپ گنگوہ چلے گئے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آپ کو سند حدیث دی اور اس کے علاوہ تصوف کے مشہور سلسلہ "سلسلۂ چشتیہ" میں بیعت کر کے رخصت کر دیا۔ (۸۲)

ایک دفعہ آپ نے درس کے دوران فرمایا:

"ہم یہاں آئے (کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہیؒ کے ہاں

دیکھا، اس کے بعد حضرت استاذ (مولانا محمود حسنؒ) اور حضرت رائے پوری (شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں جا کر دیکھے۔''(۸۳)

مدرسۂ عبدالرب میں تدریسی فرائض: دارالعلوم سے ۱۳۱۴ھ میں فارغ ہوئے تو آپ دہلی چلے گئے وہاں مدرسہ عبدالرب میں صرف چند مہینوں تک تدریس کا کام کیا۔ اس وقت مدرسہ کے صدرالمدرسین آپ کے ہم عصر طالب علم مولانا محمد شفیعؒ تھے۔(۸۴)

گنگوہ سے بجنور: گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے مستفید ہونے کے بعد آپ دیوبند کی طالب علمی کے وقت کے اولین رفیق اور گہرے دوست مولانا مشیت اللہؒ بجنوری کے اصرار پر کچھ عرصہ کے لیے بجنور چلے گئے۔

بجنور سے دہلی: ابھی آپ بجنور ہی میں تھے کہ آپ کے ایک اور دوست اور ہم درس مولانا محمد امین الدینؒ جو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی میں دارالعلوم کے طرز پر دینی وعربی علوم کی درس گاہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کام میں وہ آپ کو اپنا شریک کار بنانا چاہتے تھے اس لئے وہ بجنور آئے اور آپ کو دہلی لے گئے۔

مدرسہ کا افتتاح: دہلی کے بعض نیک دل، علم دوست اور عالی ہمت اہل خیر اور صاحب ثروت حضرات کے تعاون سے ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ [1] میں مولانا انور شاہ نے ایک مدرسہ کا افتتاح کیا اور اپنے رفیق مولوی امین الدین [2] دہلوی کے نام پر ''المدرسۃ الامینیۃ'' نام رکھا۔(۸۵)

مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس: مدرسہ امینیہ کا افتتاح دہلی کے چاندنی چوک بازار کی سنہری مسجد میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے شہر سے ہی چند طلبہ کو جمع کر کے تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ صدر مدرس کے عہدے پر مولانا انور شاہ کو مامور کیا گیا۔ آپ کہا کرتے تھے:

---

[1] ڈاکٹر رضوان اللہ نے اس مدرسہ کی تاسیس کا سال ۱۲۱۵ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔)

[2] ابوغدہ نے آپ کا نام محمد امین لکھا ہے، اصل نام امین الدین ہے۔)

''جب مولانا امین الدینؒ مجھے لینے کے لیے بجنور پہنچے تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو اس لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ دہلی پہنچ کر سولہ، سترہ روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالے کر دیئے۔ یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا سرمایہ تھا۔ مولانا امین الدینؒ نے اس رقم سے کاغذ خرید کر مدرسہ کے لیے رجسٹر بنائے اور طلبہ کا داخلہ شروع ہو گیا۔ طلبہ کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا، مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابلِ اطمینان ہو گئی۔''(۸۶)

۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ تک بلا تعیین تنخواہ مدرسہ میں صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور ۱۳۱۹ھ میں مبلغ بیس روپیہ باقاعدہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۸/ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک اس درس گاہ میں صدر المدرسین کے عہدہ پر رہے اور اس عرصہ کے دوران آپ نے حدیث، تفسیر، بیان، معقولات اور دیگر علوم کی بڑی بڑی کتابیں پڑھائیں۔(۸۷)

دہلی سے لولاب: ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک آپ مدرسہ امینیہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے کہ اسی اثناء میں یہ حادثہ پیش آیا کہ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں بقول انظر شاہ اپنی والدہ کی وفات پر اور بقول عبدالرحمان کوندو اپنے بڑے بھائی مولوی یاسینؒ کے انتقال پر وطن واپس جانا پڑا۔ پھر والدین نے کشمیر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی، یوں کچھ عرصہ وطن ہی میں گزرا۔ مولانا انور شاہؒ نے کشمیر میں اپنے قیام کے دوران ایک دردمند مبصر اور رہنما کی نظر سے اپنے وطن اور اہل وطن کی خستہ حالت کو دیکھا۔ اور ارادہ کر لیا کہ دیوبند کے طرز پر ایک مدرسہ قائم کر کے عوام میں تعلیم کو پھیلانا چاہیے۔ شروع شروع میں آپ نے وعظ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک آپ نے یہ مہم جاری رکھی۔(۸۸)

سفر حرمین شریفین: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۳۲۳ھ میں حج بیت اللہ کا ارادہ کر لیا تو قصبہ بارہ مولہ کے ایک رئیس خواجہ عبدالصمد ککروؒ اور ان کے چند احباب جن میں گڑھی حبیب اللہ ضلع ہزارہ کے نواب وزیر سید مردان علی شاہ بھی تھے، آپ کے ساتھ حج کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ قافلہ نو افراد پر مشتمل تھا باقی کے نام معلوم نہیں ہیں۔ رئیس آف بارہ مولہ نے

اس قافلہ کے تمام اخراجات خود ادا کئے۔ (۸۹) بحری جہاز میں گوٹھ پیر جھنڈا (سندھ) کے حضرت پیر رشد اللہ شاہؒ کی رفاقت بھی میسر آ گئی دورانِ سفر گفتگو کا خاص موضوع علمِ حدیث ہی رہا۔ مولانا انور شاہؒ کے شاگرد مولانا عبد اللہ ملتانیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے میری موجودگی میں کہا:

> ''پیر صاحب کا مطالعہ وسیع تھا لیکن چونکہ استادانہ اصول ان کے زیر نظر نہ تھے اس لیے انضباط اور باقاعدگی نظر نہ آئی۔'' (۹۰)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ آپ کے حج کی تفصیل یوں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ کو حرمین شریفین کی زیارت کا شوق ہوا اور اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی۔ آپ نے چند ماہ مکہ زادھا اللہ مجداً و کرامۃً میں قیام کیا، بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اپنی بے اختیار آہ و فغان اور اشک رواں کے تازہ پانی سے سوز دروں کی تپش کو بجھاتے تھے اور نیم شب میں خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر عاجزانہ دعا و ندا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور ملتجی رہتے تھے پھر شوق کے حدی خواں نے مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفاً چلنے کے لیے بیقرار کیا۔ آپ نے عزم صمیم کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر عاجزانہ حاضری کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ایک مدت تک مدینہ منورہ میں رہ کر اپنی دیرینہ تشنگی کی تکمیل میں مصروف رہے۔ دونوں مقدس مقامات کے انوار و تجلیات سے روح کی پاکیزگی اور باطن کا جلا حاصل کیا''۔ (۹۱)

حرمین میں آپ کے علم کا اعتراف: سفر حجاز میں طرابلس، بصرہ، مصر، شام اور دوسرے کئی مقامات سے آئے ہوئے علماء نے مولانا انور شاہ کی بہت عزت کی اکثر علماء نے آپ کی خداداد لیاقت اور اعلیٰ استعداد کو دیکھ کر آپ کو اعزازی سنداتِ حدیث عطا کیں۔ ان سندات میں آپ کا نام اکثر مقامات پر'' الفاضل الشیخ محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیری'' لکھا گیا ہے۔ (۹۲)

شیخ طرابلسی سے ملاقات: مدینہ منورہ میں آپ نے '' الرسالة الحميدية'' اور '' الحصون الحميدیه'' کے مصنف شیخ حسین طرابلسی جسرؒ سے ملاقات کی اور کچھ مدت تک

آپ ان کے ساتھ بھی رہے، انھوں نے آپ کو اپنی سند کے ساتھ حدیث کی اجازت بھی دی۔ اس طرح آپ کو اس عہد کے بلادِ اسلامیہ کے اکابر علماء سے ملنے کا موقع ملا اور ان سے اہم مسائل پر مذاکرات کیے۔(۹۲)

مولانا محمد انوریؔ بیان کرتے ہیں کہ جب مولانا انور شاہ کشمیری مدینہ میں پہنچے تو مسجد نبویؐ میں مولانا ظہیر احسن نیمویؒ کے لیے دعائے مغفرت ہو رہی تھی، تب انھیں معلوم ہوا کہ حضرت نیمویؒ کا وصال ہو گیا ہے۔(۹۴)

مولانا محمد انوریؔ مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''مدینہ منورہ میں روضہ مبارک کے پاس مسجد نبویؐ میں بھی آپ (مولانا انور شاہؒ) نے درس حدیث دیا ہے۔ اہل مدینہ خصوصاً علماء بہت متوجہ ہوئے۔ اکثر مسائل کا جواب آپ نے ان کو رسالوں کی شکل میں دیا۔ جو علمائے دیوبند ان دنوں وہاں رہتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ شب باشی آپ کی مسجد نبوی میں ہو''۔(۹۵)

<u>کتب خانوں سے استفادہ</u>: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کافی دن تک قیام کرنے کے دوران روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، وہاں کے کتب خانوں سے بھی پورا پورا استفادہ کیا اور ایک عرصہ تک آپ وہاں کے نوادرات کا مطالعہ کرتے رہے۔ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے اسفارِ نادرہ کے مطالعہ کے لیے اپنی فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھا۔ ''مکتبہ شیخ الاسلام''، ''عارف حکمۃ اللہ الحسینی'' اور ''مکتبہ محمودیہ'' جیسے کتب خانوں میں نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ آپ ان کتب خانوں کی تفسیر و حدیث پر عمدہ و نفیس کتابوں کے مطالعہ میں ہمہ تن مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ بقول شیخ ابوغدہؒ " طفح صدره بعلوم تلك الأسفار الزاخرة" یعنی اس قیمتی علمی ذخیرہ سے آپ کا سینہ معمور ہو گیا۔(۹۶)

پھر دل میں دوبارہ حرمین شریفین آنے اور آخری دم تک جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں رہنے کا ارادہ لے کر وطن واپس لوٹے۔

<u>روضۂ اقدس کے سامنے نذرانۂ عقیدت</u>: مدینہ منورہ میں جب یکم محرم الحرام ۱۳۲۴ھ کو آپ روضۂ اقدس واطہر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض سلام کے لیے حاضر ہوئے تو نذرانۂ عقیدت

کے سلسلہ میں ایک ایسی نعت کہی جس کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا عربی کا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مدرسۂ فیض عام (۱۳۲۴ھ): ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۷ء میں حجاز مقدس سے واپسی پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بعض مقامی علما اور علم دوست اہل ثروت خواجہ عبدالصمد ککروؒ، خواجہ امیر الدین ککروؒ، اور خواج امیر شاہ تحصیلدار کے تعاون سے قصبہ بارہ مولہ میں مدرسہ ''فیض عام'' کے نام سے ایک دینی ادارہ قائم کیا۔ جہاں آپ تین سال تک تعلیمی خدمات اور تبلیغی فریضہ کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ شروع شروع میں نتائج بہت خوش آئند تھے۔ ایک فارسی مکتوب میں مدرسہ کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہ فقیر حقیر در قصبہ بارہ مولہ از کشمیر بخیال خود بغرض اشاعت علم دین واعانت مذہب امام اعظم طرح تعلیم فقہ و حدیث نہادہ بود، اکثر نیک نہاداں ایں امر را نیک نہادند و بعض اہل توفیق بقلیل و کثیر زاد معاد امداد دادند۔''(۹۷)

ترجمہ: فقیر حقیر نے کشمیر کے مشہور قصبہ بارہ مولا میں علمِ دین کی اشاعت اور فقہ حنفی کی اعانت کے لیے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ جہاں فقہ وحدیث کی تعلیم بھی شروع ہوگئی جہاں بعض نیک نہاد اس اقدام کی خوبی پر مطلع ہوگئے، دین کی حمایت اور مدرسے کی نصرت کے لیے آمادہ ہوگئے''۔

یہ اقتباس مدرسہ کا بہترین تعارف کراتا ہے۔ قیامِ مدارس کے سلسلہ میں مدرسہ امینیہ کے بعد یہ دوسرا آپ کا کارنامہ ہے۔

اہل کشمیر کا عدم تعاون: جب مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تو معاونین نے مدرسے کے لیے درس گاہوں اور طلبہ کے لیے ہوسٹل کی تعمیر کے بڑے بڑے اعلان کئے لیکن جلد ہی وہ مدرسہ کے معاملات سے عدم دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ طلبہ کے سلسلہ میں بھی عوام کے اندر کوئی تحریک نظر نہ آئی۔ تین سال تک اصلاح کی کوشش کرنے کے باوجود جب کامیابی کی کوئی کرن نظر نہ آئی تو مایوسی کی حالت میں ایک بار پھر کشمیر کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ آپ کے

سامنے حصول تعلیم کا ایک عظیم مقصد تھا۔ جن کی وضاحت عبدالرحمان کوندوؒ نے اپنی کتاب ''الانور'' میں اس طرح کی ہے :

''حصول علم کا مقصد ہے اپنے دل و دماغ کو جہالت کی تاریکیوں سے پاک کر کے خود بھی اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آنا اور خلق خدا کو بھی تاریکیوں سے نکال کر نور ہدایت کی شاہراہ پر لانا۔'' (۹۸)

اس مقصد کے حصول کے لیے مولانا انور شاہ نے مدرسہ ''فیض علم'' میں ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۷ء سے ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء تک دن رات محنت کی، جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو صرف کیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اپنی کوتاہ اندیشی اور ذہنی پستی کی وجہ سے اس تعلیمی اور تربیتی درس گاہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ لوگ تیار نہیں ہیں۔ اس طرح یہ نیک کام لوگوں کی بد معاملگی اور عدمِ ذوق کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ (۹۹)

دل برداشتگی کا اظہار: کشمیر میں بعض لوگوں کی بد معاملگی اور عدم تعاون کی وجہ سے شاہ صاحب بہت دل برداشتہ ہوگئے، اس کا اظہار آپ نے اپنے ایک دوست مولانا امین الدینؒ بانی مدرسہ امینیہ دہلی (م۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء) کے نام ایک مکتوب (مورخہ ۲۷/ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ) میں اس طرح کیا ہے:

''یہاں بارہ مولہ پہنچ کر کچھ توقف سا ہوگیا ہے۔ حقیر کی یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر مخلوق کی بد معاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا۔ اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا۔'' (۱۰۰)

مدرسہ فیض عام کو قائم کرنے، چلانے اور آخر کار مایوس ہو کر ختم کر ڈالنے میں آپ کو ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تا ربیع الاول ۱۳۲۸ھ تک اپنی گراں قدر زندگی کے آٹھ برس صرف کرنے پڑے، نتیجہ ناکامی نکلا۔ (۱۰۱)

کشمیر سے دیوبند: مولانا انور شاہؒ کو مدرسہ کی ناکامی کا شدید صدمہ تھا، اب انہوں نے حجاز مقدس کی طرف ہجرت کا ارادہ کرلیا۔ اپنے والدین، اقرباء اور دوست واحباب کو الوداع کہا اور ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو کشمیر سے دارالعلوم پہنچ گئے تاکہ اپنے اساتذہ سے بھی مل لیں اور اپنے ارادہ سے آگاہ کردیں۔ (۱۰۲)

جلسۂ دستار بندی: حسن اتفاق ہے کہ اسی سال ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ/ اپریل ۱۹۱۰ء (۱۰۳) میں مہتمم ادارہ ہٰذا حافظ محمد احمدؒ اور صدر المدرسین مولانا محمود حسن نے فضلائے دار العلوم کی دستار بندی کے لیے دیوبند میں ایک تاریخی جلسہ کا انتظام کیا۔ سید حسین احمدؒ مدنی جلسہ کے منتظمین میں سے بھی تھے اور ان لوگوں میں بھی جن کی اس موقع پر دستار بندی کی گئی۔

جلسہ کی روئداد میں لکھتے ہیں:

"جلسہ میں قاری عبدالوحید خانؒ مدرس تجوید اور ان کے شاگردوں مولانا محمد طیبؒ اور مولانا محمد طاہرؒ نے با تجوید قرآن سنایا...... اس کے بعد سب سے پہلے عربی زبان میں حضرت مولانا انور شاہؒ صاحب نے مبسوط تقریر فرمائی...... اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی دستار بندی کی گئی"۔ (۱۰۴)

دار العلوم میں تدریس کے فرائض بطورِ معلم

دار العلوم کے جلسۂ دستار بندی کی تقریب سے فارغ ہو کر مولانا انور شاہؒ کشمیری نے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حافظ محمد احمدؒ صاحب کو حرمین شریفین ہجرت کرنے کے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے آپ کو ہجرت کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ فسخ ارادہ کا حکم دیا اور دیوبند میں رہنے کے لیے زور دیا۔ اپنے استاد کے حکم کے آگے رائے سخن نہ تھا اور بغیر سر تسلیم خم کئے چارہ نہ تھا۔ (۱۰۵) اس طرح اسی سال یعنی ۱۳۲۸ھ میں آپ کے درس کا دار العلوم میں آغاز ہوا۔ [۱]

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو دار العلوم میں ٹھہرانے کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح لکھوائی جائے لیکن عملاً یہ کام آگے نہیں بڑھا۔ شیخ الہندؒ کے ہاں اس زمانہ میں ابوداؤد، بخاری اور ترمذی کے اسباق جاری تھے۔ آپ نے موصوف کے مسلم، سنن نسائی اور

---

[۱] شیخ ابوغدہؒ نے شاہ صاحب کے دیوبند میں تدریس کا سال ۱۳۲۵ھ لکھا ہے، کیونکہ اس سال آپ کشمیر میں تھے اور ڈاکٹر رضوان اللہ نے ۱۳۲۷ھ کا سال لکھا ہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔

سنن ابن ماجہ کے اسباق حوالہ کئے اور عرصہ دراز تک اس خدمت کا معاوضہ نہیں لیا۔ ؎۱

دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کرنے کے باوجود وہ ہجرت کے ارادہ سے بالکلیہ دست بردار نہیں ہوئے۔ حرمین شریفین کی حاضری کا جذبہ برابر انہیں دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہا۔ اس لیے ارباب دارالعلوم آپ کو مستقل جمانے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔(۱۰۶)

نکاحِ مسنونہ

اب مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی عمر ۴۴ سال ہو چکی تھی لیکن ابھی تک شادی کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ موصوف علمی شغف اور حرمین شریفین ہجرت کرنے کے ارادہ کی وجہ سے تجرد کی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب دی اور دیگر بزرگوں نے بھی ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ لی اور ارادہ کیا کہ مولانا انور شاہؒ کا نکاح کر دیا جائے۔ آخر کار دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک معزز خاندان میں شادی کرادی۔ (۱۰۷) یہ واقعہ ۱۳۴۴ھ کا ہے۔ (۱۰۸) بارات بھوپال گئی کیونکہ آپ کی اہلیہ کے والد سید یعقوب علیؒ ۱۸۵۷ء میں گنگوہ سے بھوپال جاکر مستقل آباد ہو گئے تھے۔ نکاح کے وقت آپ کی عمر ۴۴ سال اور زوجہ میمونہ خاتون کی عمر ۱۳ سال تھی۔ عمر کا یہ فرق سماجی اعتبار سے غیر مناسب ہو سکتا تھا لیکن مولانا محمود حسنؒ کے حکم و اصرار نے اس عزلت کو عجلت میں پایۂ تکمیل تک اس لیے پہنچا دیا کہ کہیں عمروں کی مطابقت کی تلاش میں دارالعلوم مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے اور وہ یہاں سے ہجرت نہ کر جائیں۔ قاری محمد طیبؒ بارات کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ "بڑی پر مسرت فضا میں نکاح ہوا، علماء کی جماعت ساتھ تھی۔ دعوتِ ولیمہ اہتمام سے ہوئی۔ دلہن کو حافظ محمد احمد صاحبؒ کے گھر اتارا گیا۔ شادی کے دو سال بعد مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے حافظ صاحب پر

؎۱ مولانا کشمیریؒ نے ابتداء تنخواہ لینے سے انکار کر دیا تو ان کی خورد ونوش کا انتظام مہتمم محمد احمد صاحبؒ نے اپنے ذمہ لے لیا اور دس سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

مزید بار ڈالنا پسند نہ کیا اور ان سے کہا:

''دس سال تک تو میں تنہا تھا۔ دو سال سے متاہل ہوں۔ اب اولاد کی امید ہے تو ایک اور کا بار ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں کہ الگ مکان لے کر رہوں''۔(۱۰۹)

اس کے بعد آپ محلّہ دیوان میں رہنے لگے۔ اب اخراجات کا سلسلہ بڑھنے لگا تو ارباب حل وعقد کے اصرار پر نہایت قلیل بقدر کفاف مشاہرہ قبول کیا۔(۱۱۰) اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ عبد الفتاح ابو غدہؒ لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تنخواہ پچاس روپے (۵۰) سے بھی کم تھی''۔(۱۱۱)

۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک چھ سال مولانا انور شاہ کشمیریؒ شیخ الہندؒ کے سامنے مختلف علوم کی اونچے درجے کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ حدیث میں صحیح مسلم، ابن ماجہ اور سنن نسائی کا درس آپ کے ذمے تھا۔

دیوبند کی صدر مدرسی

دیوبند کی تاریخ میں مولانا انور شاہ کشمیری کی صدر مدرسی کا ۱۳۳۳ھ کا دور نہایت اہم اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ شیخ الہندؒ مشرق سے انگریزی تسلط کو ختم کرنے کے لیے حجاز مقدس میں اپنے مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ اس موقع پر آپ کو ایسے انسان کی تلاش تھی جو آپ کی عدم موجودگی میں دارالعلوم کو آپ کے وضع کردہ طریقہ کار پر چلائے اور خاص طور پر تدریس حدیث میں آپ کے طرز فکر کی ترجمانی کما حقہ کر سکے۔(۱۱۲)

۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ دیوبند سے حجاز کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ کے بعد مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درس ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا۔ بقول مولانا انظر شاہ:

''اس انتخاب کے بعد آپ نے بخاری اور ترمذی کے اسباق ایسے انقلاب انگیز طور پر جاری کیے جس سے دارالعلوم کی تدریس و تعلیم کی پرانی روایتیں

بدل گئیں"۔(۱۱۳)

جب شیخ الہندؒ دیوبند سے روانہ ہوگئے تو کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے ظالم انگریز آپ کو مع رفقاء سفر گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند رکھیں گے۔اسی طرح تقریباً پانچ سال تک شیخ الہندؒ دیوبند سے دور رہے اور مولانا انور شاہ کشمیری ان کی نیابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۲۰/ رمضان ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء کو طویل اسارت کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ وطن واپس آئے۔ اس کے بعد آپ صرف چھ ماہ تک بقید حیات رہے اور ۱۸/ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کی صبح انتقال کیا۔آپ کی موجودگی میں بھی مولانا انور شاہؒ قائم مقام صدر مدرس کے عہدے پر قائم رہے اور آپ کی وفات کے بعد مستقل صدر المدرسین بن گئے۔(۱۱۴)

دارالعلوم میں آپ نے ۱۳۴۵ھ تک نہایت اہتمام اور محدثانہ شان سے حدیث کا درس دیا۔آپ کی شہرت ہندو بیرونِ ہند کے علمی حلقوں تک پہنچ گئی۔

دارالعلوم میں ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۴۵ھ کے آخر تک تقریباً اٹھارہ سال تدریسی خدمات انجام دینے کے دوران مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے علماء کی ایک بڑی جماعت کو تیار کیا جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے۔

دارالعلوم میں اختلافات اور مولانا انور شاہؒ کی علیحدگی

۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم میں ایک نزاع کھڑا ہوا جو بعد میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور بہت سے اساتذہ اور دارالعلوم کے صدر المدرسین تک اس اصلاحی تحریک کے حامی ومددگار بن گئے۔اس نزاع کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ۱۲/ ۱۲۴۵ھ کو دارالعلوم کے طلبہ اور دیوبند کے ایک ہندو رئیس کے باغ کے ملازموں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور معاملہ پولیس تک جا پہنچا اور چار طلبہ کو گرفتار کرلیا گیا لیکن بعد میں فریقین کے مابین سمجھوتہ ہو گیا۔(۱۱۵)

مولوی عبدالوحید غازی پوری صدر "اللجنۃ الاتحاد" نے انکوائری کمیشن کے سامنے جو شکایات پیش کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ دارالعلوم کی انتظامیہ نے خود طلبہ کے خلاف

رپورٹیں درج کروائیں اور اس سلسلہ میں ان کی کوئی مدد نہ کی، دوسری یہ کہ طلبہ کو مطبخ کے انچارج کے بارے میں شکایات تھیں، انہوں نے مہتمم دارالعلوم کے نام درخواست لکھ کر ان شکایات کے ازالہ کے لیے عرض کیا۔ لیکن انتظامیہ نے اس کے برعکس شعبان ۱۳۴۵ھ کو گیارہ طلبہ کو دارالعلوم سے خارج کر دیا۔ اور ان کے کپڑوں اور سامان کو مقفل کر دیا۔ اسی طرح طلبہ کو دیگر شعبہ جات کی بدنظمی، مہتمم اور ملازمین مدرسہ کے ناروا برتاؤ کی شکایت تھی۔(۱۱۶)

طلبہ کے علاوہ دارالعلوم کے مدرسین کو بھی انتظامیہ کے خلاف شکایات تھیں، جن کا ازالہ ضروری تھا لیکن انتظامیہ نے ان کے سدباب کے لیے کوئی توجہ نہ دی اور اپنی انا کا مسئلہ بنا بیٹھی۔

سید حافظ محمد نعمانؒ دارالعلوم کے نزاع کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مہتمم کے عہدہ کے امیدوار ہوئے، مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی ان کی تائید کی، اس کے ساتھ یہ بحث چل نکلی کہ دارالعلوم پر عثمانی عنصر غالب ہوا جا رہا ہے۔ اس لیے صدیقی برادران یعنی قاری محمد طیبؒ اور قاری طاہرؒ اس تقرری کی مخالفت کرنے لگے۔ ان کی والدہ جو ''اماں جاں'' کے نام سے دارالعلوم میں مشہور تھیں ان کا دارالعلوم میں اثر و رسوخ بھی کافی تھا۔ قاری طاہر نے اسی اثر و رسوخ کا سہارا لیتے ہوئے اپنے بھائی قاری محمد طیب کو مہتمم کے عہدہ پر بٹھا دیا۔ اس تقرری پر اساتذہ اور طلبہ میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ اس واقعہ کی آڑ میں ''اللجنتہ الاتحاد'' کے صدر مولوی عبدالوحید غازی پوری نے خوب انتشار پیدا کیا اور شاہ صاحب کو ارباب اہتمام کے خلاف کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی کے اکسانے پر طلبہ نے اسٹرائک کر دی اور حالات مزید خراب ہو گئے''۔(۱۱۷)

مولوی محمد عبداللہ ملتانی اس اختلاف کی وجہ یہ بتاتے ہیں:

''جامعہ ملیہ دہلی سے انگریزوں کے دو ایجنٹ دیوبند آئے انہوں نے یہاں سے ہفتہ وار اخبار ''مہاجر'' بھی نکالا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ عثمانیؒ اور

مولانا عزیز الرحمانؒ کے حق میں بیانات شائع کئے اور فریق مخالف پر بے سروپا الزامات لگانے شروع کردیئے تو ان کے مقابلہ کے لیے ایک جماعت لونڈوں کی مہتمم صاحب کے حق میں کھڑی ہوگئی۔ (۱۱۸)

مولانا محمد چراغؒ آف گوجرانوالہ لکھتے ہیں:

''مجلس شوریٰ کے دو ممبر فوت ہوگئے۔ مولانا انور شاہؒ صاحب کی خواہش تھی کہ خالی اسامیوں پر مفتی کفایت اللہؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو شامل کرلیا جائے لیکن دارالعلوم والے نہ مانے۔'' (۱۱۹)

حافظ محمد نعمان لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ طبعاً بڑے سیدھے سادے تھے، سیاسی اور اختلافی امور سے دور رہتے تھے کہ اگر کوئی طالب علم بات جا کر کہہ دیتا تو فوراً مان لیتے۔'' (۱۲۰)

اخبارات کے تبصرے

روزنامہ انقلاب لاہور: اخبار دارالعلوم کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''گذشتہ چند ماہ سے اس دارالعلوم کے اندرونی حالات میں جو خلفشار رونما ہورہا ہے اور مولانا حبیب الرحمانؒ کی خود رائی اور استبداد پرستی کی وجہ سے جو ناگوار حالات پیدا ہورہے ہیں، وہ ہر مسلمان کے لیے موجب رنج و تأسف ہیں۔ پچھلے دنوں بعض طلبہ کے اخراج پر دارالعلوم میں جو صورت پیدا ہوئی اور اس کے لیے طلبہ نے جو ہڑتال کی، اس کے واقعات سخت روح فرسا ہیں۔'' (۱۲۱)

ارباب اہتمام کی انتظامی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا ہے:

''جب سے مولانا کشمیریؒ اور مولانا عثمانی نائب مہتمم کے بعض افعال و اعمال سے بیزار ہوئے ہیں، دارالعلوم کی علمی حالت نہایت تشویش انگیز ہورہی ہے۔ اور پچھلے دنوں حضرت مولانا کشمیریؒ کے خلاف جو اشتہار بازی کی ہے وہ کسی اعتبار سے بھی شریفانہ قرار نہیں دی جاسکتی۔'' (۱۲۲)

اخبار کی رائے ہے کہ ایک ''آل انڈیا وفد'' نہایت غیر جانبدارانہ تحقیقات کرے تاکہ دارالعلوم میں اختلاف کا سد باب ہو سکے۔

روز نامہ زمیندار، لاہور لکھتا ہے:

'' چند سال سے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ انتظامیہ میں سخت نقائص پیدا ہو رہے ہیں۔ مولانا حافظ محمد احمدؒ برائے نام دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے اور ہیں۔ تمام انتظامات مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ کرتے تھے، گزشتہ سال مولانا حیدرآباد چلے گئے اور ان کی جگہ پر مولوی قاری محمد طیبؒ بہ حیثیت نائب مہتمم کام کرتے رہے۔ یہ نوجوان بڑا لائق اور شریف ہے مگر انتظامی قابلیت سے بالکل عاری ہے۔ گزشتہ سال بعض معمولی منتظمین نے طلبہ کی توہین کی جس پر طلبہ نے متفقہ طور پر ایک دو روز کے لیے مدرسہ کو چھوڑ دیا۔ اسی وقت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے اس وعدہ نے مدرسہ کو تباہی سے بچالیا کہ طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنا کام شروع کر دیں۔ اگر منتظمین نے ایک دو ماہ کے اندر ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو میں مدرسہ چھوڑ دوں گا''۔

یہی اخبار لکھتا ہے کہ تمام سال اسی طرح گزر گیا اور تغیر و تبدل وقوع میں نہ آیا۔ شعبان المعظم کے آخری ہفتے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ظہر کے بعد مسجد میں اعلان کر دیا:

'' طلبہ اور مدرسین کے ساتھ منتظمین کا رویہ نہایت نازیبا ہے، اس لیے میں آخری و قطعی نوٹس دیتا ہوں کہ وہ مدرسہ کے انتظامی حالات کو درست کریں ورنہ میں شوال کے بعد ہمیشہ کے لیے مدرسہ چھوڑ دوں گا''۔ (۱۲۳)

یہی اخبار مزید لکھتا ہے:

'' مولوی قاری طیبؒ کو ایک عظیم سازش کے تحت مستقل نائب مہتمم بنادیا گیا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر تک نہیں بنائے گئے۔ سوائے حضرت اشرف علی تھانوی کے، مجلس شوریٰ میں وہ لوگ ہیں جو منتظمین کی ''ہاں میں ہاں'' ملادیتے ہیں۔'' (۱۲۴)

مولانا انور شاہ کشمیری کے خلاف الزام تراشی

آپ کے خلاف ایک الزام یہ تراشا گیا کہ محمد بن موسیٰ کے والد نے جو روپیہ دار العلوم کے پانچ کمروں کی تعمیر کے لیے بھیجا تھا وہ شاہ صاحبؒ نے اپنے مکان کی تعمیر کے لیے وصول کرلیا۔ اس الزام کی صفائی مولانا محمد بن موسیٰ نے ۲۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ایک خط میں دی۔ لکھتے ہیں :

''نہ ہی میں نے یہ روپیہ حضرت شاہ صاحب کے مکان کی تعمیر میں لگایا نہ میرے والد نے کسی سے چندہ کر کے روپیہ بھیجا تھا۔ یہ ایک بہتان عظیم ہے جس کی برأت کا اعلان آپ کی ذمہ دار جماعت کا فرض ہے۔'' (۱۲۵)

مفتی عزیز الرحمانؒ سے زبردستی استعفاء لیا گیا۔ ہفتہ وار مہاجر میں ایک طویل بیان شائع ہوا جو انتظامیہ کے رویے پر روشنی ڈالتا ہے۔

مفتی صاحب نے ایک بیان میں کہا کہ:

''مولوی حکیم مسعود احمدؒ ۲۳/ جنوری ۱۹۲۷ء بروز جمعہ بعد مغرب تشریف لائے اور مجھے علیحدہ لے جا کر فرمایا کہ تم ایک تحریر لکھ دو کہ ''انتظام اہتمامِ مدرسہ میں کوئی خرابی نہیں ہے'' میں نے عرض کیا کہ ایسی تحریر نہیں لکھ سکتا یہ امر واقع کے خلاف ہے بہتر ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو جس طرح ہو لاویں مگر وہ نہ راضی ہوئے اور فرمایا کہ تم استعفاء دیدو۔ بندہ نے بایں الفاظ استعفاء اس جلسہ میں داخل کردیا۔ حسب ارشاد حکیم صاحب بندہ استعفیٰ دیتا ہے''۔ (۱۲۶)

انتظامیہ کے خلاف مولانا کشمیریؒ کی شکایات

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ایک فارسی خط میں اپنے تمام مسائل و شکایات بیان کی ہیں، اس کا اردو ترجمہ مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:

۱) برسوں سے مجلس شوریٰ کا اجلاس نہیں ہوا۔ دس یا بارہ سال میں صرف گذشتہ دو سالوں میں اجلاس ہوئے، احقر کو کوئی دعوتِ شرکت موصول نہیں ہوئی۔

۲) امسال ماہ ذی القعدہ میں تھانہ بھون میں اجلاس ہوا۔ درمیان جلسہ احقر کو کو اٹھا دیا گیا۔

۳) مفتی عزیز الرحمانؒ کی برخاستگی اس وجہ سے ہے کہ کیوں انھوں نے کلمہ حق کہنے سے رجوع نہیں کیا۔

۴) خطوط صیغہ راز میں رہتے ہیں۔

۵) مدرسہ کا حساب بہت گندا ہے۔

۶) مفتی رحمت علیؒ کے فرضی حساب کا قصہ مدرسہ کے عملہ سے لے کر مدرسین اور طلبہ کو معلوم ہے، مبلغ چھ ہزار روپیہ اب تک کتب خانہ میں تلف ہوا اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

انتظامیہ کا موقف

انتظامیہ دارالعلوم نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ''القاسم'' کا ایک ضمیمہ شائع کیا اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے اعتراضات کا جواب دیا۔

۱) مفتی عزیز الرحمانؒ کے استعفاء کے بارے میں لکھا ہے۔ اگر استعفیٰ لیا گیا تو کوئی بے قاعدہ بات نہیں ہے، عہدیداران معززین کے ساتھ ایسے موقع پر اس طرح تہذیب کا برتاؤ ہوا کرتے ہیں۔

انتظامیہ نے شاہ صاحبؒ کے استعفاء اور ناراضگی کی وجوہات یہ تحریر کی ہیں:

۱) مہتمم کی تنخواہ ان کی تنخواہ سے زیادہ کیوں ہے۔

۲) ان کا مطالبہ تین مخصوص اشخاص کے ممبر ہونے کا مجلس نے فوری طور پر منظور کیوں نہ کیا۔

۳) تھانہ بھون میں مجلس شوریٰ سے تھوڑی دیر کے لئے ان کو علیحدہ ہونے کی بابت کیوں کہا گیا۔

۴) مہتمم ان سے ہر امر میں مشورہ کیوں نہیں لیتے۔

۵) ان کا استعفاء ۱۳/صفر ۱۳۴۶ھ کشمیر سے پہنچا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں

اطلاع پہنچائی گئی ہے کہ ان کے متعلقہ اسباق دوسرے اساتذہ کو دیئے گئے ہیں اور یہ وجہ ان کے لطیف جذبات کے بھڑک اٹھنے کی ہوئی۔

۶) ان کے استعفاء پیش ہونے پر فوراً ممبران نے اپنے اپنے دور دراز مقامات سے دوڑ کر ان کی طرف رجوع کیوں نہ کیا؟

مزید لکھا ہے کہ یہ تمام وجوہ و مطالبات بالکل ذاتی تخیلات، نفسانی توہمات اور خلاف واقع ذہنی توقعات پر مبنی ہیں۔ آپ کے بعض احباب اور چند لڑکوں یعنی بعض طلبہ نے آپ کے نفسیاتی جذبات کو بہت بھڑکایا۔ محض قیاسی اور ظنی باتوں پر دارالعلوم کے درس حدیث سے اعراض فرمانا ایک فتنۂ خاص کو پیدا کر دینا تھا۔ ہم آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ تاریخ یکم ذوالحجہ ۱۳۴۵ھ سے جو آپ نے استعفیٰ ملازمت پیش کیا ہے اس کو منظور کرنے پر مجبور ہیں۔ (۱۲۹)

راقم احروف کی رائے کے مطابق انتظامیہ کے یہ الزامات بالکل بے بنیاد اور بودے ہیں، خاص طور پر یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے استعفاء اس وجہ سے دیا ہے کہ ان کی تنخواہ کم ہے کسی طرح بھی لائق اعتناء نہیں۔ شاہ صاحب جیسا متوکل اور بے غرض انسان جو بارہ سال تک بلا معاوضہ اسی دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہا کلکتہ یونیورسٹی نے آٹھ سو روپیہ ماہوار کی پیشکش کی مگر آپ نے پچاس سے بھی کم روپے تنخواہ پر دارالعلوم میں رہنا پسند کیا۔ آج اس کے متعلق کہ کہنا یہ تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے استعفاء دے دیا بالکل غیر معقول بات ہے۔

انکوائری کمیشن کی رپورٹ

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبران کا ایک وفد حافظ محمد ابراہیم کی سرکردگی میں ادارہ کے حالات کی تحقیق کے لیے آیا۔ انکوائری آفیسر اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

۱۔ وفد کے آنے کی خبر سن کر مدرسہ کے حساب میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ اور ۵۰۰ روپیہ رجسٹر امانت میں مہتمم کے نام جمع کر دیا گیا ہے۔

۲۔ منشی رحمت علی سابق انچارج شعبہ تعمیرات کے ذمہ تین ہزار پانچ سو روپیہ تھا۔

۱۳۴۱ھ میں جب اسے کسی دوسرے شعبہ میں تبدیل کیا گیا تو اس نے نہ وہ رقم اپنے قائم مقام کو دی اور نہ ہی مدرسہ میں داخل کرائی۔

القاسم کی جلدوں کی فروختگی: یہ جلدیں مولوی حبیب الرحمان کی ملکیت تھیں۔ القاسم کے بند ہونے کے بعد یہ جلدیں انہوں نے مبلغ دو ہزار سینتیس روپیہ آٹھ آنہ بحق مدرسہ منتقل کیں تاکہ جناب مہتمم صاحب کو اپنی رقم وصول کرنے میں کسی طویل مدت کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

۴) دارالعلوم میں قرضہ ممبران مجلس شوریٰ کے علاوہ غیر متعلق اشخاص کو بھی دیا گیا۔ (۱۳۰)

طلبہ کی شکایات کے سلسلہ میں کمیشن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

''قوی خیال پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کی شکایات ایک معقول حد تک واقعیت پر مبنی ہوں گی اور اسٹرائک کی حد تک نوبت پہنچنے میں ضرور دائرہ اہتمام کی سختی کو بہت دخل ہوگا۔ دو مرتبہ طلبہ نے اسٹرائک کی، میں نے دوسری مرتبہ اسٹرائک کی حالت کو بچشم خود دیکھا۔ اس کی وجوہات تلاش کرنا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہیں، اس سے پہلے والی اسٹرائک جن شکایات پر مبنی تھی ان کا ازالہ نہیں کیا گیا۔ مواد جمع ہوتا رہا جو حضرت مفتی عزیز الرحمان سے استعفاء لینے پر پھوٹ پڑا۔ اس مواد کو ان ہتک آمیز بیانات اور عبارتوں سے جو حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے خلاف بعض ملازمین مدرسہ اور حامیان اہتمام کی جانب سے شائع ہوئیں، مزید تقویت پہنچتی رہی ہے۔'' (۱۳۱)

مولانا محمد میاںؒ سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی لکھتے ہیں:

''بہر حال اصلاحات کے نام پر ایک تحریک دارالعلوم میں شروع ہوئی اور اس نے اپنے دامنوں کے تار رفتہ رفتہ حضرت شاہ صاحب جیسے عظیم الشان بزرگ کے قباء عظمت سے جوڑ دیئے۔ داستان بہت طویل ہے اور اس کا آخری باب استعفاء ہے''۔ (۱۳۲)

ہفتہ وار ''مہاجر'' نے شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر شائع کی:

''اکابر دارالعلوم و محترم اساتذہ دیوبند کو چھوڑ رہے ہیں۔ ۱۸/ اپریل ۱۹۲۸ء

تک جماعت مصلحین کے محترم اکابر ڈابھیل (سورت) کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ جہاں ان کے مقدس ہاتھوں سے اسلامی دارالعلوم کا افتتاح کیا جائے گا۔ فی الحال حسب ذیل اساتذہ ڈابھیل تشریف لے جائیں گے۔

۱) حضرت مولانا کشمیریؒ
۲) شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۳) استاذ الادب مولانا سراج احمدؒ سابق مدیر ''القاسم''
۴) استاذِ ہیئت مولانا ادریس سکر دویؒ
۵) مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ
۶) ابوالقاسم حاجی حفظ الرحمان سیوہارویؒ
۷) مولانا عتیق الرحمان عثمانیؒ نائب مفتی اعظم ہند
۸) مولانا محمد بجلی تھانویؒ

جب مولانا انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو مدرسہ امینیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ڈھاکہ اور کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ بہت سے مشہور و معروف اداروں نے معقول مشاہروں پر آپ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے بڑی بڑی تنخواہوں کو اہمیت دیئے بغیر اپنے ایک مخلص شاگرد الحاج محمد میاں سملکی افریقیؒ کی استدعاء پر ڈابھیل جانے کو ترجیح دی۔

جب آپ کی علیحدگی کی خبر علامہ اقبالؒ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور سخت اصرار کے ساتھ ایک تار ارسال کیا کہ آپ لاہور آ جائیں لیکن وہ تار اس وقت ملا جب آپ نے ڈابھیل والوں سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے لاہور نہ جا سکے۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے مولانا عبدالحنان ہزارویؒ خطیب آسٹریلین جامع مسجد لاہور کو دیوبند بھیجا تا کہ مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے زبانی بھی کہا جائے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو آپ نے کہا:

''افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا ہوں۔'' (۱۳۴)

مولانا محمد نافع مصنف ''رحماء بینہم'' نے اپنے اُستاد مولانا سید احمد شاہ صاحب کے

حوالے سے بتایا کہ:

''وہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ جب دیوبند سے مستعفی ہوکر ڈابھیل چلے گئے اور پھر بیماری کی وجہ سے رخصت لے کر واپس دیوبند آئے تو بعض خاص احباب نے عرض کیا حضرت! واپس تشریف لائیے تو بہتر ہے۔ ان کے جواب میں فرمایا'' جس چیز کو ایک دفعہ تھوک دیا جائے تو اس کو پھر کھانے کا کیا معنی؟''۔ (۱۳۵)

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (۱۹۲۸ء)

مولانا انور شاہ صاحب اور دیگر علماء کے گجرات پہنچ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل قائم کرنے سے پہلے قصبہ ڈابھیل میں ''تعلیم الدین'' کے نام سے ایک چھوٹا سا دینی مدرسہ موجود تھا۔ اس مدرسہ کو شعبان ۱۳۲۶ھ میں سملک کی مسجد میں مولانا احمد حسن نے قائم کیا تھا۔ جسے علاقۂ گجرات کے بعض مخیرّ اور متموّل افراد مالی امداد دے رہے تھے۔ اس مدرسہ کے متعلقین اور خیر خواہ شروع ہی سے علماءِ دیوبند اور خصوصاً مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ بھی عقیدت رکھتے تھے اور اس مدرسہ کو وسیع پیمانے پر چلانے کے لیے ہمیشہ سے متمنی تھے، جوں ہی ان کو معلوم ہوا کہ آپ اور بہت سے علماء نے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے تو منتظمین مدرسہ ڈابھیل نے اس ادارہ کو ترقی دینے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اس لیے انہوں نے خاص کر مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ سملکی نے آپ کو اور آپ کے سب رفقاء کو اصرار کے ساتھ ڈابھیل آنے پر آمادہ کرلیا۔ اس چھوٹے سے مدرسے میں جب ہندوستان کے سب سے بڑے علماء نے درجات عالیہ کے سینکڑوں طلبہ کا قافلہ لیے ہوئے ڈیرا ڈال دیا تو اس کا نام ۱۹۲۸ء میں ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' رکھا گیا۔

مولانا انور شاہ کشمیری کے ساتھ دارالعلوم سے مستعفی ہونے والے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت سراج احمد رشیدیؒ جیسے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ساتھ دورہ حدیث اور دوسری اونچی جماعتوں میں پڑھنے والے دوسو پچھتر (۲۷۵) طلبہ پر مشتمل ایک قابل توجہ اور لائق اعتناء تعداد بھی تھی۔ (۱۳۶) اس لیے ڈابھیل جا کر اساتذہ درس وتدریس اور طالبان

علم استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

سپاسنامہ بر موقع افتتاح جامعہ اسلامیہ: جناب مولانا شبلی حجازی نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے افتتاح کے وقت ایک نہایت فصیح و بلیغ سپاسنامہ شیخ العلماء مولانا انور کشمیریؒ و حضرت مولانا عثمانیؒ وغیرہم کی خدمت میں بزبان عربی پیش کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علی سید نا

محمد القائل اطلبوا العلم ولو کان بالصین

لا خیل عندی و تھدیتہ و لا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

اساتذہ کرام! اگر میں ان عواطف عالیہ اور احساساتِ شریفہ کو جن کا مظاہرہ آپ نے ان ایام میں اہلیانِ شہر کی دعوت کو قبول فرما کر کیا ہے اور جن کی رونق آپ کے نور سے اور جن کی بہار آپ کی ضیاء طلعت سے ہے، یہاں بیان کرنا چاہوں تو یقیناً اس میں قاصر رہوں گا۔ خواہ اس کے لیے کیسی ہی زبان فصیح بیان اور قلم بلیغ رقم سے استمداد کیا جائے۔ خدا کرے آپ علم کی توسیع و اشاعت کے لیے ہمیشہ معاون و مددگار اور وابستگانِ دامن علم کی مساعدت کے لیے قائم رہیں، ہم لوگ قلب صمیم سے آپ حضرات کے شکر گزار ہیں اور خلوص وصفا آمیز سلام و تحیات آپ کی خدمت عالیہ میں پیش کرتے ہیں۔

اے بزرگان دین! اگر ہم تاریخی روایات اور قرآنی آیات کا تتبع کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام روایات و آیات نہایت بلند آہنگی کے ساتھ طلب و تحصیلِ علم کی دعوت دے رہے ہیں۔

أیھا السادۃُ! اس شہر کے لوگوں کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ فرطِ مسرت سے رقص کریں، کیونکہ اس علمی مدرسہ کی تاسیس سے اس شہر پر علم کے جھنڈے لہرائے جائیں گے اور اس سے شاندار مستقبل کے پیدا ہونے کی بہت کچھ توقع کی جا سکتی ہے۔ اخلاقِ زکیہ و خصائص طیبہ کے آبِ مصفّٰی سے اس کی پرورش ہونی چاہیے۔

اے علماء کرام! اس مقصد اور اہم امر کے لیے آپ پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ

آپ حضرات پوری مستعدی دکھائیں اور اپنی مساعدات اور قولی و فعلی مواطات عالم اسلام پر ظاہر کردیں تاکہ علوم ربانیہ جو قریب قریب ان اطراف میں بالکل ناپید ہیں شائع و ذائع ہوجائیں۔

اے معشر فضلاء! مجھ کو معاف کیجیے آپ کی پوری تعریف و توصیف جس کی ادائیگی سے میری زبان قاصر ہے ادا کرسکوں۔(۱۳۷)

جلسۂ دستار بندی: جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ۱۰/شعبان ۱۳۵۰ھ بروز یک شنبہ جامعہ کے احاطہ میں سالانہ جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، صدارت صدرالمدرس جامعہ شیخ الحدیث مولانا محمد انورشاہ صاحبؒ نے کی اور اپنے صدارتی خطبہ میں سفر آخرت کے متعلق وعظ کیا اور آئندہ سال بھی جامعہ میں قیام کرنے کا عزم کیا۔

اس سال ۳۲ فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی گئی۔ (۱۳۸) اگلے سال پھر ۱۱/شعبان ۱۳۵۱ھ بروز شنبہ جامعہ اسلامیہ کا سالانہ جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں مولانا احمد علیؒ صدر جمعیت علماء پنجاب بھی شریک ہوئے۔ دورۂ حدیث کے پانچ امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو حاجی محمد کی طرف سے پچاس روپے انعام دیئے گئے۔ مولانا انورشاہ صاحب نے امسال بھی سفرِ آخرت پر مبسوط تقریر کی۔ اس سال ۴۷ فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی گئی۔(۱۳۹)

مجلس علمی ڈابھیل: دارالعلوم کے اکابر صیغۂ تعلیم اور صیغۂ اہتمام کے درمیان جو اختلاف ۱۳۴۶ھ میں پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی شکل میں ایک جدید اور دوسری شاندار درس گاہ ابھر کر سامنے آئی جس نے علامہ وجیہہ الدین، علامہ طاہر پٹنی اور علی متقی کے گجرات کو ایک بار پھر قال اللہ وقال الرسول کی پُرکیف صداؤں سے گونجا دیا اور علوم و فنون کا ایک ایسا سرچشمہ بہا دیا جس سے ہندوستان کے جنوب و مغرب میں بھی دیوبند و سہارنپور، مرادآباد و رامپور اور دہلی و لکھنؤ جیسے علمی باغات کی آبیاری کا سامان ہوگیا۔

مولانا انورشاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے دیگر رفقاء نے ڈابھیل کے مدرسہ کو جہاں علوم اسلامیہ کی تعلیم کے اونچے درجات کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کا مثنیٰ بنا دیا، وہاں تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ ''مجلس علمی'' کے نام سے بھی قائم کرکے نئے اور

نایاب کتابوں کی اشاعت سے علمی دولت کی ترقی کا راستہ کھول دیا۔

یہ ادارہ مولانا محمد میاں سملکی افریقیؒ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی سرپرستی میں قائم کیا تھا جس سے اکابر امت حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خود شاہ کشمیری کے نادر علمی خزینوں کی نشر واشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ (۱۴۰)

یہ وہی ادارہ تھا جس کی کوششوں سے صحیح بخاری پر حضرت شاہ صاحب کی تدریسی تقاریر، ''فیض الباری'' کی شکل میں مصر سے چھپ کر آئیں۔

محمد کریم بخش کہتے ہیں:

> ''مقام ڈابھیل میں ایک مجلس علمی قائم تھی جس کے نظام کے تحت بعض تصانیف طبع کرائی تھیں۔ دو تین کتب مصنفہ شاہ ولی اللہ وامام ابن ہمام وغیرہما کی طباعت کا انتظام فکر ہو رہا تھا۔'' (۱۴۱)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا ایک ادارہ قائم ہوا جس کا نام مجلس علمی رکھا گیا۔ مجلس مذکور نے شیخ (انور شاہ صاحبؒ) کی زندگی میں اور زندگی کے بعد مختلف موضوعات پر تقریباً چالیس قیمتی کتابیں شائع کیں جو مشرق ومغرب میں پھیل گئیں اور ہر جانب سے علماء نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔'' (۱۴۲)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۳۴۷ھ سے ۱۳۵۱ھ تک پانچ سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس حدیث دیا۔ تدریس کے علاوہ تبلیغ کے فریضے کو پابندی سے ادا کرتے رہے۔ اس طرح بہت سی بدعات ومحدثات جو اہل گجرات کے رگ وریشہ میں داخل ہو چکی تھیں آپ کی جدوجہد سے ختم ہوئیں۔ قیام ڈابھیل کی تفصیل ابوغدہؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''وبقي الشيخ في (دابيل) خمس سنوات يشتغل بالدرس والتأليف والواعظ و التذكير، (تبحّت) تلك البسيطة من طنين حديثه و سارت الركبان تروي احاديث فيضه و بركاته و تشكر جدباء الهند أيادي غمامه، واستنارت هاتيك البقاع بنوره علماً

و عملاً و سنةً و حديثاً، فقوّم بوجوده المبارك الأود، وأصلح الله به هناك أمه، و قد غلبت عليه رقّةٌ فی آخر حياته الشريفه، فكان يأخذه البكاء فيدروسه و موعظه فكان يَبكی و يُبكی رحمه الله تعالیٰ" ۔(۱۴۳)

ترجمہ: شیخ ڈابھیل میں پانچ سال تک تدریس وتألیف اور وعظ ونصیحت میں مصروف رہے جس سے ان کے فیوض و برکات دور دور تک پھیلے اور تشنگانِ علم اس طرف کا رُخ کرنے لگے، آپ کی کوششوں سے علمِ حدیث اور سنتِ نبویؐ کو فروغ نصیب ہوا اور لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح ہوئی، آپ پر عمر کے آخری ایام میں اکثر بکاء و گریہ طاری رہتی تھی، جس کا اظہار درس و مواعظ کے مواقع پر ہوتا تھا، آپ خود روتے اور سامعین بھی رو پڑتے تھے۔

ڈابھیل سے واپسی: ڈابھیل کے اس پانچ سالہ قیام کے دوران آپ کبھی کبھی دیوبند آیا کرتے تھے کیونکہ دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود آپ کا گھر بار دیوبند ہی میں تھا۔ ۱۳۵۱ھ میں آپ سخت علالت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت کی صدارت کا چارج مولانا شبیر احمدؒ عثمانی کو سونپ کر موافق آب وہوا میں علاج کرانے کے لیے دیوبند آ گئے۔ جب کچھ عرصہ بعد افاقہ ہوا تو دوبارہ ڈابھیل جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اسی دوران بہاولپور کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس لیے آپ کو وہاں جانا پڑا۔ جمعہ کے روز بہاولپور کی جامع مسجد میں آپ نے کہا:

"حضرات میں نے ڈابھیل جانے کے لیے سامانِ سفر باندھ لیا تھا کہ یکا یک مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ (بہاولپور) کا خط دیوبند وصول ہوا کہ شہادت دینے کے لیے بہاولپور آیئے، اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کر کے بہاول پور کا سفر اختیار کیا۔" (۱۴۴)

۱۹/ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاول پور پہنچے۔ ۲۵/ اگست کو عدالت میں آپ کا بیان شروع ہوا، تین دن تک جاری رہا اور ۲۹/ اگست ۱۹۳۲ء کو ایک بجے ختم ہوا۔ (۱۴۵)

بہاول پور کے مقدمہ کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحبؒ اپنے شاگرد مولانا محمد

انوریؒ کے ساتھ لاہور پہنچے تو وہاں سے سنٹرل جیل میں نظر بند علماء ورہنما سے ملاقات کرنے کے لیے ملتان گئے۔ان دنوں میں مفتی کفایت اللہؒ،مولانا حبیب الرحمانؒ لدھیانوی، قاری عبدالرحمانؒ، مولانا احمد سعدی دہلویؒ، مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ، مولانا داؤدغزنویؒ، مظہر علی اظہرؒ، چوہدری افضل خانؒ ملتان جیل میں تھے۔(۱۴۶) وہاں سے ہوکر مولانا انورشاہ صاحبؒ بہاولپور پہنچے۔بہاولپور کے اس سفر کے دوران آپ نے دوروز لاہور میں قیام کیا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی جامع مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا علماء وفضلاء بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اوران کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔(۱۴۷)

آسٹریلین مسجد لاہور والوں کی خواہش

ان حضرات کی بھی خواہش تھی کہ مولانا انورشاہ کشمیریؒ کو یہاں لایا جائے اور مسجد میں درس کا سلسلہ شروع کیا جائے۔اس وقت آپ ڈابھیل سے رخصت لے کر دیوبند میں قیام پذیر تھے، مسجد کی روئداد سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کے معقول مشاہرہ اور رہائش کا انتظام بھی کیا تھا، میاں محمد خورشیدؒ مسجد کمیٹی کے ممبر اور خطیب مسجد مولوی عبدالحنان ہزارویؒ کو مولانا انورشاہ صاحبؒ سے ملاقات کرنے اور یہاں لانے کے لیے مامور کیا تھا، روئداد میں لکھا ہے:

> ''۱۹/ مارچ ۱۹۳۳ء کے جلسہ میں قرار پایا کہ خواجہ محمد خورشید مولانا کشمیریؒ کے متعلق اخیر اپریل تک قطعی فیصلہ کر کے رپورٹ کریں۔اس اجلاس میں ان کے لیے/۹۶۰ روپیہ الاؤنس اور/۱۵۰۰ روپیہ تنخواہ مخصوص کی تھی۔'' (۱۴۸)

افسوس ان کی خواہش پوری نہ ہوسکی اور ۲۹/مئی ۱۹۳۳ء کو مولانا انورشاہ کشمیریؒ راہی ملک عدم ہوئے۔

سفرِ آخرت

ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں پرانے مرض ''خونی بواسیر'' کا غلبہ ہوا۔اس میں بڑا دخل گجرات کی آب وہوا کی ناموافقت کو تھا۔اسی زمانہ میں مرض آہستہ آہستہ بڑھتا گیا،قویٰ پر

ضعف غالب آ گیا۔ بھوک ختم ہوگئی۔ بیماری کی شدت ہوئی تو آپ ڈابھیل سے رخصت لے کر دیو بند آ گئے۔ لاہور، ملتان اور بہاولپور کے سفر کے بعد جب آپ دیو بند پہنچے تو سفر کی تکان اور بے آرامی کی وجہ سے دیرینہ مرض نے شدت اختیار کر لی لیکن ڈابھیل میں تدریس کا کام جو ہو رہا تھا آپ اس کو حاصلِ حیات کا درجہ دے رہے تھے، اسی لیے اپنی صحت کی پروا کیے بغیر کچھ عرصہ کے لیے ڈابھیل چلے گئے۔ آخر کار جب جسمانی ضعف و نقاہت نے انتہائی نازک صورت اختیار کی تو ڈابھیل سے واپس دیو بند آ گئے اور گھر پہنچ کر صاحبِ فراش ہو گئے۔

ہفتہ وار اخبار مہاجر آپ کی علالت کے بارے میں لکھتا ہے:

''حضرت شاہ صاحب ایک عرصہ سے علیل تھے۔ بیماری بھی کچھ عجیب سی تھی مرض موجود نہ تھا لیکن کمزوری بے حد تھی بلکہ ضعف ترقی پر تھا۔ اس لیے حضرت کے خدام اور تلامذہ جو اطرافِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں سخت تشویش میں تھے۔ حضرت ممدوح نے خود کچھ آیات قرآنی بتائیں جن کو پانی پر پڑھ کر روزانہ دیا جاتا رہا۔ اس لیے خدا کے فضل سے بہت فائدہ ہوا۔'' (۱۴۹)

مکان پر علاج جاری رہا۔ دہلی کے مشہور حکیم نابینا، حکیم محمد احمدؒ، ڈاکٹر انصاریؒ اور آپ کے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علیؒ علاج کرتے رہے۔ مرض کا یہ آخری شدید حملہ تھا، کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ مرض کا یہ عالم تھا کہ بڑی مقدار میں آپ کے جسم کا خون ضائع ہو چکا تھا۔ لاہور، پنجاب کے جلسوں میں یہ بھی کہا:

''بھائی! ہماری آپ سے آخری ملاقات ہے''۔ (۱۵۰)

گھر میں کہتے کہ مجھے پیر کے روز سفر کرنا ہے۔ اس بیماری کی حالت میں بھی مطالعہ کتب کا سلسلہ جاری رہا۔ معالج اور اطباء اس سے منع کرتے تو کہتے:

''بھائی! یہ کتب بینی بذاتِ خود میرا مستقل مرض ہے اور لا علاج ہے۔'' (۱۵۱)

جہانگیر بادشاہ نے اپنی آخری تمنا کا اظہار کیا تھا ''کشمیر و دیگر ہیچ''۔ اسی طرح مولانا انور شاہ کشمیری کی آخری تمنا کشمیر ہی تھی کہ وہاں اپنے والد بزرگوار معظم شاہؒ اور دیگر عزیز و اقارب سے ملیں اور موافق آب و ہوا میں علاج بھی جاری رکھیں نیز فتنۂ قادیانی کے سد

باب کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے آخری ایام میں کشمیری عوام کے فوائد کے لیے فارسی زبان میں کتاب ''خاتم النبیینؐ'' بھی لکھی۔۲۳/صفر ۱۳۵۰ھ میں آخری بار کشمیر گئے، دوران قیام سوپور، بارہ مولہ اور لولاب میں وعظ کئے۔

آخر کار ۲/صفر ۱۳۵۲ھ بروز اتوار عصر سے پہلے قضائے حاجت کے لیے گئے، خون بڑی مقدار میں جسم سے خارج ہوگیا۔عصر کے بعد دارالعلوم کے طلباء اور قاری محمد طیب مہتمم مدرسہ عیادت کے لیے آئے۔مغرب کی نماز آپ نے چار پائی پر ادا کی۔عصر و مغرب کے درمیان بیماری کی شدت بڑھتی رہی، مغرب کے بعد نزع کی کیفیت طاری ہوگئی۔آپ مضطربانہ کلمہ سے بار بار پانی مانگتے اور اسی پانی سے انگلیاں تر کر کے کبھی چہرہ اور کبھی سینہ پر ملتے۔جیسے جیسے رات گذرتی گئی آپ کا اضطراب بڑھتا گیا آخر ۳/صفر المظفر ۱۳۵۲ھ/ ۲۹/مئی ۱۹۳۳ء کو (۱۵۲) یہ عظیم محدّث، محبّ اسلام، عاشقِ رسول، محافظِ ختم نبوت، مفسرِ قرآن، مدبر و مفکر اور شعر و سخن کا یہ آفتاب عالم تاب، عرصہ دراز تک نہ صرف ارض پاک و ہند بلکہ سارے عالم اسلام کو اپنی تابانیوں سے منور کرنے کے بعد ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر افق عدم میں غروب ہوگیا، بزم علم و ادب میں خاک اڑنے لگی، دیوبند کے درودیوار چپکے چپکے آنسو بہا رہے تھے، لوگوں نے مرثیے کہے۔مولانا انور شاہ کشمیری کی موت سارے اہل علم کے لیے ایک جانکاہ حادثہ قرار پائی۔مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے اپنے محبوب رہنما کی نمازِ جنازہ ادا کی اور دیوبند میں عیدگاہ کے قریب بیر کے باغوں کے جھنڈ تلے قلب محزوں اور چشم پرنم کے ساتھ علم و عمل کے اس جنازے کو سپرد خاک کیا۔وفات کے وقت آپ کی عمر اکسٹھ برس کی تھی:

''رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم''۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''قدیم قبرستان سے ہٹ کر کچھ فاصلہ پر عیدگاہ کے قریب ذہبیٔ عصر، حافظ حدیث، نمونہ سلف استاد المحترم مولانا محمد انور شاہؒ کا مزار ہے۔''(۱۵۳)

آخری آرام گاہ

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کو عید گاہ دیوبند سے متصل ایک قطعہ زمین میں دفن کیا گیا۔ اس زمین پر آپ کی سب سے پہلی قبر تھی۔ دیوبند میں آپ کی بڑی صاحبزادی عابدہ خاتون وہیں دفن ہوئیں۔ دیوبند میں چند مخصوص معتقدین کی قبریں بھی اسی جگہ پر ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے محمد اکبر شاہ آپ کے برادرِ نسبتی حکیم محفوظ علیؒ، مولانا کشمیریؒ کی اہلیہ، آپ کے بیٹے انظر شاہ کی پہلی بیوی اسی قطعہ زمین میں دفن ہیں۔

وفات کے چند روز بعد مولانا حفظ الرحمان دہلی سے لوح مزار تیار کرا کے لائے۔ الفاظ یہ ہیں:

> "مرقد مبارک و منور حضرت رئیس الحکماء و المتکلمین خاتم الفقہاء والمحدثین شیخ الاسلام مولانا السید محمدانور شاہ کہ بتاریخ ۳/صفر ۱۳۵۲ھ بوقت نصف شب از دارالفنا بسوئے دارالبقاء رحلت فرمود"

بعد میں آپ کے شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں نے مزار پر ایک حجرہ کی تعمیر کی۔ اب وہ حجرہ شکستہ حالت میں موجود ہے۔ (۱۵۴)

مولانا کشمیری کی وفات پر ہمہ گیر ماتم

وفات کے اگلے روز برصغیر پاک وہند کے مسلم اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ علامہ مرحوم کے سانحۂ وفات کی خبریں شائع کیں۔ دینی علمی رسالوں نے ماتم کیا۔ تعزیتی اجلاس ہوئے، قرآن خوانیاں ہوئیں، انجمنوں نے قرار دادیں پاس کیں۔ ہزاروں کی تعداد میں قرآنِ مجید ختم کر کے مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا۔ آپ کے وصال پر برصغیر کے علمی حلقوں میں جس قدر حزن وملال پایا گیا۔ اس کا اندازہ ان تعزیتی جلسوں سے کیا جا سکتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں آپ کی وفات پر منعقد ہوئے۔

لاہور: سب سے پہلا تعزیتی جلسہ لاہور کا ہے جس میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اس شعر کے

ساتھ تقریر شروع کی:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پھر آنسو بہاتے ہوئے کہا:

''اسلام کی ادھر پانچ سو سالہ تاریخ مولانا انور شاہ کشمیری کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔'' (۱۵۵)

ڈابھیل: دوسرا تعزیتی جلسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا ہے جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''حضرت شاہ صاحب کی وفات سے تم لوگ یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم جیسے پڑھانے والے یتیم ہوگئے ہیں''۔ (۱۵۶)

دیوبند: تیسرا جلسہ ۶/صفر ۱۳۵۲ھ کو دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث کے ہال میں ہوا جس میں اردو، فارسی، عربی، پشتو اور بنگالی میں سترہ، اٹھارہ قصیدے پڑھے گئے۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''اسلام کا مقصد مرحومین کے غموں کو تازہ کرنا نہیں بلکہ ان کے اسوہ کو مشعل راہ بنانا ہے۔ ان کے لیے دعاءِ خیر کرنا ہے۔ قدرت انھیں بعض ایسے ممتاز کمالات کا مالک بنا دیتی ہے کہ ان کی نظیر ان کے اقران ہی میں نہیں بلکہ پچھلوں میں بھی کم ملتی ہے۔ وہ ایک چلتا پھرتا اور بولتا ہوا کتب خانہ تھے۔ اخلاقِ حسنہ اور تقوی وطہارت ابتداء ہی سے ان کا شعار تھا۔'' (۱۵۷)

ان کے علاوہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی تعزیتی اجلاس ہوئے۔

ویلور: مولوی عبدالرحیم نے جامعہ باقیات الصالحات کو بند کرکے ایصال ثواب کے لیے ایک مجلس منعقد کی جس میں قرآن خوانی ہوئی۔ (۱۵۸)

ضلع پوری: مدرسہ نوریہ سردھا پور ضلع پوری میں لوگ جمع ہوئے، تلاوت قرآن کے بعد ایصال ثواب کیا گیا۔

رانچی: مولانا محمد عنایت نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے اوصاف وکمال پر تقریر کی اور اس جلسہ میں ایک قرارداد بھی منظور ہوئی۔ (۱۵۹)

جامعہ محمدی شریف ۱،۲ جھنگ: مسجد محمدی میں جلسہ عام کیا گیا۔ ایصال ثواب کے لیے پہلے دن دو قرآن مجید ختم کر کے ایصال ثواب کیا۔ دوسرے دن ۹ مرتبہ قرآن کا ختم کیا گیا اور کئی ہزار کلمہ شریف کا ورد کیا گیا۔

جمعیۃ علماء کشمیر: کشمیر میں ۳۱/ مئی ۱۹۳۳ء کو بدھ کے دن گیارہ بجے مولوی سید محفوظ علی نے میر واعظ کے نام تار بھیج کر آپ کی وفات کی اطلاع دی، جس کے پہنچتے ہی وہاں صف ماتم بچھ گئی۔

بنگال: جامعہ یونسیہ ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ کو بند کر کے مولانا انور شاہ صاحب کی وفات پر اظہار تأسف وغم اور ایصالِ ثواب کیا گیا۔ نمازِ ظہر کے بعد تین ختم قرآن مجید کر کے آپ کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

دہلی: دہلی میں علماء وطلبہ کے جلسۂ تعزیت کے موقع پر مولانا سعید احمدؒ ناظم جمعیت علما ہند نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"آج ہم نے ایک مکمل لائبریری کو سپرد خاک کر دیا"۔ اسی طرح سہارنپور، پشاور، میرٹھ، کھتور میں بھی آپ کی وفات پر غم والم کا اظہار کیا گیا۔

انجمن سعادت بخارا و ترکستان کے تعزیتی اجلاس میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا گیا:

"محمد انور شاہ صاحب کی وفات پر اسلام کی مذہبی دنیا یتیم ہو گئی ہے۔"

۲۵/ اگست ۱۹۳۳ء کو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں طے پایا کہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کی علمی یادگار "مجلس علمی" کے نام سے قائم کی جائے۔ یہ مجلس علمی دیوبند ہی میں قائم ہو۔ اس کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمانؒ ہوں گے اور اس کا سرمایہ پچاس ہزار روپیہ ہوگا۔

---

۱ اس جلسہ کی کارروائی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا محمد ذاکر مرحوم بانی جامعہ محمدی نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اخبار کو بھیجی۔ اس کی نقل راقم الحروف نے جامعہ محمدی کے دفتر سے حاصل کی۔

۲ ۲۰۰۹ء میں حکومتِ پنجاب نے چنیوٹ کو ضلع کا درجہ دیا ہے، جامعہ محمدی شریف اب اس ضلع میں داخل ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات پر مختلف لوگوں نے مرثیے لکھے جو اخبارات میں شائع ہوئے۔

۱۔ مولانا قاری محمد یامینؒ سہارنپوری مدرس تجوید جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا جو سہ روزہ الجمعیۃ دہلی میں ۲۶/صفر ۱۳۵۲ھ کو شائع ہوا۔

۲۔ جناب محمد علی ہندیؒ نے فارسی میں ۱۲۸ اشعار کا مرثیہ لکھا۔

۳۔ جناب صبوحیؒ نے اردو میں ۲۷ اشعار، جناب خلیق دہلویؒ نے ۲۱ اشعار اور منشی غلام محمد بسملؒ نے ۱۰ اشعار پر مشتمل مرثیے لکھے۔

۴۔ مولوی محمدؒ نے عربی میں ۱۳۱ اشعار کا مرثیہ تحریر کیا۔ [۱]

''معارف'' اعظم گڑھ کا خراجِ تحسین: سید سلیمان ندویؒ ان الفاظ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

> ''دین و دانش کا مہر انور ۲۹/مئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، مولانا محمد انور شاہؒ مرحوم کم سخن، وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علم و ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند، زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے''۔ (۱۶۰)

نوٹ:۔ ان تمام تعزیتی جلسوں کی کارروائیاں ''الجمعیۃ'' دہلی کے جولائی اور جون ۱۹۳۳ء کے اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔

باپ کے آنسو: مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی رحلت کے موقع پر آپ کے والد محمد معظم شاہ کو اطراف و اکناف سے بے شمار تعزیتی پیغام موصول ہوئے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے

---

[۱] یہ تمام مرثیے ''الجمعیۃ'' دہلی ۲۴/جون ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے۔

منتظمین نے بھی ایک تعزیت نامہ بھیجا جس کے جواب میں مولانا معظم شاہ لکھتے ہیں:

''میں ہمیشہ سے اس آرزو میں تھا کہ حضرت مرحوم میرا جنازہ پڑھائیں اور وقتاً فوقتاً فاتحہ سے یاد فرماتے رہیں گے۔ افسوس کہ خاکسار کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔''(۱۶۱)

تاریخ ہائے وفات مولانا محمد انور شاہ صاحب

۱۔ الجمعیت دہلی چہارشنبہ ۱۱/ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ/ ۵/ جولائی ۱۹۳۳ء

رفت وائے محمد انور شاہ۔ ۱۳۵۲ء

تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام مولانا السید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ

صد دریغ کہ شیخ حق آگاہ
محیی سنت رسول اللہ
آفتاب شماء فضل و کمال
بود او منبع علوم الہ
صدر پاکان و افضل اقران
گل باغ شہ ولی اللہ
آیتے بود اوز آیاتش
مقتدای زمان گرامی جاہ
آہ سوی جنان بفرط سرور
رفت و ما در بکا و نالہ و آہ
قدس اللہ سرہ دوما
ثم اولاہ مد خلاً برضاہ
سال رحلش چنان بگفت حسن

رفت وای محمد انور شاہ
(از بندہ عاصی محمد حسن مہتمم)
زینت الاسلام مہندر گڑھ
۲۔ سہ روزہ الجمعیہ دہلی ۲۸/ جولائی ۱۹۳۳ء

تاریخ ہائے وفات حضرت مولانا انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ

(از جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی)

مات الانور فی حب اللہ السمیع الاطہر (۱۳۵۲ھ)

دیگر

آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر وفات حضرت انور امام المسلمیں
آنچنان گشتیم اندر ہجرا و اندو ھگیں
کس مباداد رجہان ہرگز گرفتار این چنیں
رتبہ عالیش بنگر کردہ رحلت زین جہاں
چون قدم اندر جنان بہ نہاد روح آن فطیں
ازیں تاریخ زد عرش الٰہی این ندا
مرحبا اے آفتاب حلم و وقر و علم و د یں
(۱۳۵۲ھ)

از جناب قاضی محمد امین صاحب میموہاروی:

کیا دارالبقا کو دار فانی سے سفر اک دم
جناب شاہ انور شیخ کل بحر معارف نے
سن رحلت کی جب کی فکر منظر سے کہا فوراً
خدا کا نیک بندہ آگیا جنت میں ہاتف نے
(۱۳۵۲ھ)

اولاد و احفاد: مولانا انور شاہ کشمیری کی کل اولاد کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی بیٹی عابدہ خاتون تھیں جن کی شادی بجنور کے ایک رئیس مولانا شفیق الرحمانؒ سے ہوئی۔ پہلی ہی زچگی میں ۲۴/ ۲۵ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوگئی۔ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ منجھلے لڑکے مولانا اکبر شاہ آپ کی وفات کے بعد جلد ہی انتقال کر گئے۔ (۱۶۲)

اب دو لڑکے اور ایک لڑکی بقید حیات ہیں:

۱) حافظ محمد ازہر شاہ قیصر

۲) مولانا محمد انظر شاہ مسعودی

۳) محترمہ راشدہ خاتون

حافظ محمد ازہر شاہ قیصر ۱۳۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا انور شاہ کشمیری صاحب کی وفات کے وقت کم سن تھے۔ انھوں نے کسی قاعدے اور ڈھنگ سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ (۱۶۳) لیکن اپنے مطالعہ اور محنت سے قابلیت حاصل کی ہے، اردو زبان کی نظم و نثر اور اردو ادب و صحافت کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ ہے۔ ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے مدیر ہیں۔ ''حیاتِ انور'' کے نام سے مولانا انور شاہ کشمیری کی سوانح پر مختلف حضرات کے لکھے ہوئے مقالوں کو جمع کر کے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے۔ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ (۱۶۴) جن سے اولادیں ہوئیں۔ اب کچھ بچوں کے نانا بھی بن گئے ہیں۔ ان کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں:

۱) محمد اطہر

۲) محمد راحت

۳) محمد نسیم

۴) محمد وجاہت۔ (۱۶۵)

مولانا انظر شاہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور ناظم تعلیمات ہیں۔ دارالعلوم ہی سے تکمیل علوم کی ہے، ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ ''نقش دوام'' کے نام سے اپنے والد محترم کی مکمل سوانح تالیف کی ہے۔ آپ کی اولاد میں ایک لڑکا احمد میاں اور پانچ

لڑکیاں ہیں۔(۱۶۶)

راشدہ خاتون! مولانا انور شاہ کشمیری کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔اپنے والد کی وفات کے وقت بہت چھوٹی اور نوعمر تھیں۔والدہ نے اپنی یتیم بچی کی بڑے اچھے طریقے سے تربیت کی۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو مولانا انور شاہ صاحب کے ایک شاگرد سید احمد رضا بجنوری کے ساتھ رشتہ طے ہوا۔علامہ شبیر احمد عثمانی نے خطبہ نکاح پڑھا۔(۱۶۷) اس وقت ان کی عمر پچاس سال سے زائد ہے۔

مولانا احمد رضا مشہور اہل قلم ہیں۔صحیح بخاری کی اردو شرح ''انوار الباری'' کے نام سے لکھ رہے ہیں۔جس کی سترہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔دسمبر ۱۹۸۱ء میں راقم الحروف نے لاہور میں ان سے ملاقات بھی کی تھی۔استفسار پر انھوں نے بتلایا کہ اس شرح کی اتنی جلدیں اور ہوں گی۔

احمد رضا سے راشدہ خاتون کے ہاں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔لڑکوں کے نام یہ ہیں:

۱۔محمد رشید رضا ۲۔محمد اسعد رضا

۳۔محمد امجد رضا ۴۔محمد اسجد رضا

۵۔محمد اعبد رضا۔

بڑے لڑکے مولوی محمد رشید رضا نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تو مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کی غرض سے چلے گئے۔اس کے بعد قاہرہ یونیورسٹی، جامعہ ازہر سے سند حاصل کی۔(۱۶۸)

ذریعۂ معاش

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا سب سے بڑا ذریعہ معاش وہ مشاہرہ تھا جو مختلف دینی مدارس ان کی تعلیمی خدمات کے صلہ میں دیتے رہے۔ مدرسہ امینیہ دہلی سے بیس روپیہ (۲۰) ماہوار لیتے تھے۔دارالعلوم میں ابتداء میں [illegible] سال تک حسبۃً للہ درس دیتے رہے اور آپ کے خورونوش کا انتظام مہتمم مولانا محمد احمد نے اپنے ذمہ لیا تھا۔شادی کے بعد دارالعلوم سے

مشاہرہ لینا شروع کیا جو پچاس روپیہ سے بھی کم تھا۔ جب آپ صدر المدرسین مقرر ہوئے تو آپ کی تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار ہوگئی۔

شادی ہوئی تو مولانا محمد احمد نے اپنا ایک مکان آپ کو مستعار دیا تھا۔ بعد میں کرائے کے مکان میں رہنا شروع کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں محلہ خانقاہ میں آپ کے ایک متمول شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکیؒ نے رہائش کے لیے ایک مکان بنوادیا۔ یہی شاگرد آپ کی وقتاً فوقتاً مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیوہ کے لیے ایک مستقل رقم ماہانہ مقرر کردی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔

دارالعلوم سے مستعفی ہوکر ڈابھیل چلے گئے تو وہاں سے پچھتر (۷۵) روپے مشاہرہ لینے لگے۔

بعض عقیدت مند تحائف بھی دیتے تھے لیکن یہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ معاشی طور پر قدرے تنگ دست ہی رہے لیکن اپنی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے کسی کے دست نگر نہیں ہوئے، کسی سے قرض نہیں اٹھایا۔ سادگی ہی میں اپنی عظمت سمجھی۔

وفات ہوئی تو تجہیز و تکفین اور تدفین کے تمام اخراجات ان کی بیوہ نے اپنے زیورات فروخت کرکے ادا کئے۔

ترکہ میں نہ زمین چھوڑی نہ جائیداد اور نہ پسماندگان کے لیے کوئی مستقل ذریعہ معاش۔ صرف نادر اور قیمتی کتب کا ایک ذخیرہ چھوڑا جو بعد میں مجلس علمی ڈابھیل کو منتقل کر دیا گیا۔

پنجاب کے معتقدین اور مخلص شاگردوں نے ایک بڑی رقم جمع کرنے اور جائیداد خرید کر اہل و عیال کے لیے گزر اوقات کا منصوبہ بنایا جسے ڈاکٹر اقبالؒ نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ:

> ''شاہ صاحب جیسے فقیر غیور کی روح کو اس طرح کے اقدامات سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔'' (۱۶۹)

حوالہ جات

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند (عربی ادب) ج۲ ص۳۹
۲۔ موج کوثر ص۴۷
۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص۴۵۰، ۵۷۰
۴۔ حیات شاہ ص۴۰۲
۵۔ حیات شبلی ص۴۰۳
۶۔ کفار الملحدین ص۱۶۲ و کشف الستر ص۹۸ و نیل الفرقدین ص۱۴۵
۷۔ الانور ص۲۹۱
۸۔ نقش دوام ص۲۵
۹۔ الانور ص۴۰
۱۰۔ آئینہ کشمیر ص۴۱
۱۱۔ ارمغان حجاز ص۳۴
۱۲۔ الانور ص۵۹
۱۳۔ الانور ص۴۰
۱۴۔ الانور ص۴۲
۱۵۔ مکتوب مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ ۷/اکتوبر ۱۹۸۱ء
۱۶۔ الانور ص۴۵
۱۷۔ ماخوذ از آئینہ کشمیر ص۴
۱۸۔ نقش دوام ص۴۵
۱۹۔ نقش دوام ص۲۰

۲۰۔ آئینہ کشمیر ص ۱۷۰

۲۱۔ آئینہ کشمیر ص ۱۷۶

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً ص ۱۷۷

۲۴۔ الانور ص ۲۰۶

۲۵۔ نفحۃ العنبر ص ۲

۲۶۔ نقش دوام ص ۲۶

۲۷۔ الانور ص ۴۳

۲۸۔ نقش دوام ص ۲۶

۲۹۔ نیل الفرقدین ص ۱۴۵،
واکفار الملحدین ص ۱۴۲، کشف الستر ص ۹۸

۳۰۔ تاریخ اقوام کشمیر ج ۲ ص ۲۰۹

۳۱۔ انوار الباری جلد دوم ص ۲۳۷

۳۲۔ انٹرویو از مولانا احمد رضا بجنوری دسمبر ۱۹۸۱ء

۳۳۔ الانور ص ۱۳۷

۳۴۔ الانور ص ۱۳۷

۳۵۔ ایضاً ص ۱۵۷

۳۶۔ تاریخ اقوام کشمیر ج ۲ ص ۲۰۶

۳۷۔ تاریخ اقوام کشمیر ج ۲ ص ۲۰۷

۳۸۔ روئداد مدرسہ امینیہ سنہری مسجد دہلی ص ۱۰

۳۹۔ البلاغ تعلیمی نمبر بمبئی ص ۲۸۲

۴۰۔ ملفوظات وکمالات اشرفیہ ص ۷۰

۴۱۔ الانور ص ۳۶

۴۲۔ نقش دوام ص ۲۴

۴۳۔نقش دوام ص۲۴

۴۴۔مولانا انورشاہ۔حیات اور علمی کارنامے ۔ص۳۶

۴۵۔الانور ص۲۹۲

۴۶۔الانور ص۲۹۳

۴۷۔آئینہ حقیقت نما ج۱ ص۷۸

۴۸۔ایضاً ص۷۹

۴۹۔الانور ص۳۲

۵۰۔تاریخ اقوام کشمیر ج۲ ص۲۴۸

۵۱۔الانور ص۱۸۷

۵۲۔تاریخ اقوام کشمیر ج ۲ ص۳۴۸

۵۳۔الانور ص۱۸۷

۵۴۔معارف ستمبر ۱۹۶۷ء ص۱۸۳

۵۵۔الانور ص۳۰

۵۶۔نفحۃ العنبر ص۲

۵۷۔مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص۱۳

۵۸۔الانور ص۶۳

۵۹۔مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص۱۱

۶۰۔نفحۃ العنبر ص۲

۶۱۔ایضاً

۶۲۔الانور ص۶۴

۶۳۔ایضاً

۶۴۔مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص۱۱

۶۵۔نفحۃ العنبر ص۲۴

۶۶۔الانور ص۶۸

۶۷۔ نقش دوام ص ۲۷

۶۸۔ الانور ص ۷۱

۶۹۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۴

۷۰۔ الانور ص ۶۱

۷۱۔ ایضاً

۷۲۔ مولانا انور ۔ شاہ حیات اور علمی کارنامے ۔ ص ۴۱

۷۳۔ الانور ص ۸۶

۷۴۔ حیات انور ج ۱ ص ۲۷۴

۷۵۔ الانور ص ۹۴

۷۶۔ حیات انور ج ۱ ص ۲۷۵

۷۷۔ الانور ص ۹۶

۷۸۔ معارف ستمبر ۱۹۶۷ء اعظم گڑھ

۷۹۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۵

۸۰۔ حیات انور ج ۱ ص ۲۷۶

۸۱۔ الانور ص ۹۶

۸۲۔ ایضاً ص ۱۰۱

۸۳۔ حیات انور ص ۱۸۳

۸۴۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۶

۸۵۔ ایضاً

۸۶۔ حیات انور ص ۲۷۷

۸۷۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۷

۸۸۔ ماخوذ از الانور ص ۱۱۹

۸۹۔ ایضاً ص ۱۱۹

۹۰۔ انٹرویو از مولانا محمد عبداللہ

۹۱۔ نفحۃ العنبر ص۹

۹۲۔ حیات انور ج ۱ ص۱۲

۹۳۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص۱۸

۹۴۔ انوار انوری ص۱۵

۹۵۔ انوار انوری ص۱۶

۹۶۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۱۸

۹۷۔ نفحۃ العنبر ص۹

۹۸۔ الانور ص۱۳۹

۹۹۔ ایضاً ص۱۴۰

۱۰۰۔ معارف ستمبر ۱۹۶۷ء اعظم گڑھ

۱۰۱۔ الانور ص۱۷۳

۱۰۲۔ نفحۃ العنبر ص۱۱

۱۰۳۔ نقش حیات ج ۱ ص۱۴۵

۱۰۴۔ ایضاً ص۱۴۷

۱۰۵۔ معارف ستمبر ۱۹۶۷ء اعظم گڑھ

۱۰۶۔ حیات انور ج ۱ ص۲۳۲

۱۰۷۔ معارف ستمبر ۱۹۶۷ء اعظم گڑھ

۱۰۸۔ الانور ص۱۵۸

۱۰۹۔ حیات انور ج ۱ ص۲۳۳

۱۱۰۔ معارف ستمبر ۱۹۶۷ء

۱۱۱۔ مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص۲۰

۱۱۲۔ الانور ص۱۷۳

۱۱۳۔ محدثین کی قوت حفظ تاریخ کی روشنی میں ص ۱۸۵

۱۱۴۔ الانور ص ۱۷۴

۱۱۵۔القاسم محرم الحرام ۱۳۲۶ھ

۱۱۶۔رپورٹ دربارہ تحقیق معاملات دارالعلوم ص ۴۴

۱۱۷۔انٹرویو از سید حافظ محمد نعمان صاحب

۱۱۸۔انٹرویو از مولوی محمد عبداللہ ملتانی

۱۱۹۔مکتوب از مولانا محمد چراغ ۷/اکتوبر ۱۹۸۱ء

۱۲۰۔انٹرویو از سید حافظ محمد نعمان صاحب

۱۲۱۔انقلاب ۱۶/ستمبر ۱۹۲۷ء

۱۲۲۔ایضاً

۱۲۳۔زمیندار ۹/رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ

۱۲۴۔ایضاً

۱۲۵۔مہاجر دیوبند ۱۴/جنوری ۱۹۲۸ء

۱۲۶۔ایضاً

۱۲۷۔ماخوذ از ہمدرد دہلی ۱۴/جنوری ۱۹۲۸ء ص ۱۸ تا ۲۰

۱۲۸۔ضمیمہ القاسم ص ۱۲

۱۲۹۔ضمیمہ القاسم ص ۱۸ تا ۲۰

۱۳۰۔ماخوذ از رپورٹ ص ۳۶

۱۳۱۔رپورٹ ص ۵۰

۱۳۲۔حیات انور ج ۱ ص ۲۸۲

۱۳۳۔ہفتہ وار مہاجر دیوبند ۲۱/مئی ۱۹۲۸ء

۱۳۴۔چٹان لاہور جنوری ۱۹۷۵ء

۱۳۵۔انٹرویو از مولانا محمد نافع جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ

۱۳۶۔الانور ص ۱۹۸

۱۳۷۔ملخصاً از ہفتہ وار مہاجر دیوبند ۷/جولائی ۱۹۲۸ء

۱۳۸۔سہ روزہ الجمعیۃ دہلی ۲۹/شعبان ۱۳۵۰ھ/۹/جنوری ۱۹۳۲ء

۱۳۹۔ایضاً ۲۵/شعبان ۱۳۵۱ھ

۱۴۰۔نطق انور ص ۸

۱۴۱۔جزاء الاحسان ص ۱۶

۱۴۲۔مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۲۱

۱۴۳۔مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ۲۱

۱۴۴۔انوار انوری ص ۱۱۹

۱۴۵۔ایضاً ص ۱۴۱

۱۴۶۔حیات انور ج ۱ ص ۳۰۸

۱۴۷۔ایضاً ص ۳۲۹

۱۴۸۔روئداد آسٹریلین جامع مسجد لاہور

۱۴۹۔اخبار مہاجر دیوبند ۱۴/نومبر ۱۹۲۸ء

۱۵۰۔نقش دوام ص ۴۸

۱۵۱۔الانور ص ۲۱۵

۱۵۲۔الانور ص ۲۲۱

۱۵۳۔نقوش و تاثرات ص ۳۷

۱۵۴۔نقش دوام ص ۷۱

۱۵۵۔دارالعلوم دیوبند مئی ۱۹۶۴ء ص ۴۰

۱۵۶۔الانور ص ۲۲۴

۱۵۷۔سہ روزہ الجمعیہ دہلی ۱۹/صفر ۱۳۵۲ھ /۱۳/جون ۱۹۳۳ء

۱۵۸۔ایضاً ۵/جولائی ۱۹۳۳ء

۱۵۹۔ایضاً

۱۶۰۔معارف ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

۱۶۱۔الانور ص ۲۲۶

۱۶۲۔الانور ص ۲۲۸

۱۶۳۔ایضاً ص ۲۳۹

۱۶۴۔نقش دوام ص ۴۲

۱۶۵۔الانور ص ۲۴۰

۱۶۶۔الانور ص ۲۴۱

۱۶۷۔ایضاً

۱۶۸۔ایضاً ص ۲۴۲

۱۶۹۔نقش دوام ص ۴۷

باب: ۳

شاہ صاحبؒ کا ذوقِ تفسیر

قرآن حکیم اور علماء

قرآن مجید فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ معارف وعلوم اور حقائق واسرار کا بحر مواج ہے اس میں احکام بھی ہیں، نفوس کی تربیت کے طریقے بھی ہیں، تہذیب اخلاق کی راہیں بھی متعین کی گئی ہیں اور قلوب وارواح کے تزکیہ کے علاج و معالجے بھی بتلائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نوادر و بدائع، خصائص و مزایا کی یہ کثرت ہے کہ انسان نہ ان کا شمار کر سکتا ہے اور نہ ان کی تعداد بیان کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مرحومہ کے اساطین علوم نے درہائے گرانمایہ کی نقاب کشائی میں عمریں صرف کر دیں۔ اور اس کے معارف و علوم کو معلوم کرنے میں پوری زندگیاں لگا دیں۔ اسرار و حقائق کے اس ذخار سمندر میں غواصی کی تو بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کیا۔ جواہر و لآلی، زمرد و یواقیت کو ترتیب و تنظیم کی حسین و دلآویز لڑی میں پرو دیا۔ اس سلسلہ میں علمائے امت کی خدمات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ انسانی عقل ان کے کارناموں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے اور اس دنیاوی زندگی کی تنگ مایہ فرصتوں میں ان کے علمی حوصلوں کی وسعت و فراخی حیرت خیز اور تعجب انگیز ہے۔

نامور مفسرین: ہم ان نامور مفسرین میں سے صرف چند کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں جنھوں نے قرآنی علوم کی تفسیر اور تشریح میں قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں:

۱) شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمان البخاری الحنفی (م۔ ۵۴۶ھ) نے جن کو صاحب ہدایہ کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہونے کا فخر و امتیاز حاصل ہے، قرآن کی تفسیر لکھی، تو ایک ہزار مجلدات تیار کر ڈالیں۔ (۱)

۲) شیخ ابو یوسف عبدالسلام بن محمد القزوینی (م۔۴۸۳ھ) نے "حدائق ذات بھجۃ" کے نام سے تفسیر لکھی تو پانچ سو یا تین سو جلدیں تیار ہوئیں۔

۳) امام محمد بن جریر الطبری (م۔۳۱۰ھ) نے علوم قرآنی کی طرف توجہ کی تو ان

کی تحقیقات تیس ہزار صفحات میں بھی نہ سما سکیں۔(۲) اس تفسیر کے بارے میں محمد حسین ذہبی لکھتے ہیں:

"یقع تفسیر ابن جریر فی ثلاثین جزاً من الحجم الکبیر" (۳)

۴) قاضی ابوبکر ابن العربی (م۔ ۴۶۸ھ) نے قرآن مجید کی تفسیر شروع کی تو اسی ہزار اوراق میں ان کی موشگافیاں پھیلتی چلی گئیں۔

۵) علامۂ اہل مغرب شیخ اکبر الطائی الاندلسی (م۔ ۶۲۸ھ) صاحب "فتوحاتِ مکیہ" نے صرف "سورۂ کہف" تک خامہ فرسائی کی۔ لیکن اس مختصر سی قلمکاری میں بھی ساٹھ ضخیم جلدیں آج امت کے ہاتھوں میں ہیں۔

۶) ابن نقیب (م۔ ۶۹۸ھ) نے الکتاب المبین کے اسرار و مزایا پر سے پردہ ہٹانا چاہا تو اسی جلدیں تیار ہو گئیں لیکن تکمیل کی تمنا دنیا سے ساتھ لے گئے۔

۷) ابوالقاسم اصفہانی (م۔ ۵۳۵ھ) اور شیخ شمس الدین ابوالمظفرؒ (م۔ ۶۵۴ھ) کی سعی و کوشش تیس تیس جلدوں میں سمیٹی جا سکیں۔

۸) شیخ مفضل بن سلمہ الحنفیؒ جو تیسری صدی ہجری کی ایک مشہور شخصیت ہیں ان کی تفسیر "ضیاء القلوب" بیس اجزاء سے بھی آگے نکلی۔

۹) مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ ابن ندیم نے ابوبکر محمد بن الحسن النقاش کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی "تفسیر کبیر" بارہ ہزار اوراق میں پھیلی ہوئی ہے۔(۴)

بہرحال اس مختصر سی فہرست سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ علماء امت نے تفسیری خدمات میں کس شغف و انہماک سے کام لیا ہے۔ اور کیا کیا خون جگر پی کر علوم و معارف کے درہائے نایاب کو بطونِ اوراق میں ودیعت کیا ہے لیکن "کل اناء یترشح بمافیه" "یعنی ہر برتن سے وہی نکلتا ہے جو اس میں ہوتا ہے" کے قاعدہ کے مطابق ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق تفسیر لکھی بلکہ لکھنے والے کا مذاق اور ان کا رنگ وطبیعت تصانیف میں نمایاں ہے۔

مفسرین کا ذوقِ تفسیر: ہر انسان کا ذوق دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے اور

وہ اپنے طبعی ذوق کی وجہ سے ہی مختلف چیزوں کی دریافت و تحقیق کرنا پسند کرتا ہے۔ اس طرح امت کے علماء نے بھی اپنے اپنے طبعی ذوق و میلان کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کی کوشش کی ہے۔

محدثین نے قرآن کو احادیث کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی تو روایات اور احادیث کی ترتیب کے اہتمام میں ابن جریر اور علامہ سیوطی نمایاں ہیں۔

فقہاء نے احکام کی جزئیات کو اصول پر منطبق کرنے کی جدو جہد کی تو اس جزء میں قرطبی کی موشگافیاں سب پر فائق نظر آئیں۔ وجوہِ اعراب، طرقِ ترکیب، ترکیب کے اسلوب پر ایسی سیر حاصل بحث کی کہ قرآن نحوی مسائل کا عجیب و غریب مجموعہ نظر آیا۔ زمخشری نے ''کشاف'' میں ادبی محاسن کا بیان، مقطعات و مطالع کا حسن، ایجاز و اطناب کی وجوہ، فصاحت و بلاغت کے دل آویز نکات پر پورے قرآن کو ڈھال دیا۔ متکلمین نے عقائد و کلام کے مباحث ذکر کیے تو امام رازی اس میدان میں سب پر فائق ہیں۔ قیاس کی ترکیب رسوم و حدود کے خشک اور غیر دلچسپ جھگڑے مناطقہ کی مرغوب غذا ہیں تو بو علی سینا نے سورۂ اخلاص کی تفسیر انھی لا طائل مباحث میں الجھا دی۔ طبعیات و فلکیات و عنصریات کے اجزاء پر گہری نظر ایک فلسفی کی ہی ہوتی ہے۔ طنطاوی جوہری نے انھی مضامین کو سمیٹا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم صرف اسرار کونیہ، بدائع عنصریہ اور غرائب طبعیہ سے بحث کرتا ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے انور شاہ کشمیری کی یہ تحقیق مقدمہ مشکلات القرآن میں نقل کی ہے کہ قرآن حکیم کی تفاسیر کی تعداد دو لاکھ[1] تک پہنچ چکی ہے۔

---

[1] دو لاکھ سے کثرت تعداد مراد ہے، اگر قرآن مجید کے متعلق تفاسیر تراجم اور دیگر علوم کے متعلق تالیفات و تصنیفات کو شمار کیا جائے تو واقعی تعداد ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں علمائے امت کی کوششوں کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں۔مگر پھر بھی قرآن کریم کے حقوق ادا کیے جانے کا دعویٰ ہرگز صحیح نہ ہوگا۔مولانا موصوف ابن ابی الدنیا کا قول اس مفہوم میں نقل کرتے ہیں۔کہ علوم قرآن ایک بحر ناپیدا کنار ہے، ذخار دریا ہے جس کے عمق و گہرائی کا علم نہیں۔(۵)

پاک وہند کے نامور مفسرین اور ان کی تفسیریں: برصغیر پاک و ہند کے علماء بھی قرآنی خدمات کو باحسن الوجوہ انجام دینے میں علماء عالم اسلام سے ہرگز پیچھے نہیں ہیں بلکہ بعض حیثیات سے ہندوستانی علماء کی اس سلسلہ میں کوششیں بڑی اہم اور ان کے آثر علوم بڑے گراں قیمت ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے پہلے بھی برصغیر پاک و ہند میں بہت سے علماء ہوئے ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیریں لکھنے میں خاطر خواہ کوششیں کیں اور کتاب الٰہی کے رموز و اسرار کو سمجھنے میں اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ان میں سے چند کے نام کے یہ ہیں:

ا۔علامہ شہاب الدین ابن شمس الدین دولت آبادی ثم دہلوی: برصغیر پاک و ہند کے جن ممتاز علماء میں سے سب سے پہلے فارسی زبان میں قرآنی علوم کو منتقل کرنے کی جدوجہد کی، وہ شہاب الدین ابن شمس الدین دولت آبادی ثم دہلوی ہیں۔آپ آٹھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے ہیں اور شیخ قاضی عبدالمقدر الشریحی الکندی کے شاگردوں میں ہیں۔آپ نے ''بحر مواج'' کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔(۶)

علی بن احمد المہائمیؒ (م۔۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء): شیخ علاء الدین ابوالحسن علی بن احمد المہائمی نے "تبصیر الرحمان و تیسیر المنان فی تفسیر القرآن " کے نام سے چار جلدوں میں قرآن حکیم کی عربی میں تفسیر لکھی ہے۔(۷) یہ تفسیر مصر سے شائع ہوئی ہے۔مصنف نے اس تفسیر میں ''ربط بین الآیات'' کے سلسلہ میں قابل قدر سعی و کاوش کی ہے اور بعض مباحث کو عالمانہ و محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

خواجہ حسین ناگوریؒ (م۔۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء): آپ نے نور النبی (یا نور الٰہی؟) کے نام سے قرآن مجید کے تیس پاروں کی الگ الگ تفسیر لکھی ہے جس میں حل تراکیب اور معانی

قرآن کو تفصیل کے ساتھ آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔(۸)

ابوالفضل خطیب گازرونی ؒ (م۔۹۵۹ھ/ ۱۵۵۵ء): آپ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے۔(۹)

محمد بن احمد میانجیؒ (م۔۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء): آپ نے "التفسیر المحمدی" مسمیٰ بہ " کاشف الحقائق " کے نام قرآن حکیم کی تفسیر لکھی جو قاموس الدقائق کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ صوفیانہ تفسیر ہے جس میں مفسر نے ربط بین الآیات، عقائد، عبادات اور اعجاز القرآن کے علاوہ لغوی اور نحوی مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ اس تفسیر کے نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔(۱۰)

ابوالفضل فیضیؒ (م۔۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء): عربی میں ان کی دلچسپ اور مایۂ ناز تصنیف ''سواطع الالہام''، قرآن مجید کی بے نقط تفسیر ہے۔(۱۱) اس پر شیخ محمد یعقوب صرفی (م۔۱۰۰۲ھ) نے بے نقط مفصل تقریظ لکھی ہے۔(۱۲)

فیضی نے یہ شاہکار دو سال کے قلیل عرصے میں شیخ منور الدین لاہوری کے تعاون سے مکمل کیا تھا۔ مفسر نے تمام تفسیر میں غیر منقوط الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اس نے متقدمین کی خوشہ چینی کی ہے۔ اس کی توجیہات زمخشری اور بیضاوی سے نہ تو مختلف ہیں اور نہ ان پر کوئی اضافہ ہے، اس لحاظ سے دوسرے ہندوستانی علماء جیسے علی المہائمیؒ، ثناء اللہؒ پانی پتی اور نواب صدیق حسن خان اس سے ہزار قدم آگے اور ہزار درجہ بلند ہیں۔(۱۳) اگرچہ فیضی اس جد و جہد میں لغویات کا بھی شکار ہوا ہے تاہم ایک خاص اور دشوار فن میں اس کی کوشش لائق ستائش ہے۔

ملا جیونؒ (م۔۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء): آپ نے "التفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات معروف بہ تفسیر احمدی" لکھی جو آیات احکام کی تشریح ہے۔(۱۴)

مولانا نور الدین احمد آبادیؒ (م۔ ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء): ان کی تصانیف میں سے "التفسیر النورانی للسبع المثانی" اور "التفسیر الربانی علی سورۃ البقرۃ" قابل ذکر ہیں۔(۱۵)

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م۔۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء): آپ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث

دہلویؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے ہیں۔ان کی تفسیر مظہری (بارہ جلدوں میں) بے حد مشہور ہے۔(۱۶) خصوصاً فقہی مباحث، جامعیت و تحقیق اور مدلل مباحث اس تفصیل کے ساتھ کسی اور تفسیر میں خال خال ہی نظر آئیں گے۔

نواب سید صدیق حسن خان بہادر قنوجیؒ (م۔۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء): انہوں نے "فتح البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے قرآن پاک کی دس جلدوں میں عربی تفسیر لکھی ہے۔شروع میں اصول تفسیر اور تاریخ تفسیر کے بارے میں ایک مفید مقدمہ بھی لکھا ہے۔یہ کتاب ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔(۱۷)

مولانا احمد رضا خان بریلوی: (م۔۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کی تفسیر قرآن پاک بھی قابل ذکر ہے۔(۱۸)

تراجم: مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے مقدمہ مشکلات القرآن میں لکھا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے قرآن پاک کے تراجم میں سب سے پہلا ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے۔ان کی یہ تحقیق قابل نظر ہے کیونکہ عہد تغلق کے مشہور عالم ابوبکر اسحاق بن تاج الدین ملتانی حنفی صوفی (م۔۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء) نے جواہر القرآن کا خلاصہ "فی بیان معانی القرآن" کے نام سے لکھا تھا جس میں بین السطور بعض اہم الفاظ کے معانی فارسی زبان میں بھی درج کئے تھے،علاوہ ازیں انہوں نے مفردات قرآن کے معانی فارسی میں بیان کر دیئے تھے،اگر اسے قرآن مجید کا پہلا ترجمہ کہا جائے تو بعید نہ ہوگا۔(۱۹)

شاید شیخ ابوبکر اسحاقؒ کے بعد برصغیر میں قرآن پاک کے تراجم میں پہلا مکمل اور باضابطہ ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م۔۱۱۷۳ھ) کا ہے۔آپ پاک و ہند کے علماء میں جس ممتاز مقام کے مالک ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔آپ کی متعدد تصانیف امت کے ہاتھوں میں موجود ہیں اور علوم حدیث کی اشاعت و ترویج کے سلسلہ میں آپ کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔شاہ صاحبؒ نے اس فارسی ترجمہ میں بڑے لطائف اور اسرار کو سمو دیا ہے اور اہم فوائد کا اضافہ کیا ہے۔انہوں نے ترجمہ کرتے وقت حشو و زوائد سے بھی محفوظ رہنے کی خاص کوشش کی ہے۔شاہ صاحب کا یہ ترجمہ اس لحاظ سے اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ جس زمانے میں برصغیر کے علماء کو غیر عربی میں قرآن پاک کے معانی بیان کرنے کی

ہمت نہیں ہورہی تھی، اسی زمانے میں آپ نے بڑی جرأت کے ساتھ مکمل قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ کردیا تھا جس کا نام انہوں نے ''فتح الرحمان'' رکھا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے حضرت عبدالقادرؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ اردو زبان میں کیا جس کی شہرت اور مقبولیت اس درجہ ہے کہ آج علماء امت کا دارومدار اسی ترجمہ پر ہے۔ یہ ترجمہ پورے کا پورا الہامی ہے اور مغزِ قرآن کو شگفتہ اور سلیس انداز میں اس خوبصورتی ونزاکت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ ترجمہ ''سہل ممتنع'' نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب ہی نے اپنے قلم سے فوائد بھی تحریر کئے ہیں۔ جن سے قرآن کو سمجھنے اور خصوصاً مترجم کی خصوصیات فی الترجمہ کو معلوم کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی اس ترجمہ کے متعلق رائے ہے کہ ''اگر کسی انسان کا کلام معجزہ ہوسکتا تو یہی ترجمہ فی الواقع ایک معجزہ ہوتا۔ امام العصر (مولانا انور شاہ صاحب) اس ترجمہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔''(۱۹)

شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے ''یہ تحت اللفظ ترجمہ ہیں''(۲۰) اور محاورہ کی رعایت سے مضامین بلیغ لب ولہجہ میں ادا کئے ہیں۔ مولانا محمد عبداللہ ملتانی نے انٹرویو میں راقم الحروف کو بتایا :

> ''مولانا انور شاہ کشمیری رمضان شریف میں شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمہ کا مطالعہ کیا کرتے تھے''۔(۲۱)

شاہ عبدالعزیز نے ''فتح العزیز'' یا ''تفسیر عزیزی'' کے نام سے بعض قرآنی اجزاء کی تفسیر لکھی ہے۔ یہ تفسیر قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کے فارسی میں لکھی گئی ہے۔ (۲۲) علوم وتحقیقات میں وہ ندرت اختیار کی کہ عقلِ انسانی ان کی جامعیت ونابغیت پر دنگ رہ جاتی ہے۔ درآں حالیکہ شاہ صاحب نے اس تصنیف کے دوران دیگر تفاسیر کا مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ بغیر مراجعت کے اپنی تحقیقات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا بنوریؒ لکھتے ہیں :

> ''علامہ کشمیری کہتے تھے کہ اگر اسی انداز میں یہ تفسیر مکمل ہوجاتی تو علمائے اسلام

کی گردنوں پر سے طاقتِ بشری کے مطابق، قرآنی علوم کو بیان کرنے اور ان کی اشاعت کا فریضہ ادا ہو جاتا۔" (۲۳)

پھر تقریباً ۹۰ یا ۱۰۰ سال کے طویل عرصے کے بعد حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے بارہ جلدوں میں قرآن حکیم کی اردو میں تفسیر لکھی۔ موصوف نے اس تفسیر کی تیاری میں تفاسیر کی مہمات اور امہات کتب کا مطالعہ کر کے مضامین کی تلخیص کی ہے۔ تعلیم یافتہ اذہان میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا بھی ازالہ کیا ہے۔ اُردو دان طبقہ اور طلبہ وفضلاء کی جماعت اس کے مطالعہ سے کافی روشنی پا سکتی ہے۔ ایک دفعہ اتفاق سے مولانا تھانویؒ کی یہ تفسیر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اٹھا کر دیکھی تو کہا:

"میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لیے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔" (۲۴)

اس کے بعد مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور فوائد بھی لکھے جو کہ اپنی جگہ نافع اور مفید ہیں۔ مولانا شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور اس پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی ہیں۔ جس کے متعلق مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ "بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ علوم قرآنی کو اردو میں سمیٹ لینے کا اتنا خوبصورت اور مکمل سلیقہ شاید ہی امت میں کسی کو میسر آیا ہو بلکہ بعض مباحث پر تو مولانا مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا عشر عشیر بھی مجلدات میں نہیں مل سکتا۔" (۲۵)

یہ تفاسیر وتراجم کے وہ مجموعے ہیں جو اہل حق کے مسلک کے مطابق اور ان کے مکتب خیال کے ہمنوا ہیں۔ ان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مرزا حیرت اور محمد علی قادیانی کے ترجمے مخدوش اور مشتبہ ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے بنیادی عقائد سے انحراف اور اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے مترادف ہیں۔

بعض مفسرین مثلاً سر سید احمد خان اور حکیم احمد حسن امروہوی نے صریحاً قرآنی مضامین میں تحریف سے کام لیا ہے، قرآنی مراد ومنشاء کو اپنے محل سے ہٹانے کی کوششیں ان کی طرف سے بے حد افسوس ناک ہیں۔

علامہ انور شاہ صاحبؒ کی تفسیری خدمات

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی علمی شہرت تو بے نظیر قوتِ حافظہ اور یادداشت کی غیر معمولی صلاحیت کی بنیادوں پر ہے۔ رہا اہل علم کا طبقہ تو وہ انھیں ایک بے نظیر محدث اور فنِ حدیث پر کامل دستگاہ رکھنے والا عبقری انسان سمجھتا ہے۔ خال خال دیدہ ور ایسے بھی موجود ہیں جو موصوف کی جامعیت اور ہمہ جہتی پر اطلاع رکھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مختلف علوم و فنون پر ان کی تحقیقات وانکشافات کے نمونے پیش کر دیئے جائیں تاکہ ان کی حیثیت اور ان کا مقام معلوم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہم ابتداء قرآن حکیم سے کرتے ہیں کہ کائنات ایمانی میں سب سے پہلی کتاب جہاں سے ایمانیات کی بسم اللہ ہوتی ہے اور حکیم وعلیم کا کلام ہونے پر یہ یقیناً اس کی مستحق ہے کہ اسے ہر ایک پر مقدم رکھا جائے۔

مولانا انظر شاہ مسعودی لکھتے ہیں کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جن علوم وفنون میں اپنی حذاقت کو تسلیم کرایا ہے ان میں ایک اعجاز القرآن کا فن بھی ہے۔ (۲۶)

<u>اعجاز القرآن:</u> تفسیر کا ایک مشکل پہلو اعجاز القرآن بھی ہے جس کی طرف آپ نے خاص توجہ کی۔ شیخ عبدالقادر جرجانی اور علامہ زمخشری کی علومِ قرآن کے سلسلہ میں کی گئی جدوجہد کو اکثر علماء نے تسلیم کیا جیسے شمس تبریز خان آروری نے نقل کیا ہے کہ "لم یدر اعجاز القرآن الا الا عرجان احدھما من زمخشر وثا نیھما من جرجان"۔ (۲۷) یعنی علامہ کشمیریؒ یہ مقولہ نقل کرنے کے بعد اپنے متعلق بھی کہا کرتے تھے کہ "أنا ثالثھما" یعنی اعجاز القرآن کو سمجھنے والی تیسری شخصیت میری ہے۔ (۲۸) اس سے معلوم ہوا کہ آپ اعجاز القرآن کی دریافت میں زمخشری و جرجانی کے ہم پلہ تھے۔ مولانا آروری بیان کرتے ہیں کہ شاہ صاحب بتاتے تھے کہ قرآن کا اعجاز بہت سی یقینی باتوں سے زیادہ یقینی ہے اور میں بلاغت میں کسی کا مقلد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہبی طور پر اس سے مجھے نوازا ہے۔ (۲۹)

اس سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ قرآن کو اس کے اسلوب کی فطری سادگی اور واقعیت میں دیکھنا اور لفظی اعجاز سے زیادہ معنوی اور مقصدی اعجاز پر زور دینا چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے وہ ابن حجرؒ کے شاگرد ابراہیم بن عمر بقاعی (م۔ ۹۸۵ھ) کی تفسیر "نـــظـــم

الدررفی تناسب الآی والسور" کوتمام تفسیروں پر ترجیح دیتے تھےاور کہتے تھے کہ انھوں نے امکانی طاقت صرف کردی ہے۔ مکتبہ خدیویہ مصر سے اس کی نقل حاصل کرنا چاہتے تھے۔(۳۰)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ آپ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ایک مرتبہ طلبہ کے سامنے کہا:

"کاش! میرا یہ وقت دین کے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری کام میں صرف ہوتا۔"(۳۱)

ان ضروری کاموں میں وہ مقدم تفسیر قرآن کو سمجھتے تھے،اسی لیے اخیر عمر میں قرآن کی طرف توجہ بڑھ گئی تھی جس کا ثمرہ مشکلات القرآن کی شکل میں موجود ہے۔ مولانا بنوریؒ تحریر کرتے ہیں:

"میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ قرآن کے حسن تعبیر پر وجد وشوق میں جھومنے لگتے تھے۔"(۳۲)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے قلم بلاغت رقم اور خداداد حافظہ سے کون سا عالم واقف نہیں۔ قرآنی خدمت کو ایک مقدس فریضہ جان کر انہوں نے "مشکلات القرآن" کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے۔ جس میں قرآن حکیم کے مشکل مقامات پر بصیرت افروز بحث کی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ایک مقدمہ اس پر لکھا ہے جو بذات خود ایک تفسیری خدمت بن گیا ہے۔(۳۳)

آپ اپنی ڈائری میں مختلف علوم کا حاصل مطالعہ اور تأثرات لکھا کرتے تھے، اس طرح مشکل آیات،مشکل احادیث،حقائق واسرار تصوف اور حنفیہ کے مؤیدات پر نادر نکتے جمع ہوگئے تھے۔ مگر اخیر عمر میں آپ کی توجہ قرآن حکیم کی طرف بڑھ گئی تو کہا کرتے تھے۔"مشکلات حدیث سے زیادہ مشکلات قرآن توجہ کے طالب ہیں۔"(۳۴)

ماہِ رمضان میں آپ کی عادت تھی کہ صبح سے شام تک نہایت غور وفکر کے ساتھ قرآن کے صرف ایک پارہ کی تلاوت کرتے تھے اور اس طرح رمضان میں قرآن ختم کرتے۔ خود بیان کرتے تھے کہ "میں رمضان المبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر وتفکر کے

ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا، جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان مبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اسی دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔" (۳۵)

حافظ قرآن نہ تھے: یہ بات امر واقعہ ہے کہ علوم قرآنیہ پر وسیع نظر رکھنے کے باوجود مولانا انور شاہ کشمیریؒ حافظ قرآن نہ تھے۔ (۳۶) مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک دن مولانا کشمیری سے پوچھا کہ "حضرت! آپ کا حافظہ تو قرآن کریم کو چند دنوں میں حفظ کر سکتا تھا پھر کیا بات ہے کہ آپ نے حفظ نہ کیا۔" آپ نے جواب دیا۔ "قسمت، بخت" (۳۷)

مولوی جمیل الدین میرٹھیؒ ریٹائرڈ رجسٹرار جامعہ عباسیہ بہاول پور بیان کرتے ہیں کہ کسی نے آپ سے یہی سوال کیا تھا تو جواب میں کہا کہ "بچپن میں تو والدین نے اس طرف متوجہ نہ کیا اب یہ ممکن نہ رہا اس لیے کہ قرآن کریم کی جو آیت پڑھتا ہوں، معارفِ قرآنیہ کا ایک طوفان سا امنڈ آتا ہے۔ الفاظ ذہن سے نکل جاتے ہیں اور معانی و مطالب کی وادیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔"

آپ کا معمول تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور اس کے معارف و علوم دقائق و نکات میں دیر تک گم رہتے، بسا اوقات تو قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی زیادہ کا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ دوران مطالعہ جو خاص اور الہامی مضامین قلب پر وارد ہوتے ان کو قلم بند کر لیا جاتا یا آیات متعلقہ کی صحیح اور استوار تفسیر یا کوئی بلند پایہ تحقیق متداول اور غیر متداول تفاسیر کے ذخیرہ میں نظر آتی تو اس کی نشان دہی کرتے، اس طرح ایک قیمتی ذخیرے کا اضافہ ہو گیا۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ آپ کے بیان کو "مقدمہ مشکلات القرآن" میں نقل کرتے ہیں کہ:

> " اگر کوئی آدمی صحیح بصیرت کے ساتھ احادیث میں غور و فکر کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ اکثر و بیشتر احادیث قرآن کے اجمال کا بیان اور اس کے اشارات کی توضیحات ہیں بلکہ کثرت سے ایسی احادیث ہیں جن میں تعبیرات قرآنی کے لطیف اشارے ملتے ہیں اس نقطہ نظر سے مطالعہ کے لیے سیوطی کی " درمنثور"

بہت مفید کتاب ہے۔"

مولانا انظر شاہ نے مولانا کشمیریؒ کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ:

"قرآن کی مراد اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گی جب تک کہ حدیث کی طرف رجوع نہ کیا جائے بلکہ احادیث کو اس کی شرح نہ بنایا جائے۔"

مولانا انور شاہ صاحب نے کوئی مستقل تفسیر نہیں لکھی مگر "فیض الباری" اور "مشکلات القرآن" میں قرآنی مشکلات کے سلسلہ میں جو اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ان کا تفرد پر مبنی ایک بے نظیر کارنامہ ہے۔

علمی جامعیت: مولانا احمد رضا بجنوریؒ نے ایک بالمشافہ ملاقات کے دوران بتایا کہ آپ کی جامعیت علوم وفنون کو بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اکثر اہل علم نے تسلیم کیا ہے۔ اکثر ہم عصر علماء نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے۔ علامہ شبیر احمدؒ عثمانی تفسیری فوائد اور شرح مسلم لکھنے کے دور میں شاہ صاحب کے پاس آ کر مسائل اور مشکلات کو حل کرواتے تھے۔ (۳۸)

آپ کے علوم میں بڑی عمومیت، جامعیت اور گہرائی تھی۔ آخری دور میں قرآن حکیم کے ساتھ آپ کا شغفِ تفسیر اور متعلقہ علوم میں انہماک بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ (۳۹)

تفسیری ذوق کے نمونے: اب ہم مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تفسیری خدمات میں سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی مثال: وما ارسلنا من قبلك من رسو ل الاّ اذا تمنّى القى الشيطان فى امنيتهج فينسخ الله ما يلقى الشيطان ثم يحكم الله آيتهطو الله عليم حكيم۔ (۴۰)

یہ آیت مبہمات آیات میں سے ہے۔ مفسرین قدیم وجدید نے اس کی تفسیر میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق شرحیں بیان کی ہیں۔ بحث طلب امور یہ ہیں:

۱) تمنّی کے معنی آرزو کرنا ہے یا پڑھنا۔

۲) امنیّہ سے آرزو اور خواہش مراد ہے یا کلام

۳) القاء الشیطان سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے یا دخل اندازی یا مزاحمت اور احکام آیات سے کیا مقصود ہے؟۔

قاضی بیضاوی نے تین اقوال اس کی تفسیر میں نقل کئے ہیں جن میں سے دو میں

غرانیق مراد لیا ہے۔

اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی مجلس میں بیٹھے تھے، آپ نے ان کو سورۃ النجم سنائی تو "افر ئیتم اللّٰت و العزّی و منوۃ الثالثۃ الأخریٰ ۔" (۴۱) کے بعد آپ کی زبان مبارک سے جلدی سے یہ الفاظ نکل گئے: "تلك الفرانیق العلی۔" یا شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر کہہ دیئے۔ (۴۲)

یہ قصہ روایت کے اعتبار سے ساقط الاعتبار اور مفہوم کے لحاظ سے مردود ہے۔ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو صاحبِ وحی کی عظمت اور وحی الٰہی کی حجیت مجروح ومشکوک ہوکر رہ جاتی ہے حالانکہ سارے دین کی بنیاد انھی پر ہے۔ علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ یہ قصہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے اور قاضی صاحب نے خود بھی تحریر کیا ہے کہ کسی صحیح محدث نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ (۴۳)

قاضی بیضاویؒ کے تیسرے قول کا جسے انھوں نے مرجح قرار دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر رسول اور ہر نبی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ جب کوئی انھوں نے آرزو کی تو شیطان ان کی آرزو میں وہ باتیں ڈال دیتا تھا جن سے وہ دنیا میں الجھ جائیں۔ (اذازوّد فی نفسہ ما یھواہ ألقی الشیطان فی تشھیہ ما یوحب اشتغالہ بالدنیا)۔ (۴۴) پھر اللہ تعالیٰ اس القاء الشیطان کو نابود کردیتا تھا۔ اس تفسیر میں انھوں نے تمنی سے آرزو کرنا، امنیہ سے آرزو اور القاء الشطان سے شیطان کا اس میں آمیزش کرنا مراد لیا ہے۔ (۴۵)

یہ تفسیر اگرچہ عصمتِ نبوت کی قادح نہیں مگر عظمت کے منافی ہے۔ علامہ جلال الدین محلیؒ اور حافظ عماد الدین بن کثیرؒ نے بھی ان ہزلیات کو اپنی تفسیروں میں ذکر کیا ہے اگرچہ حافظ موصوفؒ نے بعد میں لکھا ہے کہ:

> "ولکنھا من طریق کلھا مرسلۃ ولم ارھا سندۃً من وجہ صحیح۔" (۴۶)

برصغیر پاک وہند کے مشہور مفسرین ومترجمین میں سے کسی نے اپنے ترجمہ وتفسیر کی بنیاد ان لغویات پر نہیں رکھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ونہ فرستادیم پیش از تو ہیچ فرستادہ ونہ ہیچ صاحب وحی الآ چوں آرزوے بخاطر بست بے فگند شیطان چیزے در آرزوے وے۔ پس دور می کند خدا آنچہ شیطان انداختہ است بازمحکم می کند خدا آیات خود را۔ و خدا دانا و با حکمت است''۔ اس پر حاشیہ ہے۔مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخواب دیدند کہ ہجرت کردہ اند ہر مینے کہ نخل بسیار دارد۔ پس وہم بجانب یمامہ و ہجر رفت و در نفس الامر مدینہ بود۔''(۴۷)

مذکورہ بالا تفسیر میں القاء الشیطان سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھتے تو کبھی کبھی اپنی طبیعت کے میلان کی بنا پر اس کی تعبیر میں مقام یا وقت کے تعین میں مسامحت ہو جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے یا اس واقع کے ظہور کے ذریعے اس مسامحت کو دور کر دیا جاتا تھا۔

<u>مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تفسیر:</u> اس آیت کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ:

''انبیاء کرام کی تمنّی سے مراد وہ آرزو ہے جو ان کے دلوں میں اپنی امتوں کے بارے میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش! سب ہی ایمان لے آتے اور القاء الشیطان سے مراد شیطان کا ان کی امت کے لوگوں کو اغوا کرنا اور ایمان کے راستہ سے روکنا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ ان کی آرزو کے مطابق ایمان قبول نہیں کرتے اور ایک بلیغ محاورہ ہے کہا جاتا ہے'' فلان ألقی فی امنیتی'' یعنی فلاں میرے اور میری آرزو کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تبارک تعالیٰ جو اسے منظور ہوتا ہے، کرتا ہے۔ جن کی تقدیر میں ایمان لانا ہوتا ہے، ایمان لاتے ہیں اور شیطان ان کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہوتا، لیکن جن کے لیے بدبختی مقدر ہو چکی ہوتی ہے وہ اس کے جال میں پھنس کر کافر بن جاتے ہیں۔ یہی معنی ہیں فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ

کے۔'' (۴۸)

اس تفسیر کی توضیح یہ ہوگی :

ہر پیغمبر غایت شفقت امت کی بناء پر یہ تمنا لے کر اٹھتا ہے کہ میری ساری قوم میری دعوت واصلاح وہدایت کو قبول کرے۔ مگر شیطان اس کی اس تمنا کو ناکام بنانے کے لیے قوم کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتا ہے۔ اوران کو راہ ہدایت سے روکنے کے لیے ہر کوشش عمل میں لاتا ہے۔ یہ وسوسے یوں تو سب ہی کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر جن کے دل روگی ہوتے ہیں، سنت الٰہی کے مطابق ان کے دلوں میں یہ وسوسے پھولتے پھلتے ہیں اور آخر میں کافر بنا کر چھوڑتے ہیں اور جن کے دلوں میں قبول حق کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے اس فتنہ کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور اپنی آیات کی صداقت اور دین کی حقانیت کو ان پر آشکارا کر کے ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

مولانا انور شاہؒ کی اس تفسیر کی بنا پر تمنّی کے حقیقی معنی ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔ نہ آیت کے عموم میں خلل پڑتا ہے اور نہ کوئی ایسی بات مفہوم ہوتی ہے جو عصمت نبی یا عظمت نبوت کے خلاف ہو۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور قریب قریب وہی بات لکھی ہے جو آپ نے تحریر کی ہے۔

<u>دوسری مثال</u>: یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ أیّاما معدودات ٥ فمن کان منکم مریضا اوعلی سفر فعدّة من أیام أخر ٥ علی الذین یطیقو نه فدیة طعام مسکین ٥(۴۹)

اس آیت کا آخری ٹکڑا مفسرین میں زیر بحث رہا ہے۔ عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ابتداء اسلام میں روزہ رکھنے کی عادت لوگوں کو نہ تھی اور یہ امران پر بڑا شاق گزرتا تھا اس لیے اس وقت ان کو اجازت دی گئی کہ چاہیں تو روزہ رکھیں جو بہتر ہے چاہیں تو ایک مسکین کو دووقت کا کھانا کھلا کر اس کا فدیہ دیں۔ پھر یہ حکم جب لوگ روزہ کے عادی ہو گئے، دوسری آیت:

شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن ھدی للناس و بینات من الھدی و الفرقان

فمن شهد منکم الشهر فلیصمه ۔ (۵۰) سے منسوخ کر دیا گیا مگر اکثر مفسرین و محققین جو نسخ کے دائرہ کو وسیع نہیں کرتے اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے انہوں نے اسے محکم قرار دینے کے لیے مختلف توجیہات کی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، جلال الدینؒ اور بعض دوسرے مفسرین کے حوالے سے لکھتے ہیں انھوں نے " یطیقون " سے پہلے حرف نفی "لا" مقدر مانا ہے یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور اس کا محل شیخ فانی کو قرار دیا ہے۔(۵۱)

اس بارے میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ بڑی خطرناک توجیہہ ہے۔اس سے کلام خداوندی سے امان اُٹھ جاتا ہے۔مثبت اور منفی کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا۔ ہر باطل کو کسی بھی حکم میں "لا" محذوف مان کر حکم کو ختم کر سکتا ہے۔(۵۲)

بعض جلیل القدر مفسرین نے "اطاقہ" میں باب افعال کی خاصیت سلب مانی ہے، اس صورت میں "لا" مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

" وقیل محکمة ولا مقدرة قلت عندی وجه آخر وهو ان المعنی و علی الذین یطیقونه الطعام فدیة هی طعام مسکین فاضمر قبل الذکر لانه متقدم رتبة و ذکر الضمیر لان المراد من الفدیه هو الطعام و المراد منه صدقة الفطر عقب الله تعالی الامر بالصیام فی هذه الایة بصدقة الفطر کما عقب الایة الثانیة بتکبیرات العید۔ "(۵۳)

علامہ رشید رضا صاحبؒ "المنار" اپنے اُستاذ علامہ محمد عبدہ مصریؒ سے ایک توجیہہ نقل کرتے ہیں:

" اطاقہ " کے معنی کسی کام کو بمشکل کر سکنا۔ اطاقہ قوت و قدرت کے ادنیٰ استعمال پر ہوتا ہے۔ عرب " اُطاق الشئی " کا استعمال اس صورت میں کرتے تھے جبکہ اس پر قدرت نہایت ضعیف ہو کہ اس میں مشقت شدیدہ اٹھانی پڑے

تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ''جو لوگ روزہ رکھتے ہوئے سخت تکلیف محسوس کرتے ہوں مثلاً شیخ اکبر یا وہ مریض جس کی صحت یابی کی امید نہ ہو تو انھیں اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔ اور اس کے بدلہ میں فدیہ دے دیں۔''

یہ قول دراصل صاحب کشاف کے کلام سے ماخوذ ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی رائے: اس سلسلہ میں آپ کی رائے منفرد ہے لکھتے ہیں:

''ان آیات ''یاایها الذین امنوا کتب علیکم الصیام ''کا تعلق ماہِ رمضان کے روزوں سے نہیں بلکہ ایام بیض اور عاشورہ کے روزوں سے ہے جو ابتدائے اسلام میں فرض تھے۔ ان ہی کے متعلق یہ حکم تھا کہ جو شخص مریض ہو یا مسافر ہو وہ دوسرے دنوں میں ان کی قضاء کرے اور یہ بھی اجازت تھی کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ بھی روزہ رکھنا نہ چاہیں تو اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کریں۔ بعد میں آیات ''شهرُ رمضان الّذی أنزل فیه القرآن''الخ...... اتریں، ان سے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ البتہ ایامِ بیض اور عاشورہ کا استحباب باقی رہا۔ مریض اور مسافر کا حکم ان آیات میں بھی بتایا گیا کہ وہ ان روزوں کی قضاء دوسرے دنوں میں کرلیا کریں۔ ان ہی پر شیخ اکبر کو قیاس کیا جائے گا۔''(۵۴)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی رائے پر حدیثِ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو ابوداؤدؒ کے ''باب أحوال الصلوٰة و الصّیام'' میں مذکور ہے، استدلال کیا ہے۔ آپ کی اس رائے پر '' أیاما معدودات'' کا اطلاق بھی برمحل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گنے چنے یہ ایام بیض اور عاشورہ ہی کے ہیں۔ کما کتب علی الذین من قبلکم کی تشبیہ بھی صحیح ہو جاتی ہے۔ مریض اور مسافر کے حکم میں بھی تکرار باقی نہیں رہتا اور یطیقونہ کی تاویل کی زحمت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

تیسری مثال: و اذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفة ۔(۵۵)

قرآن کریم میں آفرینش عالم کی ابتداء کے متعلق ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا

خلاصہ یہ ہے کہ :

''جب خالق کائنات نے دنیا کو آباد کرنا چاہا تو فرشتوں کی مجلس میں اپنے ارادے کا اظہار کیا تو فرشتوں نے اپنی عبادت گزاری کا ذکر کر کے دبی زبان میں اس منصب اور اپنی سرفرازی کا اظہار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا مقابلہ کرایا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا تفوق اس میں ظاہر ہوا اور خلافت ارضی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا''۔

عام مفسرین حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت و برتری کا سبب اور مدار ''علم'' کو قرار دیتے ہیں۔ (اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے) اور ظاہر آیات سے متبادر بھی یہی ہوتا ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی رائے اس سلسلہ میں بڑی دلچسپ ہے جسے مولانا احمد رضا بجنوریؒ نے اپنی کتاب انوار الباری شرح صحیح البخاری میں نقل کیا ہے کہ:

ان کے نزدیک فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا سبب علم نہیں بلکہ ان کی اطاعت خداوندی اور جذبہ انقیاد تھا۔ اس وقت مخلوق کی تین قسمیں تھیں:

۱۔ آدم علیہ السلام ۲۔ ملائکہ ۳۔ ابلیس

ان ہی میں سے کوئی مستحق خلافت ہو سکتا تھا۔ ابلیس تو اپنے ابا و استکبار کی وجہ سے مردود و مطرود ہو گیا۔ ملائکہ نے آدمؑ کے ظاہری احوال یا سابق مخلوق کے فساد فی الارض پر قیاس کر کے حق تعالیٰ کی جناب میں اپنے استحقاق کا مطالبہ کیا لیکن چونکہ ان کو اپنی غلطی پر اصرار نہ تھا اور بعد میں معافی بھی طلب کی اس لیے ان کو معاف کر دیا گیا۔ رہے آدم علیہ السلام تو وہ ہر موقع پر عجز و نیاز اور تذلل و تضرع کا اظہار کرتے رہے۔ حالانکہ وہ بھی اپنی غلطی پر حجت و دلیل کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ یہی وہ عبودیت اور سراپا نیاز مندی و اطاعت کا متاع تھا جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام مقامِ فضیلت اور منصبِ خلافت کے مستحق قرار پائے۔ (۵۶)

''تجلیاتِ انور'' کے مقالہ نگار نے لکھا ہے :

''علم میں امتحان کی صورت جو اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ایک وصف ظاہری تھا جس کا معلوم کرنا آسان تھا۔ نہ اس لیے کہ وہ مدارِ فضیلت تھا۔

بخلاف عبودیت کے کہ وہ ایک پوشیدہ صفت تھی، اس کا معلوم کرنا مشکل تھا۔" (۵۷)

مولانا انور شاہؒ کی رائے کی فضیلت واہمیت واضح ہے اس لئے کہ عبد کا کمال عبودیت میں ہے نیز کسی کا نائب وہی ہوسکتا ہے جو صدق دل سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت اور ہر حال میں تیار رہے پھر جب مخلوق کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا کہ وہ خالق کی اطاعت کا فرض اداء کرے تو خلیفہ کے لیے اس مقصد کی تکمیل اور بھی ضروری تھی۔

دراصل علم بھی ایک عمدہ صفت ہے لیکن وہ مقصود بالذات نہیں۔ مقصد عمل یعنی اطاعتِ خداوندی ہے جو علم اس مقصد کا حامل نہ ہو، وہ ضلال وو بال ہے۔

تفسیر بالرائے: تفسیر بالرائے کا مسئلہ قرآنیات میں ایک اہم مضمون ہے۔ قرآن مجید میں امم سابقہ کی اس زشتیٔ کردار پر کہ وہ اپنے عہد کی آسمانی کتابوں میں تفسیر بالرائے سے آغاز کرتے اور اس کا بدترین اختتام تاویل وتحریف بلکہ کتمان پر ہوتا، پُر غضب لہجہ میں نکیر کی گئی اور آنحضورﷺ نے بھی سخت تنبیہ فرمائی:

" من قال فی القرآن برأیه فأصاب فقد أخطأ " (۵۸)

"ومن قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعدهٗ من النّار " (۵۹)

ایک اور روایت میں بھی ایسی ہی تنبیہ کی گئی ہے:

" من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدهٗ من النّار " (۶۰)

ایسی روایات کی وجہ سے یہ خیال شدت سے پھیل گیا کہ قرآن کی کوئی تفسیر اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ اس کی تائید میں کوئی حدیث نہ ہو۔ اس سلسلہ میں علمائے امت کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ پہلی حدیث کے بارے میں بعض اہل علم کو اس کی سند و صحت کے بارے میں شک وتردد ہے۔ یہ لوگ تو اس حدیث کو بعض وجوہات کی بنا پر قابل احتجاج نہیں مانتے۔ دوسری حدیث کے بارے میں شیخ انباری نے جو تشریح کی ہے اسے مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اس طرح نقل کیا ہے:

"من قال فی القرآن قولاً یعلم ان الحق غیره فلیتبوأ مقعده من النّار۔" (۶۱)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ تفسیر بالرائے کے سلسلہ میں "خازن" کی تحقیق کو نہایت ہی صواب اور معتدل مانتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کی تحقیق کو مختصراً نقل کرتے ہیں۔ احادیث

میں جس تفسیر بالرائے سے شدت کے ساتھ روکا گیا وہ تفسیر ہے جو مفسر اپنی منشاء کے مطابق اور ہویٰ کے تحت کرے۔ ایسی تفسیر یا تو جان بوجھ کر کرے گا یا پھر غیر دانستہ طور پر۔ پس اگر ایک شخص جانتا ہے کہ قرآن کی مراد اس کے خلاف ہے لیکن پھر بھی اپنی بدعات و ناجائز اُپج پر قرآن سے استدلال کرتا ہے جیسا کہ فرقہ باطنیہ اور خوارج دیدہ و دانستہ تأویلات کیا کرتے تھے تو یہ سخت مکروہ اور شرعاً ممنوع ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک آیت متعدد معانی اور وجوہ کی محتمل ہے لیکن مفسر تمام احتمالات کو چھوڑ کر ایک ایسے معنی بیان کرتا ہے جس معنی کا آیت میں احتمال نہ تھا تو یہ بھی تفسیر بالرائے ہے اور شرعاً اس قسم کی بھی مخالفت مفہوم ہوتی ہے۔

رہی وہ تاویل جس میں آیت کے وہ معنی لیے جاتے ہیں جو اس کے مناسب ہوں اور ماقبل و مابعد سے ان معانی کا سازگار ہونا تو علماء نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس لیے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن کی تفسیر کی اور متعدد معانی بیان کئے۔ حالانکہ بذاتہٖ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تمام معانی آنحضور ﷺ سے سنے ہوئے نہیں ہو سکتے بلکہ انھوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق معانی بیان کئے ہیں۔ اور خود آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا بھی فرمائی : "اللهم فقهه في الدين وعلمه التاويل۔"

مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ تفسیر بالرائے کے غلط مطلب کا ازالہ کرتے ہوئے درس میں کہتے تھے:

> "کس نے اہل علم کو روکا ہے اس بات سے کہ کتاب اللہ کے معنی اور مطلب کو آیات کے سیاق وسباق اور الفاظ کے اقتضاء کے مطابق جس میں سلف صالحین کے عقیدے کی بھی رعایت کی گئی ہو ظاہر نہ کریں۔ بلکہ اللہ کی کتاب میں اہل علم کا واقعی حصہ یہی ہے کہ وہ نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے رہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب اُلٹتے رہیں اور جو باتیں چھپی ہوئی ہیں انھیں نمایاں کرتے رہیں۔" (٦٢)

مولانا مناظر احسن گیلانی تفسیر بالرائے کے بارے میں آپ کی رائے نقل کرتے ہیں :

"فهذا النوع من التفسير بالرائے حظ أولي العلم و نصيب

العلماء المستنبطين ۔"(۶۳)

آخر میں تفسیر بالرائے کے نتائج بد پر سخت تنبیہ کی جس کے بارے میں مولانا بنوریؒ لکھتے ہیں کہ آپ نے کہا:

" واما من تکلم فیه بدون صحة الادوات لا عنده علم من کلام السلف والخلف ولاله ذوق بالعربیه وکان من اجلاف الناس لم یحمله علی تفسیر کتاب اللّٰه غیر الوفاحقه و فله العلم فعلیه الاسف کل الاسف و ذالك الذی یستحق النّار " ۔(۶۴)

حوالہ جات

۱	مقدمہ مشکلات القرآن	ص ۳۶
۲	ایضاً	
۳	التفسیر المفسرون	ج ۱ ص ۲۰۷
۴	مقدمہ مشکلات القرآن	ص ۳۶
۵	ایضاً	ص ۳۷
۶	ایضاً	۷
۷	نزہۃ الخواطر	ج ۳ ص ۱۰۵
۸	اخبار الاخیار	ص ۳۹۴
۹	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند (عربی ادب)	ج ۲ ص ۲۳۵
۱۰	ایضاً	ص ۲۴۱
۱۱	ایضاً	ص ۲۵۶
۱۲	جلوہ کشمیر	ص ۴۷
۱۳	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند	ج ۲ ص ۲۵۷
۱۴	ایضاً	ص ۳۲۲
۱۵	ایضاً	
۱۶	تفصیل کے لئے دیکھیے نزہۃ الخواطر	ج ۷ ص ۱۱۳
۱۷	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند (عربی ادب)	ج ۲ ص ۴۰۵
۱۸	تفصیل کے لئے دیکھیے حیات اعلیٰ حضرت از ظفر الدین بہاری	
۱۹	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند (عربی ادب)	ج ۲ ص ۱۵۹

۲۰ رودکوثر ص۵۹۶
۲۱ انٹرویواز مولانا محمد عبداللہ ملتانی
۲۲ رودکوثر ص۵۹۶
۲۳ ماخوذ از مقدمہ مشکلات القرآن ص۴۳
۲۴ مآثر حکیم الامت ص۱۸۴
۲۵ مقدمہ مشکلات القرآن ص۴۱
۲۶ نقش دوام ص۳۳۴
۲۷ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۷ء
۲۸ ایضاً
۲۹ ایضاً
۳۰ الفرقان لکھنؤ ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ
۳۱ حیات انور ج ۲ ص ۱۵۷
۳۲ ایضاً
۳۳ روزنامہ الجمعیہ دہلی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ مارچ ۱۹۸۰ء ص۱۴۵
۳۴ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۷ء
۳۵ الفرقان لکھنؤ ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ
۳۶ تجلیات انور ص۷۶
۳۷ ایضاً
۳۸ انٹرویو از مولانا احمد رضا ۲۹/ ستمبر ۱۹۸۰ء
۳۹ دارالعلوم دیوبند اپریل ۱۹۵۷ء
۴۰ القرآن ۵۲ ، ۲۲
۴۱ القرآن ۵۳،۱۹،۲۰
۴۲ بیضاوی جلد ثانی ص۵۸
۴۳ ایضاً

۴۴	ایضاً	
۴۵	بیضاوی	ج ۳ ص ۵۸
۴۶	تفسیر ابن کثیر	ج ۳ ص ۲۳۰
۴۷	ترجمہ قرآن فارسی	ص ۲۳۱
۴۸	تجلیات انور	ص ۸۲
۴۹	القرآن	۲۰،۱۸۳،۱۸۴
۵۰	القرآن	۲:۱۸۵
۵۱	الفوز الکبیر	ص ۵۸
۵۲	تجلیات انور	ص ۸۵
۵۳	الفوز الکبیر	ص ۵۹
۵۴	ماخوذ از فیض الباری	ج ۳ ص ۱۴۵
۵۵	القرآن	۲:۳۰
۵۶	ماخوذ انوار الباری شرح صحیح البخاری	ج ۳، ص ۲۸
۵۷	تجلیات انور	ص ۸۹
۵۸	مشکوٰۃ المصابیح	ص ۳۲
۵۹	ایضاً	
۶۰	ایضاً	
۶۱	مقدمہ مشکلات القرآن	ص ۳۷
۶۲	حیات انور	ج ۱، ص ۱۲۴
۶۳	ایضاً	
۶۴	مقدمہ مشکلات القرآن	ص ۴۰

باب: ۴

علمِ حدیث کے میدان میں خدمات

پاک و ہند میں علم حدیث

شاہ صاحبؒ کی قرآنی خدمات بیان کرنے کے بعد اب آپ کی علوم حدیث کے بارے میں کی گئی کدو کاوش کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ ایک عظیم محدث ہونے کی حیثیت سے آپ کی اس میدان میں خدمات بہت زیادہ ہیں لیکن علوم حدیث کے بارے میں آپ کی نگارشات پیش کرنے سے پہلے ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ اس برصغیر میں علم حدیث کس طرح داخل ہوا اور ہند کے مختلف علمی مراکز میں کس طرح رواج پاتا گیا کیونکہ شاہ صاحبؒ کی خدمات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا۔ بری راستے اور بحری راستے، برّی راستے سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں داخل ہونا شروع کیا۔ لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب تاجروں اور سوداگروں کی حیثیت سے سندھ اور مالیبار سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے تھے۔ اس سرزمین میں عربوں کی نوآبادیاں قائم تھیں۔ مسجدیں اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں جہاں بیٹھ کر قال اللہ اور قال الرسول کی آواز بلند ہوتی تھی۔

برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کی اشاعت و توسیع اور اس کے ارتقائی مدارج کو ہم پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

ابتدائی زمانہ: حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں سواحل ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت حکم بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی سرکردگی میں اس وقت کی مشہور بندرگاہ ''تھانہ'' پر مجاہدین اسلام کا قافلہ اترا تھا۔ (۱) اس کے بعد بھروچ (گجرات) اس مقدس بحری عسکر کی دوسری منزل تھی۔ (۲) برصغیر بھی ان خوش قسمت ملکوں میں سے ہے جن کی خاک صحبت یافتگانِ نبویؐ کے پاؤں سے لگ کر

متبرک بنی۔

اس کے بعد سواحل ہند کا علاقہ مجاہدین کی جولانگاہ بن گیا۔ اسلامی فوجی قافلے یکے بعد دیگرے آتے رہے جن میں دیدارِ نبوی ؐ سے مشرف ہستیاں ضرور شامل ہوتیں۔ حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خاص مشن ہی یہ تھا کہ جس ملک میں پہنچتے قال اللہ اور قال الرسول ؐ کی صدائے جاں بخش سے اس میں نئی روح پھونک دیتے۔ اس طرح سرزمین ہند ابتداء ہی سے "حدثنا و اخبر نا" کی آواز سے مانوس ہو چکی تھی۔

برصغیر میں پہلا محدث: ۹۲ھ میں مسلمانوں نے محمد بن قاسمؒ کی سرکردگی میں سندھ پر ایک فیصلہ کن حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور یہ ملک اس وقت سے لے کر تقریباً ۲۵۰ھ تک براہ راست دمشق اور بغداد کے ماتحت رہا۔ (۳)

۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدیؒ کے حکم سے جو فوج ہندستان کی طرف روانہ ہوئی اس میں ربیع بن صبیح السعدی البصریؒ تابعی بھی تھے۔ جنہوں نے حدیث کے منتشر اوراق کو یکجا کرنے میں سب سے پہلے حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کشف الظنون کا یہ قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قيل هو أول من صنف و بوّب في الاسلام" (۴)

یعنی دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے تصنیف کی اور کتاب کو ابواب میں مرتب کیا۔

طبقات ابن سعد میں ہے:

"خرج غازيا إلى الهند في البحر فمات فدفن في جزيرة من جزائر البحر سنة ستين و مأة" (۵)

ترجمہ: وہ (حضرت ربیع بن صبیحؒ) جہاد کے لیے سمندری رستے سے ہندوستان گئے تو وہیں انتقال ہوا اور کسی جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں مدفون ہوئے۔

ہندوستان میں ایک تابعی: برصغیر میں ایک تابعی کا نام حباب بن فضالہ ملتا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے دیدار سے آنکھیں روشن کی تھیں۔ ہندوستان میں آنے والی فوج میں ان کا نام لکھا گیا تھا۔ انھوں نے والدین کی

اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانے کا فتویٰ پوچھا تھا۔ حضرت انس ﷺ نے جانے کا مشورہ دیا۔ معلوم نہیں واپس گئے یا ہندوستان آئے۔(۶)

ایک تاجر تبع تابعی: اسرائیل بن موسیٰ حضرت امام حسن بصریؒ کے شاگرد تھے۔ برصغیر میں بکثرت آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے ''نزیل ہند'' ان کا لقب ہی ہو گیا تھا۔

ابن حجر عسقلانی نے ابن حبان کے حوالے سے لکھا ہے:

" کان یسافر الی الهند " (۷)

ترجمہ: یہ ہندوستان کا (تجارتی) سفر کیا کرتے تھے۔

عبدالرحمان بن ابوزید بیلمانی: انھوں نے حضرت عثمان غنی، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، امیر معاویہ، عمرو بن اوس، عمرو بن عنبسہ، نافع بن جبیر بن مطعم، عبدالرحمان بن الاعرج رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کی ہے۔ ان سے حضرت عمروؓ بن عنبسہ کے قبولِ اسلام کی روایت نسائی میں اور ''طوافِ وداع'' سے متعلق حدیث ترمذی میں موجود ہے۔(۸)

امام مکحول سندھی: آپ نے حضرتِ ابوامامہ باہلیؓ، واثلہؓ بن اسقع، اور حضرت انسؓ خادم رسولؐ سے روایت کی ہے۔ ابومعشر نجیح بن عبدالرحمان سندھی حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ حضرت ابوامامہ نے سہیل بن حنیف کی زیارت کی۔ ان کے علاوہ عبدالرحمان سندھی حارث بیلمانی، موسیٰ سیلانی وہ ہندی الاصل ہستیاں ہیں جنھوں نے براہ راست حضرات صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔(۹)

دوسری صدی ہجری کی طرح علم و فضل کا یہ کارواں تیسری اور چوتھی صدی میں بھی شرف سعادت کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ خلف بن سالم سندھیؒ (م۔۲۳۱ھ)

۲۔ محمد بن ابومعشر نجیح سندھیؒ (م۔۲۴۴ھ)

۳۔ عبد بن حمید کسیؒ (م۔۲۴۹ھ)

۴۔ محمد بن رجاء سندھیؒ (۲۸۶ھ) صاحب مستخرج صحیح مسلم

۵۔ محمد بن ابراہیم دیبلیؒ (م۔۳۲۲ھ)

۶۔ احمد بن عبداللہ دیبلیؒ (م۔۳۴۳ھ)

۷۔ابوالفوارس احمد بن محمد سندھیؒ (م۔۳۴۹ھ)

۸۔محمد بن محمد دیبلیؒ (م۔۳۵۴ھ)

۹۔محمد بن علی سندھیؒ اور ابوالعباس احمد بن محمد منصوریؒ وغیرہ

چوتھی صدی کے ان رجالِ حدیث میں سے ہیں جن سے خود حجاز وعراق اور دمشق و شام کے محدثین نے روایتکی ہے۔(۱۰)

تیسری صدی ہجری کے وسط میں اگرچہ سندھ میں عربوں کی بالا دستی ختم ہوگئی پھر بھی وہاں کے دو شہروں منصورہ اور دیبل (بھکر اور ٹھٹھہ) میں علی الترتیب ۴۱۶ھ و۵۲۷ھ تک اسلامی ریاستیں قائم رہیں۔اس طرح یہ سرزمین پہلی صدی ہجری کے آخر سے لے کر اس وقت تک اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ ومحافظ کا گہوارہ بنی رہی۔(۱۱)

دورِ اشاعت وترویج پانچویں صدی کی ابتداء میں اسلام نے اپنے اثر ونفوذ کے لیے بری راستہ کو منتخب کیا اور سلطان محمود غزنوی ۴۱۲ھ میں درّۂ خیبر سے اسلامی لشکر کے ساتھ نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لاہور اور اس کے مضافات میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔سلطان مسعود کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیلؒ (م۔۴۴۸ھ) لاہور میں وارد ہوئے۔یہ حدیث وتفسیر کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مؤثر البیان واعظ بھی تھے۔(۱۲)

لاہوری علماء میں سے محمد بن عبدالصمد بن عبدالرحمانؒ (م ۴۲۹ھ) نصر اللہ بن احمد سندھی (م۔۴۳۳ھ) علی بن عبداللہ سندھیؒ، ہبۃ اللہ بن سہیل سندھیؒ وغیرہ اسی دور کے ہندی محدثین ہیں۔(۱۳)

چھٹی صدی ہجری میں بھی ہندوستان کے اسلامی خطے ہندی علماء ومحدثین کے برکات ومحاسن سے متفخر نظر آتے ہیں۔اس وقت کے ایک محدث شیخ ابوالحسن علی لاہوریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں:

"العالم المحدث كان شيخا اديبا شاعرا كثير الحفظ "(۱۴)

یہ حافظ ابوعلی مظفر بن الیاس کے شاگرد تھے اور بغداد تک ان کا فیض عام تھا۔۵۲۹ھ میں لاہور میں وفات پائی۔

لاہور ہی کے ایک اور محدث محمد بن محمد لاہوریؒ ہیں۔انھوں نے امام المظفر سمعانی،ابو

الفتح عبدالرزاق منیعی ، ابونصر محمد بن ماہانی، ابوبکر بن خلف شیرازی، ابواسحاق ابراہیم بن عمر اصبہانی اور ابوسہل احمد بن اسماعیل نہرجانی سے حدیث پڑھی۔ ۵۴۰ھ میں وفات پائی۔(۱۵)

مذکورہ بالا محدثین کے علاوہ اس عہد کے حسبِ ذیل محدثین کا تذکرہ بھی کتب رجال میں ملتا ہے :

۱۔ مخلص بن عبداللہ سندھیؒ
۲۔ ابوالحسن بختیار بن عبداللہؒ (م۔ ۵۴۲/۴۳ھ)
۳۔ ابومحمد بختیار بن عبداللہؒ (م۔ ۵۴۱ھ)
۴۔ ابوالعلاء ہندیؒ۔(۱۶)

ساتویں صدی ہجری: ساتویں صدی کے شروع میں ''مشارق الانوار'' کے مصنف ہندوستان کے لیے باعث فخر بن کر جلوہ افروز ہوئے۔ امام موصوف کا نام حسن بن محمدؒ ہے۔ ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بغداد میں بیٹھ کر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے ''مشارق الانور'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ "مصباح الدجیٰ فی حدیث المصطفیٰ" "الشمس المنیرة"، شرح بخاری "درالسحابه فی وفیات الصحابة" اور دو رسالے موضوعات حدیث میں آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔ (حبیب الرحمان قاسمی نے تاریخ پیدائش ۵۷۰ھ اور تاریخ وفات ۶۶۰ھ لکھی ہے)۔

امام صنعانیؒ سے پہلے قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری المصباح الکبیر، کتاب الہادی اور امام محمد بن محمد بن رجاء سندھیؒ، ''مستخرج علی صحیح مسلم'' کے نام سے کتابیں تالیف کر چکے تھے۔ مگر یہ کتابیں برصغیر میں رواج نہ پا سکیں لیکن امام صنعانیؒ کی ''مشارق الانوار'' نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ تقریباً دو، ڈھائی سو سال تک ہندوستان کے نصاب تعلیم کا اہم جز بنی رہی۔(۱۷)

امام صنعانیؒ کے علاوہ ساتویں صدی ہجری کے ان علماء محدثین نے بھی اپنے اپنے طور پر ہند و بیرون ہند میں حدیث کی خدمات انجام دیں۔

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ (م۔ ۶۶۶ھ): شیخ بہاء الدین مہبار (ہبار) بن اسود بن

مطلب بن اسد قریش کی اولاد میں سے تھے۔(۱۸) قلعہ کوٹ کرور (متصل ملتان) میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے خراسان و بخارا کا سفر کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں ظاہری علوم کی تکمیل کر لی۔ جذبۂ شوق نے حرمین کی طرف کھینچا، حج ادا کیا اور مدینہ منورہ جا کر شیخ کمال الدین محمد محدث یمنیؒ کی خدمت میں حدیث کے درس و شغل میں منہمک رہے۔

مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے:

"نزد شیخ کمال الدین محمد یمنی از محدثین کبار بوده پنجاه وسه سال در مدینه منوره بگفتن درس حدیث اشتغال داشت، کتب حدیث خوانده و اجازت حاصل نمود۔"(۱۹)

یہاں سے بیت المقدس ہوتے ہوئے بغداد پہنچے اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت ہوکر ہندوستان واپس آئے۔ ملتان میں ایک درس گاہ قائم کر کے حدیث وسنت کی ترویج و اشاعت میں تاحیات مصروف رہے۔

شیخ رضی الدین صنعانی بدایونیؒ: کوئل (علی گڑھ) میں پیدا ہوئے، حجاز و بغداد کا سفر کیا، وہاں کے علماء و مشائخ سے حدیث کی تعلیم و تحصیل کی۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور لاہور کو اپنی علمی خدمات کا مرکز بنایا وہیں وفات ہوئی۔(۲۰)

ابوعبداللہ محمد بن مامون لاہوریؒ: تحصیل علم کے لیے خراسان گئے۔ شافعی فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر نیشاپور اور بغداد پہنچے اور وہاں کے مشائخ سے حدیث کی سماعت کی۔ آخر میں آذربائیجان میں سکونت اختیار کر لی۔ اور وہیں ۶۰۳ھ میں ملحدوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔(۲۱)

آٹھویں صدی ہجری: گذشتہ صدیوں کی طرح آٹھویں صدی میں بھی ارضِ ہند علماء ومحدثین کی عطر بیزیوں سے معطر رہی، اگرچہ اس صدی میں معقولات کا زیادہ زور رہا، لیکن علوم نبوی ﷺ کے دلدادگان زمانہ کے چلن سے بے نیاز ہوکر حدیث پاک کے اخذ ونشر میں مصروف رہے اور اس دور کے علماء حدیث میں یہ حضرات خاص اہمیت کے حامل ہیں:

سلطان الاولیاءؒ حضرت نظام الدین: آپ اس عہد کے مشہور فاضل، ادیب اور محدث تھے۔ دہلی آ کر مولانا کمال الدین دہلویؒ سے مشارق الانوار کا درس لیا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ آپ اس کے معانی اور نکات سے بھی مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ آپ کے استاذ نے جو سند لکھ کر دی تھی، اس میں تحریر کیا ہے:

”قرأ هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على ساطر هذه السطور قرأة بحث و اتقان و تنقيح معانيه و تنفير مبانيه “ (۲۲)

نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ: فقہ اور اصول فقہ مولانا عبدالکریم شروانی اور افتخار الدین گیلانی سے پڑھا۔ سلطان الاولیاء کے خلیفہ تھے، غناء نہیں سنتے تھے، ایک دن مجلس غناء سے اٹھتے ہوئے کہا کہ ”یہ خلافِ سنت ہے“۔ لوگوں نے کہا کہ تم اپنے پیر کے مسلک سے ہٹ گئے؟۔ فرمایا! پیر کا عمل حجت نہیں ہوسکتا۔ جب یہ بات سلطان الاولیاء تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا۔ ”راست می گوید“ (۲۳)

مولانا شمس الدین یحییٰ اودھیؒ (م ۷۴۷ھ): سلطان الاولیاء کے مرید تھے۔ شیخ فریدالدین شافعی کے شاگرد تھے۔ فقہ، اصول فقہ، ادب اور حدیث کے امام تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار کی طرح لکھی تھی اور دہلی میں درس دیتے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے ان کو کشمیر میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجا مگر سلطان کی وفات کی وجہ سے یہ تجویز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ ۷۴۷ھ میں فوت ہوئے۔ (۲۴)

مولانا فخر الدین زرادیؒ: آپ بھی دہلی کے علماء مشاہیر اور سلطان الاولیاء کے جانثاروں میں ہیں۔ دہلی کے محدثین میں خاص امتیاز کے مالک تھے۔ ہدایہ پڑھاتے تو اس کی حدیثوں کے مقابلہ میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرتے تھے۔ مرید ہونے کے بعد درس و تدریس کا شغل چھوڑ دیا تھا۔ فتح دکن کے بعد محمد تغلق کے حکم سے وہاں چلے گئے۔ وہاں سے حج کے لیے حجاز کا سفر کیا۔ حج سے فارغ ہو کر بغداد پہنچے اور وہاں کے محدثین سے حدیث کی سند حاصل کی۔ واپسی میں جہاز تباہ ہوگیا اور دُرِ خوش آب پانی کی تہ میں چلا گیا۔ (۲۵)

علامہ سلیمان زکریا ملتانیؒ: حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ حجاز، عراق، بغداد، بیت المقدس اور دیگر بلاد عربیہ کا علمی سفر کرنے کے بعد ہندوستان واپس

آئے اور دہلی کو اپنی خدماتِ علمیہ کا مرکز بنایا۔(۲۶)

شیخ عبدالعزیز دیبلیؒ: انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، شیخ جمال الدین مزیؒ اور امام شمس الدین ذہبیؒ سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی۔ حدیث وفقہ میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ محمد تغلق ان کا بڑا معتقد تھا اور ان کا بڑا اعزاز و اکرام کرتا تھا۔(۲۷)

ان بزرگوں کے علاوہ شیخ نصیر الدین محمودؒ ہندی تلمیذ شیخ رضی طبریؒ، شیخ زین الدین طبریؒ، جمال الدین مظہریؒ، شیخ خلیل مالکیؒ، شیخ زین الدین دیویؒ، شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیریؒ وغیرہم بھی اس صدی کے ان علماء عظام و مشائخ میں سے ہیں جو حدیث میں بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔(۲۸)

نویں صدی ہجری: ۹ ویں صدی ہجری میں بھی قافلہ علم حدیث پوری توانائیوں کے ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس عہد کے سب سے پہلے بزرگ جو باہر سے اس تبرک کو سینہ سے لگا کر ہندوستان وارد ہوئے، مولانا نور الدین احمد بن عبداللہ شیرازیؒ ہیں۔ آپ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے۔ صحیح بخاری میں آپ کی سند اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز و یمن پہنچے تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو ذوق وشوق اور فخر کے ساتھ حاصل کیا۔(۲۹)

شیخ رکن الدین قرشی ظفر آبادی (م۔۸۲۰ھ) بھی اسی عہد کے بزرگ ہیں جن کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

"کان من أکابر الفقهاء الحنفية ذا کعب عال فی الفقه و أصوله والحديث والتفسير" (۳۰)

شیخ حسین بن معز الدین بلخی بہاری (م۔۲۴/ ذی الحجہ ۸۴۴ھ) نے بھی اسی زمانہ میں بہار میں بیٹھ کر شمع حدیث روشن کی۔ علامہ حسنی لکھتے ہیں:

"کان فريد عصره فی القرأت والتجويد لم يکن مثله فی زمانه فی مصر، والشام ولا فی الارض الحجاز"۔ (۳۱)

شیخ محمد بن حسین علوی گجراتیؒ (م۔۸۴۷ھ) شیخ قطب الدین بلخیؒ، شیخ جمال الدین محدث کشمیریؒ، شیخ خضر بن حسن محدث جونپوری لکھنویؒ، شیخ شمس الدین خواجگی گڑویؒ (م۔۸۹۸ھ) بھی اس صدی کے رجال حدیث میں بلند مقام رکھتے تھے۔

توسیعی زمانہ: علم حدیث کے برصغیر پاک و ہند میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی ہجری کا اختتام اور دسویں صدی ہجری کا آغاز ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر و شام و حجاز امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمان سخاویؒ (م۔۹۰۲ھ) کے علم و فضل کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اور ان کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پڑ رہی تھیں۔

حافظ سخاویؒ کے تلامذہ: ان کے تلامذہ میں سب سے پہلے مولانا راجح بن داؤد گجراتیؒ (م۔ ۹۰۴ھ) احمد آباد گجرات میں آئے، اس کے بعد ملک المحدثین مولانا وجیہہ الدین محمد مالکیؒ (م۔۹۲۹ھ) گجرات میں وارد ہوئے، پھر مولانا جمال الدین محمد بن عمر حضرمیؒ (م۔۹۳۱ھ) احمد آباد گجرات میں آئے اور سلطان گجرات مظفر شاہ حلیم نے خود زانوئے ادب ان کے سامنے تہ کئے۔ (۳۲)

دہلی کے مرکز میں پہلا محدث: لیکن اصل وہ شخصیت جس کے پرتو سے اس سرزمین کے شمالی و جنوبی دونوں گوشوں کا منور ہونا مقدر تھا۔ سید رفیع الدین صفوی شیرازیؒ کی ذات والا تھی، یہ معقولات میں محقق دوانی کے شاگرد تھے۔ حدیث کا علم عرب جا کر علامہ سخاویؒ سے حاصل کیا اور گجرات میں وارد ہوئے۔ سلطان دہلی سکندر لودھیؒ نے دہلی میں بلا لیا۔ پھر سید موصوفؒ نے آگرہ میں درس و تدریس کی مجلس آراستہ کی اور ۹۵۴ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے شاگردوں میں سے قابل ذکر شیخ ابوالفتح تھانیسریؒ ہیں، جنہوں نے پچاس برس تک آگرہ میں اپنے استاد ہی کے محلہ میں بیٹھ کر علوم عقلی و نقلی کا درس دیا۔ بے شمار اشخاص ان کے دامن تربیت میں پل کر شہرہ آفاق ہوئے۔ جن میں ملا بدایونی، مولانا کمال الدین حسینؒ اور شیخ کے اپنے فرزند ملا عیسیٰ نامور ہوئے۔ ملا عیسیٰ اکبر کے زمانہ میں آگرہ کے مفتی ہوئے، ملا بدایونی اکبر کے امام ہوئے اور مولانا کمال الدین حسین نے زہد و عبادت سے باہر قدم نہ رکھا۔ (۳۳)

پہلا شارح بخاری: سید ابوالفتح کے ایک شاگرد میر سید عبدالاول بن علامہ الحسینی جونپوریؒ تھے۔ یہ سب سے پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھنے کی عزت حاصل کی۔ فیض الباری شرح صحیح بخاری اس دیار کی اولین کوشش ہے۔ میر موصوف نے دہلی میں (م۔۹۶۸/۶۹ھ) میں انتقال کیا۔ (۳۴)

(سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات کا سال ۹۶۵ھ لکھا ہے)

بخاری کا حافظ: مولانا عبدالملک عباسیؒ (م۔۹۷۰ھ) گجرات کے باشندے تھے۔ان کو صحیح بخاری پوری زبانی یاد تھی اور اس کے معانی و مطالب کے بھی حافظ تھے زبانی صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے۔(۳۵)

حافظ ابن حجر مکیؒ کے تلامذہ

اب وہ زمانہ آیا جب مادی اور روحانی سلطنتوں میں انقلاب آچکا تھا۔ ہندوستان کے اُفق پر مغلِ اعظم کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا اور عرب میں اب حافظ ابن حجر مکیؒ (م۔۹۷۳ھ) کا شہرہ تھا۔اُس زمانہ کے مشہور محدثین یہ ہیں:

میر سید عبدالاول جونپوریؒ (م۔۹۶۵ھ)، شیخ طیب سندھیؒ، شیخ عبدالمعطی مکیؒ، شہاب الدین احمد عباسیؒ، (۹۹۲ھ)، شیخ محمد بن عبداللہ فاکہیؒ (م۔۹۹۲ھ)، سید عبداللہ عید روسؒ (م۔۹۹۰ھ)، شیخ سعید شافعی حبشیؒ (م۔۹۹۱ھ)، شیخ محمد یعقوب صرفی کشمیریؒ (م۔۱۰۰۳ھ)، ملا محمد شگرف محدث کشمیریؒ، محدث حاجی کشمیریؒ (م۱۰۰۴ھ)، مولانا عبدالرحمان محدث سرہندیؒ، استاد حضرت مجدد الف ثانیؒ، ابوالحسن بکری الشافعیؒ۔(۳۶)

۴) استقلالی زمانہ

شیخ علی متقیؒ (م۔۹۷۵ھ): دسویں صدی ہجری کے بیچ میں یکایک ہندوستان کی قسمت چمکتی ہے اور اس کے اقبال کا ستارہ پورب کے اس شہر میں طلوع ہوتا ہے جس کو شاہ جہاں نے ''شیراز ماست'' کا خطاب دیا تھا۔ ہندوستان کی یہ قسمت بیدار اور ستارۂ درخشاں ذات شیخ علی متقی کی تھی۔ان کا اصلی اور خاندانی وطن جونپور تھا۔ برہانپور دکن میں پیدا ہوئے اور شیخ باجن برہانپوری سے بچپن میں بیعت کی۔جوانی میں ملتان آکر شیخ حسام الدین متقی سے علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کی۔یہاں سے گجرات ہوتے ہوئے سولہ برس کی عمر میں حجاز پہنچے۔ مشہور اساتذہ سے علوم کی تحصیل کی۔حجاز میں بیٹھ کر ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک حدیث شریف کی اور وہ دائرۃ المعارف ترتیب دی جو "کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال" کے نام سے مشہور ہے اور اس کے ساتھ ہی "تلخیص منہج العمال" کے نام سے مرتب

کی۔(۳۷) جنہوں نے امام رزین اور حافظ سیوطی کے مجموعوں پر خطِ نسخ پھیر دیا۔ ۹۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

شیخ کی آغوش تربیت میں ہندوستان کی متعدد با کمال ہستیاں پل کر جواں ہوئیں۔ شیخ عبدالوہاب متقی منڈوی برہانپوری، شیخ محمد طاہر پٹنی، احمد آباد گجرات، شاہ محمد فضل اللہ برہانپوری، شیخ عبداللہ و شیخ رحمت اللہ سندھی و شیخ برخوردار سندھی وغیرہ۔

شیخ عبدالحق محدثؒ: گیارہویں صدی میں علم حدیث کا ایک نیّر تاباں شیخ عبدالحق محدثؒ کے نام سے دہلی کے اُفق پر طلوع ہوا۔ جس نے اکبر کے دور کی بدعت والحاد کو حدیث نبوی ﷺ کے نور سے کافور کر دیا۔ اپنے والد سے علوم کی تحصیل کی پھر مکہ معظمہ جا کر شیخ عبدالوہاب متقی سے صحاح ستہ کا درس لیا۔ آپ نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھیں ایک عربی اور دوسری فارسی میں سیرت میں "مدارج النبوۃ" تصنیف کی، ۱۰۵۲ھ میں وفات پائی۔ (۳۸)

شیخ کے بعد ان کے فرزند مولانا نورالحق محدث دہلویؒ نے اس فیض کو عام کرنے میں پوری زندگی صرف کردی۔ صحیح بخاری کی شرح "تیسیر القاری" کے نام سے کئی جلدوں میں لکھی۔ مؤطا امام مالک کی شرح مرتب کی۔ صحیح مسلم کی "منبع العلم" کے نام شرح شروع کی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ ۱۰۷۳ھ میں وفات ہوئی۔ بعد میں ان کے صاحبزادے شیخ فریدالدینؒ نے اس کی تکمیل کی۔ اور حصن حصین کی شرح بھی لکھی۔ ان کے صاحبزادے شیخ سلام اللہؒ نے مؤطا کی شرح "معلیٰ" لکھی اور صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ (۳۹)

برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کی اصلی شوکت و رونق دو فاروقی خانوادوں کے ذریعے سے ہوئی۔ جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی ہیں۔ جن کا پہلا علمی اتصال شیخ عبدالحق دہلویؒ کے سلسلہ سے ہوا۔ اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ ان دونوں سرچشموں نے مل کر ہندوستان میں علوم حدیث کو پھیلایا۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ: آپ نے معقولات مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی اور علم حدیث مولانا عبدالرحمان سرہندیؒ اور مولانا یعقوب کشمیریؒ سے حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ حرمین چلے گئے، وہاں شیخ عبدالرحمٰن بن فہد سے حدیث سنی اور صحاح ستہ کی سند اور

اجازت حاصل کی۔ آپ کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ آپ نے ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ (۴۰)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور مولانا عبدالحق دہلویؒ معاصر تھے۔ مجدد صاحب کی بہت سی اولادوں میں سے صرف دو آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین ہوئے۔ یعنی عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصومؒ اور دوسرے خازن الرحمت شیخ محمد سعیدؒ تھے، اول الذکر (م۔ ۱۰۷۰ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ آدمیوں نے بیعتِ توبہ کی اور موخر الذکر فقیہ و محدث تھے۔ حدیث میں انھوں نے مشکوٰۃ کی شرح کو یادگار چھوڑا ہے۔

حضرت محمد معصومؒ کے صاحبزادے شیخ محمد افضل سرہندیؒ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان سے حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ (۴۱)

گیارہویں صدی کا اختتام: اب گیارہویں صدی کا اختتام ہے، اتنے دنوں میں زمانہ نے ایک عظیم الشان پلٹا کھایا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت بد سے بدتر ہوتی گئی اور عالمگیر کے جانشین اب ایک کے بعد ایک کمزور تر ہو رہے تھے اور اُدھر حرمین میں درس حدیث کی مسند پر ابن حجر مکیؒ اور ان کے تلامذہ کے بجائے کچھ اور نئے خانوادوں کے ارکان متمکن تھے جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر تھا۔

اس عہد میں حرمین میں دو ہندوستانی محدث مسند نشین ملتے ہیں۔ عبداللہ لاہوریؒ مکہ معظّمہ میں اور ابوالحسن سندھیؒ مدینہ منورہ میں۔ ان کے علاوہ محمد بن سلیمان مغربیؒ (مراکش) حسن عجمی، شیخ عبداللہ بن سالم البصریؒ (عراق) احمد نخلی، تاج الدین حنفیؒ، شیخ احمد بن سالم البصریؒ، محمد بن علاء الدین بابلیؒ، شیخ ابراہیم کردیؒ وغیرہ اعیان حدیث جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔

شیخ ابراہیم کردیؒ (م۔ ۱۰۸۰ھ) کے صاحبزادے شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنیؒ ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کے حلقہ درس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جا کر شریک ہوئے تھے۔ (۴۲)

ابوالحسن سندھیؒ (م۔ ۱۱۳۹ھ) کے شاگردوں میں سے دو کا تعلق ہندوستان سے

ہے۔ایک عبدالولی طرخانی کشمیریؒ (م۔۱۱۷۱ھ) اور دوسرے شیخ محمد حیات سندھیؒ (م۔ ۱۱۶۴ھ) ہیں۔(۴۳)

شیخ محمد حیات سندھیؒ کے قابل شاگرد یہ ہیں:

علامہ غلام علی آزادؒ بلگرامی، شاہ محمد فخر الہ آبادیؒ (م۔۱۱۴۴ھ)، شاہ محمد افضل الہ آبادیؒ (م۔۱۱۲۴ھ)۔

تکمیلی زمانہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔(م۔۱۱۷۳ھ)

برصغیر پاک وہند کی علمی کائنات میں اسلام کا وہ اختر تاباں نمودار ہوا جس کو دنیا ''شاہ ولی اللہؒ'' کے نام سے جانتی ہے۔مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پر تھا۔مسلمانوں میں رسومات وبدعات کا زور تھا۔جھوٹے فقراء اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسند بچھائے اور ان کی مزار پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ وفتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا۔عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکام وارشادات اور فقہ کے اسرار ومصالح سے بے خبر تھے۔شاہ صاحب کا وجود اس عہد میں عطیۂ کبریٰ تھا۔

اس وقت ہندوستان میں جو کچھ علمی اثرات اور اہل علم کا وجود نظر آتا ہے۔یہ سب دہلی کے اس خاندان کا فیض ہے جو شیخ نزور کے چھتے میں دفن ہیں اور جس کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہند کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آشنا کیا ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد جس خاندان کو خدمت حدیث کا شرف حاصل ہے وہ شاہ عبدالرحیمؒ کا خاندان ہے۔ اسی خاندان کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور شاہ اسحاقؒ ہیں۔ان میں سے بعض افراد ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے اور بعض آج بھی شیخ نزور کے چھتہ میں جس کو آج ''مہندیاں'' کہتے ہیں، آرام کی نیند سو رہے ہیں۔یہی قبرستان ہے جہاں علم کے سمندر دفن ہیں۔

آج جو اکابر علماء دیوبند کے نام سے مشہور ہیں مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد

قاسم نانوتویؒ اور محمد انور شاہ کشمیریؒ، یہ سب اسی خاندان کے شاگرد ہیں۔ گویا محمد انور شاہ صاحبؒ کی مادر علمی اسی تلاطم خیز سمندر کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو کبھی ترکمان کے دروازے کے باہر موجیں مارتا تھا اور آج جس کی خاموش روانی اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ذات اسی خاندان کے جاری کردہ چشمۂ علم و معرفت سے کسب فیض کر کے مُستنیر و منوّر ہوئی، جس کا نام "شاہ عبدالرحیم" کا خاندان ہے۔ آپ کی مادر علمی کو ظاہری و باطنی علوم میں اسی خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مولانا انور شاہؒ اسی چمن کے پھول ہیں جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دہلی کے ایک چھتہ میں لگایا تھا، آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا اس کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔

برصغیر میں علم حدیث بارہویں و تیرہویں صدی ہجری میں

سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں (بہادر شاہ ظفر) برصغیر کے اندر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ارباب حل و عقد کے نظریات سیاست کا غلبہ ہو چکا تھا۔ انگریز برصغیر کے باشندوں کو رنگ وروپ کے لحاظ سے ہندوستانی اور دماغ وخیال کے اعتبار سے یورپین بنانا چاہتے تھے۔ اس بات کو مسلمانانِ ہند نے محسوس کیا۔ ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان کے اندر آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریک بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کا نمایاں حصہ تھا۔ وہ انگریزوں کے مقابلے میں صرف استخلاص وطن ہی کے خواہاں نہ تھے بلکہ مذہب اسلام کے تحفظ کے لیے بھی میدان میں آئے تھے۔ یہ تحریک پورے جوش وخروش کے ساتھ چل کر بالآخر ناکام ہوئی اور اس کے انتقام کا رخ براہ راست مسلمانوں کی طرف زیادہ تھا۔ بڑے بڑے علماء کو اس نے پھانسی پر لٹکایا، کالے پانی بھجوایا اور ان کے مکانات کھدوا ڈالے۔ جو علماء اور مشائخ انگریز کے پنجۂ انتقام سے بچ گئے تھے ان میں سے بعض ہجرت کر گئے تھے اور وہاں "مدرسہ صولتیہ" قائم کر لیا تھا۔ اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے بھی مکہ معظّمہ کی طرف ہجرت کی۔ حافظ ضامن شہیدؒ اور بہت سے جانبازانِ حریت میدان شاملی میں شہید ہو گئے تھے۔ (۴۴)

میدان شاملی میں انگریزوں کی فوج سے نبرد آزما ہونے والوں میں مولانا محمد قاسم

نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی تھے۔ اول الذکر انگریز کے انتقام سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ معافی کے بعد اپنے دینی و ملی اور تعلیمی و تبلیغی کام میں مصروف ہو گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار کر لیے گئے۔ مظفر نگر جیل میں چھ ماہ تک قید رہے، جیل سے چھوٹ کر اپنے وطن گنگوہ کے اندر مدرسہ و خانقاہ سے اپنا تعلق رکھا اور پوری عمر اس میں گزار دی۔ (۴۵)

۱۸۵۷ء کے بعد عیسائی مشنریوں نے اپنا کام تیزی سے جاری رکھا اور ان کا سب سے بڑا حریف مذہبِ اسلام تھا۔ اس لیے سلسلہ ولی اللٰہی کے اس وقت کے نمائندوں نے بڑی جد و جہد اور محنت و جانفشانی سے تعلیمی ادارے قائم کئے اور اپنی تحریروں، تقریروں، تصانیف و تالیفات، مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے اپنے مذہبی امتیاز و انفرادیت کو بر قرار رکھنے کی عظیم کوشش کی۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد دیوبند اور سہارنپور میں دو عظیم درس گاہوں کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس وقت میرٹھ کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور طلبہ کو دینی علوم، تفسیر و حدیث وغیرہ کا درس بھی دیتے تھے۔ وہ مدرسہ دیوبند کے خصوصی مشیر اور رکن بھی تھے۔ سہارنپور میں مولانا سعادت علیؒ نے مدرسہ مظاہر العلوم میں قرآن و حدیث کا سلسلہ درس قائم کیا۔ اس مدرسہ میں مولانا احمد علیؒ محدث سہارنپوری اور مولانا خلیل احمدؒ محدث سہارنپوری نے اپنے اپنے وقت میں درس حدیث دیا۔ مؤخر الذکر کے شاگرد اور خلیفہ مولانا محمد زکریاؒ "بذل المجهود شرح ابی داؤد" کی تسوید و ترتیب میں اپنے استاد کے ساتھ شریک رہے۔ (۴۶)

<u>۱۸۵۷ء کے بعد علم حدیث کی اشاعت</u>: مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے خانقاہ قدوسیہ گنگوہ میں رہ کر درس حدیث کا ایک مکمل نظام قائم کیا۔ درس حدیث کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کا انتظام بھی تھا۔ آپ کی تقاریر حدیث قلمبند ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا عالم علی محدث نگینوی ثم مراد آبادیؒ نے مراد آباد میں اور ان کے شاگرد مولانا حسن شاہ محدثؒ نے رام پور میں علم حدیث کے درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد شاہ محدث رامپوریؒ نے مدرسہ عالیہ رامپور میں کچھ عرصہ اور زیادہ

تر اپنے مکان اور مسجد میں درس حدیث دیا۔ ان کے شاگرد مولانا محمد صفدر علی رامپوریؒ نے ڈھاکہ میں درس حدیث کا نظام قائم کیا۔

لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے درس و تدریس اور تحریر و تصنیف کے ذریعے علم حدیث کو اور فن رجال حدیث کو بہت ترقی دی۔ ان کے شاگرد مولانا محمد بن علیؒ، ظہیر احسن شوق نیمویؒ نے "آثار السنن" کے نام سے احادیث نبویہ کی کتاب لکھی۔ اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا حصہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ مولانا انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ میں مدرس تھے، اس کی مدح میں دو عربی قصیدے لکھے۔ (۴۷)

مدرسہ اسلامیہ عربیہ امروہہ میں مولانا نانوتویؒ کے شاگرد مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ نے ۲۵۔۲۶ سال مسلسل علم حدیث کا درس دیا۔ آپ کے بعد آپ کے شاگرد مولانا حافظ عبدالرحمان امروہی تیس (۳۰) سال تک اپنے استاد کے مدرسہ میں حدیث و تفسیر کے اسباق پڑھاتے رہے۔ مولانا موصوف نے چند سال تک مدرسہ ڈابھیل ضلع سورت میں بھی درس حدیث دیا تھا۔ (۴۸)

دہلی میں میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے درس حدیث کا سلسلہ دیر تک قائم رکھا۔ مولانا عبدالعلی قاسمیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ اور مولانا محبوب الٰہیؒ مدرسہ عبدالرب دہلی میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ حدیث کا درس بھی مدتوں دیتے رہے۔ (۴۹)

مدرسہ امینیہ دہلی میں بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۲۰ھ تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔ پھر بارہ مولہ کشمیر میں "فیضِ عام" کے نام سے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی اور درس و افتاء کا سلسلہ جاری کیا۔ (۵۰)

بھوپال میں نواب صدیق حسن خان نے فنِ حدیث پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ مولانا عبدالقیوم بوڈھانوی ابن مولانا عبدالحئی بوڈھانویؒ نے بھوپال کے علمی ماحول میں درسِ حدیث کا افادہ عام کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ اور مولانا شاہ حلیم عطا سنونویؒ نے درس حدیث کے ذریعے اشاعت فنِ حدیث کا کام انجام دیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور نے کتاب "سیرۃ النبیؐ" کی چھ ضخیم جلدوں میں تکمیل کر کے اردو دان طبقہ کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باحسن وجوہ روشناس

کرایا۔ پانی پت میں قاری عبدالرحمانؒ آخری دم تک درس حدیث میں مشغول رہے۔ دکن میں مولانا عبداللہ نقشبندیؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ تحریر وتقریر کے ذریعے علم حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس طرح ملک کے ہر صوبے اور ہر بڑے شہر میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے درس حدیث کا سلسلہ برطانوی استعمار کے عہد میں بھی جاری رہا۔ متعدد شاندار کتابیں فن حدیث کے متعلق شائع ہوئیں۔ (۵۱)

علمِ حدیث کی اشاعت وحفاظت میں دارالعلوم کا کردار

اس عظیم درس گاہ کے سب سے پہلے صدر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ تھے۔ انھوں نے تفسیر وفقہ کے ساتھ حدیث کا درس بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے دیا۔ ان کے بعد مولانا محمود حسن مسند صدارت پر فائز ہوئے۔ مدتوں دارالعلوم کی بزمِ حدیث آپ کے انفاس قدسیہ اور آپ کی پُر مغز تقاریر سے شاد کام رہی۔ جب انگریز حکومت نے آپ کو جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا تو وہاں بھی قرآن وحدیث کا درس جاری رکھا۔ اس اسارت سے قبل مکہ معظّمہ میں کچھ عرصہ تک بخاری کا درس دیا۔ مولانا محمود حسنؒ کے جانشین مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہوئے اور آپ نے بھی بہت کامیابی کے ساتھ حدیث کا درس دیا۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ بخاری پر آپ کی تقاریر ''فیض الباری'' کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے حدیث پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی۔ جن میں سے مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا حبیب الرحمانؒ، مولانا محمد بدر عالمؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا محمد شفیعؒ، مولانا محمد صدیق نجیب آبادیؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبدالرحمانؒ کیمبل پوری، مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ، مولانا محمد ذاکرؒ بانی جامعہ محمدی چنیوٹ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مفتی عتیق الرحمانؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، مولانا محمد بہادر شاہ کشمیریؒ، مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم، مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے علوم دینیہ بالخصوص حدیث نبویہ کی نشر و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

کچھ عرصہ تک مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ڈابھیل میں درس حدیث دیا۔ مولانا عثمانیؒ نے "فتح الملھم" کے نام سے صحیح مسلم کی شرح لکھی۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ڈابھیل چلے جانے کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ دارالعلوم کی مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ آپ نے مسجد نبوی میں بھی برسوں تک درس حدیث دیا تھا۔ حدیث پر آپ کی تقاریر کا کچھ حصہ "ھدایۃ المجتبیٰ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے بعد مولانا سید فخر الدین محدثؒ نے اس کام کو سرانجام دیا۔ احادیث کی شرح وتفسیر پر آپ کی تقاریر "ایضاح البخاری" کے نام سے چند جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

خلاصہ کلام

برصغیر پاک وہند میں علم حدیث کی اشاعت وتوسیع کو اس کے ارتقائی مدارج کے لحاظ سے حسبِ ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور: یہ دور آغاز علم حدیث کا ہے جب کہ ہمیں سرزمین عرب سے براہ سندھ اور سواحل سندھ کے بعض دوسرے خطوں میں صرف رواۃِ حدیث کے ورود، بعض مقامی محدثین اور ان کے مدارس کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کی ابتداء قرن اول سے ہو جاتی ہے، جسے ہم سلطان محمود غزنوی کے حملہ یعنی پانچویں صدی ہجری پر ختم کرتے ہیں۔

دوسرا دور: یہ دور سلطان محمود غزنوی کے حملے سے شروع ہو کر آٹھویں صدی پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں علم حدیث کی اشاعت وترویج زیادہ تر درّہ خیبر کے راستے سے آنے والے اصحاب علم کے ذریعے ہوئی۔ جن کا تعلق بالعموم صوفیاء ومشائخ سے تھا۔ اس ضمن میں چند ممتاز محدثین اور ان کی تصانیف آتی ہیں۔

تیسرا دور: یہ دور آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے جب کہ احمد شاہ اول والیٔ گجرات کے عہد میں عرب وہند کا بحری راستہ قائم ہوا اور چند اکابر محدثین حجاز، عراق اور ایران سے ہجرت کر کے یہاں آئے۔ اور ان کی آمد سے علم حدیث کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس میں گجرات کو علم حدیث کی مرکزیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس دور کو توسیعی دور کا

نام دے سکتے ہیں۔ یہ دسویں صدی ہجری کے نصف اول پر ختم ہوتا ہے۔
چوتھا دور: جو دسویں صدی سے گیارہوں صدی تک کا ہے۔ اس میں علم حدیث کی مرکزیت گجرات سے دہلی منتقل ہو جاتی ہے۔ ہم اس دور کو اس علم کے استقلالی دور سے موسوم کرتے ہیں۔ اس دور کی امامت مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ اور مجدد الف ثانیؒ نے کی۔
پانچواں دور: جس کا آغاز بارہویں صدی سے ہوتا ہے۔ اس کو ہم علم حدیث کے تکمیلی دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی امامت کا سہرا حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سر ہے اور تا حال جاری ہے۔

شاہ صاحبؒ بحیثیت محدث

رسول اکرم ﷺ کے مقاصد بعثت کو قرآن مجید میں مختلف سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ارشاد ربانی ہے:

"ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم ایاتك و یعلمھم الکتاب والحکمة و یزکیھم انك انت العزیز الحکیم"۔(۵۲)

سورۃ آل عمران میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا:

" یتلوا علیھم ایته و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمة "(۵۳)

سورۃ جمعہ میں ہے:

" یتلوا علیھم ایته ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمة "۔ (۵۴)

ان آیات میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت مندرجہ ذیل معلوم ہوئے۔

۱۔ تلاوت آیات ۔۲۔ تعلیم کتاب ۔۳۔ تعلیم حکمت ۔۴۔ تزکیۂ نفس ۔

حکمت سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ اس سے مراد سنت یعنی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ صحابہؓ و تابعینؒ جن کی بصیرت قرآنی ہر زمانے میں سند و حجت رہی ہے ان سب کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد حدیث و سنت ہے۔ امام محمد بن ادریس شافعی المطلبیؒ نے بھی حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لی ہے۔ (۵۵)

صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، ائمہ ہدیٰ نے ان مقاصد نبوت پر کام کیا اور العلماء ورثة الانبیاء کے مصداق بنے۔

حضرات قراء مقصد اول کے مظہر ہیں۔ ائمہ تفسیر اور مفسرین سلف مقصد دوم یعنی تعلیم کتاب کے ذیل میں داخل ہیں۔ فقہاء محدثین مقصد ثالث کی تکمیل میں مصروف کار ہیں کیونکہ "الفقهاء هم اعلم بمعاني الحديث" کے مصداق ہیں۔ جبکہ تزکیہ نفوس کی نسبت کے حامل صوفیہ کرام ہیں۔

مقاصد نبوت و بعثت کا تکمیل تک پہنچانا جماعت حقہ اور جماعت باطلہ کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے۔ یعنی اگر کسی جماعت کی حقانیت معلوم کرنی ہو تو دیکھا جائے گا کہ اس جماعت کی تگ و دو، محنت و کاوش کا میدان اگر یہی مقاصد ہیں اور ان کی تحقیقات قراء، مفسرین، محدثین، فقہاء اور صوفیاء کی تحقیقات کے خلاف تو نہیں ہیں تو یہ جماعت حقہ سمجھی جائے گی اور وہ اہل السنّت والجماعت کا صحیح مصداق ہوگی۔

قرون اخیرہ میں جب کہ ہندوستان میں کفر و شرک، بدعات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ عقائد کے پیچ و خم کفر و شرک کی سرحدیں پار کر رہے تھے۔ جاہل صوفیوں اور گمراہ پیروں نے اسلامی اعمال و اخلاق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ رفض و تشیع کی ظلمتیں اذہان پر چھائی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف سیاسی طور پر ملک میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا زوال ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہونہار، سعادت مند اور علوم نبوت سے سرشار فرزند عطا کیے جنھوں نے تزکیۂ نفوس کے موتی اسلامیان ہند کے لیے بکھیر دیئے۔ عقائد کی اصلاح ہوئی۔ کتنی مردہ سنتیں زندہ ہوئیں اور ایک عالم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا۔ کتاب و حکمت کی تعلیم کو عام کیا۔ برصغیر پاک و ہند قال اللہ اور قال الرسول کی صدائے دلنواز سے گونج اٹھا۔ یہ خانوادہ علم و عرفان اس وقت جماعت حقہ کا مصداق بنا، پھر اس خاندان کی خلافت جماعت علماء دیوبند کی حصہ میں آئی۔ ان حضرات میں اللہ تعالیٰ نے قراء، مفسرین، محدثین، فقہاء ارباب فتویٰ اور تزکیہ نفوس و اصلاح کا کام کرنے والے پیدا فرمائے۔

اس جماعت میں یہ حضرات سرفہرست ہیں۔

۱۔مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	۲۔مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
۳۔مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	۴۔مولانا محمد مظہر سہارنپوریؒ
۵۔مولانا احمد علی سہارنپوریؒ	۶۔شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
۷۔مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ	۸۔مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ
۹۔مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ	۱۰۔مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

اس جماعت میں سے صرف مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی خدمات حدیث کو وضاحت سے بیان کرنا ہمارے پیش نظر ہے۔مولانا انور شاہ کشمیری نے چودہویں صدی ہجری میں جو علوم حدیث کی خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف تمام مشاہیر علماء نے کیا ہے۔انھوں نے حواشی وشروح کے علاوہ اصول حدیث،نقد رجال،فقہ وتفسیر،علم الکلام،عربی ادب ہر میدان میں بہت زیادہ علمی خدمات انجام دی ہیں۔صحاح ستہ میں صحیح بخاری سے آپ کو خاص شغف تھا۔جس کے لیے درس کے علاوہ ''فتح الباری'' کا ۱۴،۱۵ مرتبہ مکمل مطالعہ کیا۔مولانا انور شاہ صاحبؒ نے جب ہوش سنبھالا تو ہمارے دینی مدارس کا طرز تدریس ایک خاص مقام پر آکر ٹھہر گیا تھا۔اس طرز میں تقلید کی روش کارفرما تھی۔آپ نے دینی مدارس کو نئے سانچے دیئے،نئے طرز اور نئے افکار سے روشناس کرایا اور نئی منزلوں کی نشاندہی کی۔آپ کے درس کی خصوصیات روایتی طرز سے ہٹ کر تھیں۔درس کی شان بھی ان مقدمات اور محاضرات کی طرح ہوتی تھی جو برسوں کی محنت کے بعد اپنے موضوع پر سند ہوتے ہیں۔

آپ کا ذوق ہمہ گیر تھا،اس لیے علم وفن کے ہر زاویے پر روشنی ڈالتے،مگر عام طور سے جرح وتعدیل کو نہیں چھیڑتے تھے۔اختلافی مسائل کے منشاء اور ماخذ کا پتہ متقدمین کے حوالوں سے دینا پسند کرتے تھے جسے جدید اصطلاح میں FIRST HAND کہتے ہیں۔ آپ نے اس نئے اور انوکھے انداز سے کائنات حدیث میں ایک انقلاب برپا کردیا۔مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس صدی کے ان محدثین میں سے ہیں جنھوں نے ابحاث سے زیادہ مشکلات فن پر توجہ دی جس سے دقیقہ سنجی اور ژرف نگاہی آشکارا ہو جاتی تھی۔حوالہ کی کتابوں،ان کے مصنفین کی خصوصیات اور ان کے علمی مقام کا تعین بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔آپ نے نہ صرف اس انوکھے طرز تدریس کی بنیاد رکھی بلکہ اسے پایۂ تکمیل تک بھی

پہنچایا۔ ہر علمی کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں آپ مبصرانہ اور استادانہ رائے رکھتے تھے۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی۔ اور ایسے مسائل میں وہ مذاہب فقہاء سے زیادہ مقصد شارح پر ہی نظر رکھتے تھے۔

روزنامہ ''زمیندار'' و''سیاست'' لاہور، ہفتہ وار مہاجر دیوبند، الجمعیۃ دہلی میں مولانا انور شاہ کشمیری نے جو مقالات لکھے ہیں، ان سے ان کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے شاگردوں کے تعاون سے ''فیض الباری''، ''العرف الشذی''، ''امالی صحیح مسلم''، جیسی حدیث کی شرحیں لکھ کر آپ نے علم حدیث میں نئے باب کھولے ہیں اور انقلابی اقدام کئے ہیں۔ آپ کا طرز تحقیق نہایت سلجھا ہوا اور سنجیدہ ہے۔ مختلف احادیث میں تطبیق و جمع کی کوشش کرتے ورنہ کسی ایک کو ترجیح دیتے تھے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے طرز تدریس حدیث کو جس بلند مقام پر پہنچایا ہے وہ انھیکا حصہ ہے۔ دینی مدارس کا وہ نظام تعلیم جو صدیوں سے گھسا پٹا چلا آرہا تھا۔ جس میں استاد کتاب کے متن ہی کو شاگردوں کے سامنے پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ آپ نے اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی اور اس نئے طریقہ تعلیم کی مدد سے یہ طرز تعلیم زمانے کے ترقی یافتہ طرز ہائے تعلّم کی صفوں میں شامل ہو گیا۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ وہ شخصیت ہیں جن کی مثال متقدمین میں تو مل سکتی ہے لیکن متأخرین میں ناپید ہے۔ وہ ہستی جس کی بڑائی اور جلالت قدر کے خود اس کے بڑے اور ہم عصر معترف ہوں اجنبی و شناسا، دور و نزدیک سب ہی اس کے گن گائیں۔ اس کی عظمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ شیخ الاسلام فلپائنؒ نے قسم کھا کر کہا کہ آج استاد جلیل (مولانا انور شاہؒ) کے ذریعے حقائق و معارف اور علوم دینیہ کے ایسے بے بہا موتی میرے کان میں پڑے ہیں جو آج تک کبھی نہ سنے تھے اور یہ مجلس ہمیشہ یاد رہے گی۔ (۵۶)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ مقدمہ فیض الباری میں لکھتے ہیں کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ''صحاح ستہ'' کے بارے میں کہتے تھے کہ:

> ''بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے اس لیے کہ اس میں حدیث حسن بھی آجاتی ہے پھر نسائی اس لیے کہ اس کی ''صغریٰ'' میں کامل حدیثیں ہیں۔ ان کے بعد

ابوداؤد ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے صحت کی شرط نہیں رکھی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کی نسائی اور موطاء پر تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صحت کلی نہیں بلکہ جزوی ہے مگر میں (شاہ صاحبؒ) کہتا ہوں کہ نسائی نقد سے مستغنی ہے۔" (۵۷)

سبکی اور ذہبی کے خیال کے مطابق نسائی مسلم سے احفظ ہے۔

" ان نسائی احفظ من مسلم " (۵۸)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق کے مطابق صحیح مسلم نسائی سے بہتر ہے۔ کیونکہ فرق اشخاص کا ہے نہ کہ کتاب کا۔ اس لیے صحیح مسلم بہر حال نسائی سے اصح ہے۔ (۵۹)

طحاوی کو ابوداؤد کے قریب سمجھتے ہیں اس لیے کہ اس کے کل رواۃ معروف ہیں اگر چہ بعض متکلم فیہ بھی ہیں۔ پھر ترمذی کا مقام ہے اور اس کے بعد ابن ماجہ ہے کہ جس میں بیس (۲۰) حدیثوں پر وضع کی تہمت ہے۔ موطا امام مالک کے آثار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہم نے اس پر کلام نہیں کیا۔

مولانا احمد رضا بجنوریؒ مولانا انور شاہ صاحبؒ کی یہ رائے نقل کرتے ہیں کہ:

"امام احمدؒ کے ابتلاء سے قبل تک ائمہ حنفیہ پر ردو قدح نہ تھی۔ اس فتنہ کے بعد یہ چیزیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو خالص محدث تھے یا صرف فقہ سے مناسبت رکھنے والے تھے، انھوں نے اس میں زیادہ حصہ لیا ہے لیکن جو محدث فقیہ تھے وہ محتاط رہے اور بہت سے حضرات نے دفاع بھی کیا ہے بلکہ مناقب ائمہ پر کتابیں لکھی ہیں۔" (۶۰)

شمس تبریز خان آروری نے اپنے مقالہ "مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے افکار و خیالات" میں لکھا ہے کہ مولانا انور شاہ صاحبؒ بیان کرتے تھے کہ:

"حافظؒ نے زمزم پی کر ذہبی کے حافظہ کے لیے دعا کی، سیوطی نے چھ علوم میں مہارت کی دعا مانگی۔ یہ خیال رہے کہ وہ علوم عقلیہ کی کراہیت کے قائل تھے۔ ابن ہمام نے استقامت علی الدین کی دعا کی۔ ابن حجرؒ متون و علل میں ذہبی سے فائق ہیں مگر رجال میں نہیں۔ اسی سفر میں حافظؒ نے "نخبہ" اور ابن ہمامؒ نے "زاد الفقیر" لکھی۔ ابن ہمامؒ نے "فتح القدیر" میں ابن حجرؒ کی ایک

روایت شیخنا کے لفظ سے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شاگرد تھے۔" (۶۱)

مولانا محمد انوریؔ نے اپنے مقالہ "محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیری کی باتیں" میں آپ کا بیان نقل کیا ہے کہ:

"حدیث شریف میں آتا ہے کہ سبحان اللہ و الحمدللہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر، قرآن شریف کے بعد ان کلمات سے بڑھ کر کسی کا ثواب نہیں اور یہ کلمات بھی قرآن شریف میں ہیں اگرچہ یہ سارے قرآن مجید میں ایک جگہ اکٹھے نہیں آئے تاہم اس میں یہ کلمات موجود ضرور ہیں"۔ (۶۲)

خلاصہ یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا۔ جو ایک امتیازی طرز لیے ہوئے تھا۔ آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا۔ آپ نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ آج بھی نمایاں علماء اور صاحب طرز فضلاء زیادہ تر آپ کے تلامذہ ہیں جو پاک و ہند میں علمی مسندوں کو آراستہ کیے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی بلند خدمات، بے مثال تحقیقی کارناموں اور عظیم الشان تفردات کی بدولت اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک علم حدیث کی کائنات قائم ہے۔

محدثین اور ان کے مذاہب: مولانا بنوریؒ لکھتے ہیں کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ مختلف محدثین کے فقہی مسالک پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

" ان البخاری مجتهد لاریب فیه وما اشتهر أنه شافعی فلموا فقة ایاء فی المسائل المشهوره و الا فموا فقة للامام الاعظم لیس أقل مما وافق فیه الشافعی و کونه من تلامذة الحمیدی لاینفع لانه من تلامذة اسحق ابن راهویه ایضا وهو حنفی فعده شافعیا با عتبار الطبقة لیس باولی من عده حنفیا واما الترمذی فهو شافعی المذهب لم یخالفه صراحة الافی مسئلة ابراد والنسائی وابوداؤد حنبلیان صرح به

الحافظ ابن تيميه، وزعم آخرون انهما شافعيان۔ و أما مسلم و ابن ماجه فلا يعلم مذهبهما۔ و أما ابواب مسلم فليست مما و ضعها المصنف رحمته الله تعالى بنفسه ليستدل منها على مذهبه "۔(۶۳)

ترجمہ: بلاشبہ امام بخاریؒ مجتہد ہیں، یہ جو مشہور ہے کہ وہ شافعی مسلک ہیں تو یہ امام شافعیؒ کے مشہور میں موافقت کی وجہ سے ہے، ورنہ ایسے مسائل بھی ہیں جن میں وہ امام اعظمؒ کی موافقت کرتے ہیں۔ وہ مسائل بھی امام شافعیؒ کے مسائل سے کم نہیں ہیں۔ امام حمیدی کے شاگرد ہونے کی بات قابل عمل نہیں کیونکہ وہ اسحاق بن راہویہ کے بھی شاگرد ہیں اور وہ حنفی ہیں ان کا شافعی شمار طبقہ کے اعتبار سے ہے۔

امام ترمذیؒ شافعی المذہب ہیں لیکن انھوں نے کھل کر مخالفت نہیں کی سوائے مسئلہ ابراد کے اور امام نسائیؒ اور امام ابی داوٗدؒ حنبلی مسلک ہیں جس کی وضاحت امام ابن تیمیہؒ نے کی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ شافعی ہیں، امام مسلمؒ اور ابن ماجہؒ دونوں کا مذہب معلوم نہیں اور ابواب مسلم جن کو مصنف نے خود نہیں لکھا جس سے ان کے مذہب پر کوئی دلیل مل سکے۔

صحیح حدیث کی تعریف: مولانا انور شاہ کشمیریؒ صحیح حدیث کی یہ تعریف کرتے تھے :

۱۔ راوی ثقہ، عادل اور توارث وتعامل بھی ہو۔

۲۔ یا جسے ائمہ نے صراحۃ تخریج کیا ہو۔

۳۔ یا ان کتابوں میں ہو جن میں صحت کا التزام ہو جیسے صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن، صحیح ابن حبان ونسائی۔

۴۔ اس کے راوی جرح سے محفوظ ہوں۔ (۶۴)

امام اعظم اور محدثین: امام صاحب کے ساتھ بعض محدثین نے جو رویہ اختیار کیا ہے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق اس سلسلہ میں یہ ہے :

''یحییٰ بن سعید قطانؒ امام صاحبؒ کے مذہب پر فتویٰ دیتے ہیں۔ ابن معین (حنفی) کا کہنا ہے کہ یحییٰ سے امام صاحبؒ کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا ''مارأینا احسن منہ رأیا وھو ثقہ و انی لم أسمع احداً یجرح علی الامام ''۔ اور امام ابن معین نے امام شافعیؒ پر جرح کی ہے۔ دارقطنی تک امام صاحب اور حضرت انس کی ملاقات کے قائل ہیں۔ ابن جریرؒ نے امام صاحبؒ، اوزاعی اور امام شافعیؒ کی فقہ ترتیب دی تھی مگر امام احمدؒ کو فقیہ نہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بیہقی نے بھی امام صاحبؒ پر جرح نہیں کی مگر امام بخاریؒ تو ہجو ملیح پر اتر آتے ہیں اور نسائی نے تو انھیں ضعیف بناڈالا تھا امام مسلمؒ کا رویہ نہیں کھلتا۔ ترمذی خاموش ہیں۔ (ص ۱۹۵ دیکھئے) ابن سید الناسؒ اور دمیاطیؒ امام صاحبؒ کے دل سے قائل ہیں۔ عراقی کا حال معلوم نہیں۔ آخر میں حافظ ابن حجر ہیں جنھوں نے حنفیت کو نقصان پہنچانے میں پورا زور صرف کر دیا۔ حتی کہ امام طحاویؒ کے ''مثالب'' پر کتاب لکھی، حالانکہ امام طحاویؒ مرجع وقت تھے اور ہر معاصر ان کا تلمیذ تھا''۔ (۶۵)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ ابن خلدون مغربی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے لکھا ہے:

''لقد سمعت کثیراً من شیوخنا رحمھم اللہ تعالیٰ یقولون شرح کتاب البخاری دین علی الامۃ یعنونون ان احداً من علما الأمۃ لم یوف ما یجب لہ من الشرح لھذا الاعتبار'' (۶۶)

ترجمہ: ''میں نے اپنے بہت سے شیوخ سے سنا کہ صحیح بخاری کی شرح امت پر قرض ہے یعنی کسی نے بھی اس کا وہ حق ادا نہیں کیا جس کی وہ مستحق تھی۔

اس پر حافظ شمس الدینؒ السخاوی تلمیذ ابن حجرؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الضوء الامع'' میں لکھا ہے کہ:

''ان ذلک الدین قضاہ شیخنا الحافظ شیخ الاسلام ابن حجر بشرحہ ل'' صحیح البخاری '' '' فتح الباری '' ۔(۶۷)

یعنی فتح الباری لکھ کر ہمارے شیخ نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ مولانا بنوریؒ لکھتے ہیں کہ مولانا محمود حسنؒ نے کہا:

"لم یوف الحافظ حق تراجم الصحیح" ۔(۶۸)

مگر حافظ سے ابواب وتراجم کا حق ادا نہیں ہوا۔ بہت سے ابواب ابھی تک تشنۂ تحقیق ہیں۔

مولانا موصوف آگے لکھتے ہیں:

"ولو کمل ماحاوله مولانا شیخ الهند لقضی دین الترجم والاسف انه لم یکمل"۔ (۶۹)

اگر شیخ الہندؒ صحیح بخاری کے ابواب وتراجم کی شرح مکمل کر لیتے تو تراجم کا قرض ادا ہو جاتا۔ افسوس اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ مولانا محمود حسنؒ کے متعلق کہتے تھے:

''ہمارے شیخ محمود حسنؒ مسند الوقت ہیں۔ ان پر ہمارے ملک میں اسناد حدیث کا مدار ہے۔ وہ اپنے مشائخ کے طریقے پر قائم ہیں۔''(۷۰)

آپ نے اسی مسند الوقت سے صحیح بخاری، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور صحیح مسلم جیسی احادیث نبویﷺ کی عظیم الشان کتابیں پڑھیں۔ صحاح ستہ کے علاوہ سنن اور مسانید وغیرہ کتب حدیث کی تقریباً دو سو سے زائد شروح کا مطالعہ کیا۔ جن میں تیس شرحیں صحیح بخاری کی تھیں۔ عمدۃ القاری للعینی کا مطالعہ دوران تعلیم درس بخاری شروع ہونے سے پہلے ماہ رمضان میں کر لیا تھا۔ پھر دوران درس ''فتح الباری'' کا مطالعہ جاری رکھا۔ صرف صحیح بخاری کا بغیر حواشی و بین السطور کا تیرہ مرتبہ مطالعہ کیا۔(۷۱)

ایک مرتبہ سترہ دن بیمار رہے لیکن درس میں جا کر معلوم ہوا کہ:

"انه لم یصل الدرس الی موضع بلغت الیه مطالعتی۔" (۷۲)

وسعت معلومات، علم حدیث کے لیے غیر معمولی حافظہ، ذکاوت، قوت مطالعہ، متون وشروح حدیث کی اطلاع، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل، طبقات رواۃ کی واقفیت، تقویٰ، زہد اور ورع درکار ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں قدرت نے آپ کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، علامہ کشمیریؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں جسے ''بینات'' میں درج

کیا گیا ہے:

"اذا طلعت کتابا" مرتجلاً ولم ارداد خار مباحثه يبقى فى حفظى الى نحو خمس عشره سنة۔"(۷۳)

اصولِ حدیث: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اصول حدیث میں بھی اضافے کئے۔ تواتر کی تقسیم اوراس کی اقسام اربعہ کا ذکر کیا۔

۱۔تواتر الاسناد۔۲۔ تواتر الطبقه۔۳۔ تواتر التعامل۔٤۔تواتر القدر المشترك

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنی کتاب "فتح الملہم" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وهذه الاقسام الاربعة للتواتر وان كانت جزئياتها منتشرة فى كتبهم لكنهم لم يكونوا يذكرونها عند التقسيم و اول من اربعة القسمة وسمى كل قسم باسمه فيما نعلم الشيخ العلامة الانور وهو تقسيم حسن"۔

ترجمہ: تواتر کی یہ چار قسمیں ہیں، اگرچہ ان کی جزئیات کتب اصول میں منتشر اور پراگندہ ہیں لیکن تواتر کی تقسیم کے وقت لوگ ان کو بیان نہیں کیا کرتے تھے۔سب سے پہلے جس نے چار قسمیں بیان کیں اور ہر قسم کا علیحدہ نام رکھا وہ شیخ علامہ انور شاہؒ ہیں اور یہ تقسیم بہتر ہے۔

آپ ہی نے حدیث صحیح کی چار اقسام ذکر کیں۔ اس کے ساتھ حدیث غریب کی قسمیں بھی بیان کر دیں۔ علاوہ ازیں تعبیرات تبدیل کیں۔ رجال کے متعلق بعض غلطیوں کی نشاندہی کی اور رجال ورواۃ کے متعلق ایک ضابطہ بیان کیا:

"ولم اكثر من نقل كلامهم فى الرجال و ما فيه من كثرة القيل والقال، لانه ليس له عندى كبير ميزان فى الاعتدال و بعضهم

• يسكت عند الوفاق يجرح عند الخلاف"۔(۷۴)

ترجمہ: "رجال کے سلسلہ میں میں نے زیادہ اقوال کا ذکر نہیں کیا اور نہ اس میں زیادہ قیل وقال ذکر کی کیونکہ میرے نزدیک اس سلسلہ میں بجانب اعتدال کوئی میزان نہیں ہے، لوگوں کی عادت ہے کہ اتفاق کی صورت میں سکوت اختیار

کرتے ہیں اور اختلاف کی صورت میں جرح کر دیتے ہیں"۔

اعلالِ حدیث: مولانا انور شاہ کشمیریؒ حدیث کے اعلال کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"والذی ینبغی ان یعتقد فیہ ان ما صح سندہ اصطلاحا ثم وجد عمل بعض السلف بہ وھو صحیح فی الواقع لایسمع فیہ اعلال ولاتعلل کما یفعلہ الناس من النقد عند الخلاف والمسامحۃ عند الوفاق ۔"(۷۵)

ترجمہ: "اس سلسلہ میں اس بات پر اعتماد کرنا چاہیے کہ اصطلاح کے لحاظ سے جس حدیث کی سند صحیح ہو اور پھر بعض سلف کا عمل بھی اس پر ثابت ہو تو وہ حدیث واقعی صحیح ہے۔ اس میں اعلال وتعلیل کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے کہ اختلاف کے وقت تو تنقید کرتے ہیں اور اتفاق کے موقع پر چشم پوشی کرتے ہیں"۔

علاوہ ازیں آپ نے حنفیہ کی بعض تعبیرات تبدیل کیں اور ایسی تعبیرات اختیار کیں جن پر اعتراض واقع نہ ہو یا کم سے کم ہو۔ مثلاً: حنفیوں کی مشہور تعبیر ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ اس کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی جائز ہے۔ لیکن رکنیت اور شرط کے مرتبہ میں نہیں بلکہ وجوب یا سنت کے مرتبے میں۔(۷۶)

آپ میں حدیث اور علوم حدیث کے سلسلہ میں ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے آپ کو مسند الوقت اور امام الحدیث بنا دیا تھا۔ اِنھی جامع خصوصیات کی بنا پر علامہ عثمانیؒ کہتے ہیں:

"اگر تم مجھ سے پوچھو کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر، حافظ تقی الدین بن دقیق العید، سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا تھا؟ تو اگر میں ہاں کہہ دوں تو سچا ہوں گا کیونکہ میں نے انور شاہ کو دیکھا تھا اگر موصوف ان علماء کے دور میں ہوتے تو یہی ہوتے"۔(۷۷)

علومِ حدیث میں آپ کی جامع خصوصیات

مولانا محمد یوسف کیمبل پوریؒ کے عربی مقالے سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو انور شاہ کشمیریؒ کی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ یہ عربی مقالہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے "نفحة العنبر" میں شامل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

آپ حدیث کی تحقیق میں متقدمین کے طرز پر چلتے تھے۔ حدیث کی بحث وتنقید کے فن میں امام تھے۔ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر قرآن وحدیث، فقہ وکلام، لغت وعربیت اور تصوف کا عالم نہیں تھا۔ ہر نوع پر عقلی علوم کے ماہر تھے۔ اپنے تلامذہ کو چوٹی کے حفاظ اور شارحین حدیث کی کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دیتے تھے۔ کلمہ حکمت ان کی متاع گم گشتہ تھی۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا اور اپنے زمانے کے سر برآوردہ حضرات نے فتاوٰی اور مشکلات میں ان سے فیض پایا۔ علماء کے لیے ان کی شخصیت لائق رشک تھی۔ اس لیے سب نے اُنھی کی روش اختیار کی اور جمود کو چھوڑ کر تحقیق مطالعہ حدیث میں کافی ترقی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کمال کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ الغرض آپ ہندوستان میں خاتم المحد ثین اور حدیث کی نشاہ جدیدہ کے امام تھے۔ ان کے دور سے پہلے لوگ حدیث میں معمولی حصہ پر اکتفاء کرتے تھے اور ان کی انتہائی کاوش یہ ہوتی تھی کہ جب کوئی ایسی حدیث سامنے آئے جو ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے فقہی مسلک کے خلاف ہو تو اس کی تاویل کے درپے ہوں، بغیر اس کے کہ طرق حدیث کو تلاش کر کے اختلاف طرق کا سراغ لگائیں۔ (۷۸)

حفاظت حدیث اور محدثین: کلام الٰہی کے بعد حدیث مبارکہ سے زیادہ کس کلام کی وقعت ہو سکتی ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

"انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون"۔ (۷۹)

مگر قرآن مجید کی حفاظت کے ساتھ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس طرح کہ قرآن حکیم کی حفاظت پر توجہ دی گئی اس طرح حدیث نبوی ﷺ کا اہتمام قرن اول میں کیوں نہیں ہوا؟۔ اس کا جواب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ یہ دیتے ہیں:

"یہ امر اتفاقی نہیں بلکہ قصداً اور اراداتاً اس لیے کیا گیا تھا کہ کہیں حدیثوں کا سرمایہ قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کریم کے برابر نہ ہو جائے۔" (۸۰)

اس سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے :

"وان جمع الاحادیث فی زمنه صلی الله علیه وسلم وان کان احسن فی باری الرأی الأن المرضی عند ذلك كان أن لاتدوّن الحدیث مثل تدوین القرآن ولاتحفظ حفظ"(۸۱)

اس کے بعد آپ بیان کرتے ہیں کہ دین میں علم حدیث سے پیدا ہونے والے نتائج کی ثانوی حیثیت ہے، اس کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ کسی اتفاقی حادثہ کا یہ اتفاقی نتیجہ ہے بلکہ شروع ہی سے ارادہ ہی کیا گیا کہ حدیثوں کا یہ سرمایہ:

"لاتنتهی فی الحتم نهایة، ولاتبلغ فی الاهتمام باألفاظها مبلغه، ولا ینبغی عنه الاختلاف والشبهات نفیها عنه بل تبقی فی مرتبه ثانویة یمشی فیها الاجتها د وتفحص العلماء وغور الفقهاء وبحث المحدثین۔"(۸۲)

ترجمہ: یعنی قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہونے اور نہ اس کے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے (جو قرآن کی تدوین میں دکھائی گئی) بلکہ تعمداً و ارادۃً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا (کہ قرآن کے مقابلہ میں) ان کا درجہ دوسرا ہو گیا۔ ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء نے اجتہاد اور تحقیق و تدقیق کی۔ فقہاء کی فکر و نظر اور محدثین کی تلاش و جستجو کی گنجائش ان میں پیدا ہوگئی۔ اور یہ کس لیے کیا گیا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں :

"لینفسح علیهم امر الدین ویتوسع علیهم من کل جانب"۔(۸۳)

ترجمہ: تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں ان کو میسر آجائیں۔ اس سمت اشارہ بھی کرتے ہیں:

"و صدق حیث مال : ان الدین یسر " (۸٤)

تفقہ فی الحدیث

مرتبۂ واجب: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے مرتبۂ واجب کو اصولی تحقیقات کے تحت اس طرح بیان کیا ہے کہ۔ باب ماجاء فی مفتاح الصلواۃ الطهور کی شرح میں ''اللہ اکبر'' ابتداء میں اور ''السلام'' انتہاء میں مرتبہ واجب کو لیے ہوئے ہیں۔ احناف اس کے قائل ہیں۔ ہم اس اجمال کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں :

حدیث کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ متواتر۔ ۲۔ مشہور۔

۳۔ خبر واحد اور معلوم ہے کہ احناف نصوص قطعی پر خبر واحد سے اضافہ جائز نہیں سمجھتے جب کہ شوافع اور ان کے ہم خیال اس اضافہ کو درست قرار دیتے ہیں۔

مولانا انور شاہؒ کی تحقیق: آپ کی تحقیق کا مفہوم اس طرح ہے کہ احناف کا مذہب علی الاطلاق صحیح بیان نہیں ہوا، وہ بھی اضافہ کی صحت کے قائل ہیں لیکن رکن یا شرط کے درجہ میں نہیں بلکہ وجوب وسنت کے درجے میں اس لیے خبر واحد وجوب وسنت کو ثابت کرے گی نہ کہ رکن و شرط کو۔ اس لیے قطعاً لاعلمی ہے کہ احناف کو خبر واحد کا تارک سمجھ لیا جائے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس چیز کا ثبوت دلائل ظنیہ سے ہو اس کے شرائط و ارکان خبر واحد سے ثابت کئے جا سکتے ہیں جو خود دلیل ظنی ہیں۔ لہٰذا ظن کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اثبات شرط کے لئے مفید نہ ہوگی۔ شوافع نے ظن کو قطعیت کا درجہ دے دیا ہے۔ اس لیے وہ خبر واحد سے رکن اور شرط ثابت کرتے ہیں۔ اصول وضوابط کے تحت اگر غور کیا جائے تو اس مبحث میں احناف کا مذہب قریب بصحت ہے۔ یہ اس لیے کہ جو چیز ثبوتاً ظنی ہوگی وہ صرف واجب کو ثابت کر سکتی ہے، رکنیت کے لیے کس طرح مفید ہوگی؟ پھر یہ بھی ہے کہ واجبات صرف عادات میں ہیں۔ معاملات میں نہیں۔ شریعت معاملات میں شرائط و ارکان کو ذکر کرتی ہے۔ فرائض و واجبات کو نہیں۔ شوافع حج میں واجب الشئے کو مانتے ہیں جبکہ نماز میں اس کے منکر ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے "مناھج السنة" میں لکھا ہے کہ نماز ابوحنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ بن حنبل کے خیال میں فرض، واجب اور سنت سے مرکب ہے اور امام شافعیؒ نماز کی ترکیب

صرف فرائض اور سنن سے مانتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ اور حنابلہ واجب الشئی کے قائل ہیں۔ حنابلہ قاعدہ اولیٰ کو فرض کہتے ہیں اور اس کے ترک کو سجدہ سہو سے صحیح کرتے ہیں۔ یہ مرتبہ واجب کی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اس لیے یہ حضرات اصطلاحات میں اختلاف کر رہے ہیں احکام میں کوئی اختلاف نہیں۔ احناف نے حج و نماز میں شارع کی جانب سے بعض چیزیں مؤکد پائیں اور ان کی کمی کو کسی فساد کے بغیر تدارک کرتے ہوئے نہیں پایا تو ایسی چیزوں کو واجب کے درجہ میں لے لیا۔ (۸۵)

آپ درس کے شروع میں اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر اور اس لیے کہ وجوب کا مسئلہ مختلف فیہ ہے تفصیل سے بیان کرتے۔ آپ نے دلائل کی مندرجہ ذیل چار اقسام کو بھی بیان کیا ہے:

۱۔ قطعی الدلالۃ و قطعی للثبوت۔ یہ دلیل مامورات و منہیات میں ایک کی فرضیت اور دوسرے کی حرمت کو ثابت کرتی ہے۔

۲۔ ظنی الدلالۃ و ظنی الثبوت ۔ یہ اگر منہیات میں ہو تو کراہت تنزیہی کو بتائے گی اور بجانب امر اس کے مستحب ہونے کو واضح کرے گی۔

۳۔ ظنی الثبوت و قطعی الدلالۃ

٤۔ قطعی الثبوت و ظنی الدلالۃ۔ ان کا تعلق اگر اوامر سے ہے تو ان کا وجوب یا مسنون ہونا ظاہر کریں گے اور اگر منہیات سے ہے تو پھر کراہت تحریمی ثابت ہوگی۔

انما الاعمال بالنیات

بخاری شریف کی مشہور اور پہلی حدیث ہے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ:

> ''اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہو تو جس نے اللہ اور رسول اللہ کی خاطر ہجرت کی تو وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی شمار ہوگی''۔

اس حدیث میں عمل اور نیت کے متعلق وضاحت کی گئی ہے جسے امام بخاری سات جگہ

لائے ہیں۔اس حدیث میں شارحین نے طویل درطویل بحثیں کی ہیں اوراس کے مطلب کو واضح کرنے کے لیے مختلف النوع الفاظ کوبطور ''بالنیات'' کے متعلق بہ کے مقدر مانا ہے۔ جس کا تذکرہ ابن حجرؒ نے بایں الفاظ کیا ہے:

''فقیل تعتبر و قیل تکمل وقیل تصح و قیل تحصل و قیل تستقر ''۔ (۸۷)

پھر الفاظ مقدرہ کے اختلاف کی بنیاد پر حنفیہ اور شوافع کے درمیان بھی یہ حدیث معرض بحث میں آئی اور ہر ایک نے اپنے مسلک کی تائید میں قوت صرف کی لیکن مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا کہنا ہے کہ اس مباحثہ اور طویل تقریروں کا شارع علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں مسائل فقہ بتلانے مقصود نہیں ہیں بلکہ سادہ انداز میں یہ آگاہی مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعمال کا اعتبار نیت کے مطابق ہوتا ہے، اگر ظاہر میں کسی نیک کام کو کرتے وقت ارادہ قلبی اور دلی نیت خیر کی ہے تو وہ خیر ہے اور اگر نیت میں برائی ہے تو وہ عمل بھی برا ہوگا۔ مثلاً جہاد میں شرکت کا حقیقی مقصد اگر محض اظہار شجاعت یا دنیاوی امر میں دشمنی کی بنا پر انتقام لینا ہے یا مال غنیمت مقصود ہے۔ اس طرح انفاق مال سے مطلوب دکھاوا اور بڑائی جتلانا ہے تو ان اعمال کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور نہ یہ قبول ہوں گے بلکہ مزید گناہ ہوگا کہ اعمال صالحہ کو غلط ارادہ اور بد نیتی کی گندگی سے ملوث کر دیا۔ (۸۸)

پھر نیتوں کے اخلاص میں قوت وضعف اور زیادتی وکمی کے لحاظ سے فرق مراتب ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے مناسب اعمال کے درجات میں بھی عنداللہ فرق مراتب ہوگا۔ حدیث کی اس سادہ تشریح کے بعد ظاہر ہے پھر کسی لمبی تقریر کی ضرورت نہیں رہتی۔ (۸۹)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی اس تشریح سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث میں ''تعتبر'' کے مقدر ماننے کو صحیح سمجھتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ نے مانا ہے۔ (۹۰)

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں فرمایا گیا:

"لیس منا من لم یتغن بالقرآن" (۹۱)

وہ ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن پاک کے ساتھ تغنی نہ کرے۔

اس تغنی کے معنی بَر بنائے احتیاط یہ لیے گئے کہ جو قرآن حکیم کے ذریعے اپنے اندر غناء نفس پیدا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے لیکن الفاظ کی لغوی تحقیق اور جملہ کی مجموعی ترکیب سے یہ معنی بخوبی منطبق نہیں ہوتے بلکہ دیکھنے سننے والوں کو کچھ تشنگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس کے معنی بالکل مختلف انداز سے یہ بتلاتے ہیں کہ جو شخص قرآن حکیم کو اپنے غنا (خوش آوازی) کی جگہ نہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہیے کہ گانے کے بدلے قرآن پاک کے ذریعے اپنے دل کو راحت بخشے۔ یہ انسانی طبیعت کی خصوصیت ہے کہ وہ مغموم وافسردہ ہوتا ہے تو اس کا دھیان گانے کی طرف مائل ہونے لگتا ہے تو شریعت مطہرہ نے تعلیم دی ہے کہ ایسی حالت میں بھی سکون قلب اور راحت کا سامان بجائے گانے کے قرآن سے حاصل کیا جائے۔ (۹۲)

<u>حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ:</u> امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت لے کر اس کی تحسین کی ہے جس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"بیت اللہ کے پاس جبرائیل علیہ السلام نے دو مرتبہ یعنی دو دن امامت کی اور پہلی مرتبہ میں اولاً ظہر کی نماز پڑھی، اس حدیث میں عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نماز کا اول اوقات پنجگانہ میں پھر دوسرے دن پانچوں نمازوں کی آخری اوقات پنجگانہ میں امامت کا تذکرہ ہے۔" (۹۳)

اس حدیث کے بارے میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے ایک سوال و جواب نقل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے امامت کے لیے آغاز نماز ظہر سے کیوں کیا؟ نماز فجر سے کیوں نہیں کیا؟ جب کہ شبِ معراج میں صبح کے وقت ہی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ استراحت فرمارہے تھے اس لیے جبرائیل علیہ السلام نے بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر ظہر کے وقت آکر امامت کی۔ (۹۴)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور جواب دینے والے پر اصل بات واضح نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعہ خلط ملط ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج سے پہلے ہی فجر اور عصر کی نماز پڑھتے تھے اس لیے آپؐ کو ان نمازوں کی تعلیم دیئے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ صحیحین میں ہے کہ آپ نے عکاظ جاتے وقت نخلہ میں نماز پڑھی اور آپ کی جہری قرأت کو جنات نے سنا تھا۔ بہر حال اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آپ نماز فجر وعصر پڑھا کرتے تھے۔ البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ وہ دونوں قبل معراج فرض تھیں یا نفل۔ اکثر حضرات نفل کہتے ہیں لیکن مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ جب معراج سے قبل اور بعد ان نمازوں کی یکساں نوعیت رہی تو پھر نفل اور فرض کا فرق کیوں قائم کیا جائے۔(۹۵)

حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں آسمان پر آتے اور جاتے وقت بیت المقدس میں نماز پڑھی تھی۔ جاتے وقت تحیۃ المسجد تھی اور آنے پر نماز فجر تھی۔ اور یہ روایات میں آیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نماز فجر کے وقت آئے تھے۔ جیسا کہ دارقطنی نے اس روایت کی تخریج کی ہے، میرے نزدیک اس میں راوی کا وہم ہے اور اس کے یہاں جبرائیل علیہ السلام کی آنحضرت ﷺ کو تعلیم نماز اور آنحضور ﷺ کا مدینہ کے ایک آدمی کو تعلیم نماز کی بات خلط ملط ہوگئی۔ آپ نے اس آدمی کو جو نماز کی تعلیم دی تھی اس میں بلاشبہ سب سے پہلے نماز فجر ہی تھی۔(۹۶)

آغازِ وحی

وحی اور اس کی حقیقت، نزولِ وحی، وحی کی حفاظت وصیانت، وحی کا مخاطب کون ہوتا ہے؟ کن اوصاف سے متصف شخصیت کو وحی کا مخاطب بنایا جاسکتا ہے؟ ۔۔۔ یہ امور قرآن وحدیث میں جستہ جستہ مذکور ہوئے ہیں۔ اہل علم نے ان عنوانات پر سیر حاصل مباحث کا انبار لگا دیا ہے۔ سیدنا امام بخاریؒ جو اسرار ورموز شریعت کے دانا اور فن حدیث کے واقعی شناسا وشناور ہیں۔ انھوں نے عنوانات اور حدیث کی ترتیب میں اہم حقائق کی طرف اشارے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کی ابتداء آنحضور ﷺ پر آغاز وحی کس طرح

ہوا تھا'' سے کی ہے۔اس جلیل القدر امام نے قرآن مجید کی ایک اہم آیت کو عنوان باب بنایا جس میں آنحضور ﷺ کی نبوت و رسالت کا اثبات، مشرکین مکہ ومخالفین کی وحشت کا ازالہ، آپؐ کی طرف آنے والی وحی کی نوعیت کا تعین، وحی کی کیفیت، نزول کی تشخیص یہ سب سے مضامین آگئے ہیں۔ یہ امام بخاری کی ذہانت ہے کہ انھوں نے قرآن مجید سے ان آیات کا انتخاب کیا جو اس مقصد کے لیے جامع ہیں۔ وہ اس سے یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ دین کی بنیاد اور اس کا مدار صرف وحی پر ہے۔مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

سب سے پہلے اس ثبوت کی ضرورت ہے کہ ہمارا تعلق خدا سے وحی کے ذریعے سے ہوا ہے۔اسے ثابت کرنے کے لیے علم وعمل کی ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے پہلے وحی پر باب قائم کیا۔اس سے متصلاً علم کا پھر عمل کا۔علم ہی وہ ذریعہ ہے، جو ثبوت مع اللہ کے ساتھ خود وحی کو بھی منکشف کرے گا اور پھر اپنی صحیح معلومات پر عمل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ امام بخاریؒ نے اس ترتیب طبعی کو بھرپور انداز میں ملحوظ رکھا ہے اور یہی ان کی فقاہت کی دلیل ہے۔(۹۷)

یہی حدیث ہے جس سے آغاز وحی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔صحیح بخاری کے شارحین لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے عنوان کی تین طرح قرأت ہوسکتی ہے:

بابٌ کیف کان بدوُ الوحی

بابُ کیف کان بدوُ الوحی

بابُ کیف کان بدوُ الوَحی (۹۸)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو فترۃ کا دور تھا، جس میں وحی کے سلسلے منقطع ہوگئے تھے۔ پھر وحی کا آغاز کس طرح ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ وحی جو مختلف انواع واقسام پر مشتمل ہے کس طرح ظہور پذیر ہوئی۔ یہ مطلب نہیں کہ وحی کے متعدد اجزاء میں سے پہلے جز کی کیفیت بیان کرنا پیش نظر ہے۔وحی کو اگر اجزاء پر تقسیم کیا جائے اور اس کا پہلا جز مراد لیا جائے تو پھر یہ اشکال ہوگا کہ صرف غار حرا والی حدیث میں وحی کے پہلے جز کا تذکرہ امام بخاریؒ کے لیے کارآمد ہے۔جبکہ ذکر کردہ

حدیث کا بڑا حصہ عنوان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا لیکن میری توجیہہ میں وحی کو تمام متعلقات وحی پر حاوی کیا گیا ہے۔جس سے یہ اشکال نہیں ہوسکتا۔(۹۹)

حقیقۃ الوحی

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ صحیح بخاری کی مشہور حدیث پر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کلام کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

" اما الوحی الکلام فیه فالحق أنه خارج عن موضوعنا کما ذکره الشیخ الاکبر فی الفتوحات، أن مالا یحصل لنفسه لا یدرك کنهه ۔ و ذکر أنه دخل مرة فی ملأ من الاولیاء وهم فی ذکر من المقام الموسوی فوکلو الکلام الیه فقال : لا یحل لی ان أتکلم فیه ، لأنه لا یحصل لی فکذالك الوحی لا یدرك کنهه الالمن اتصف به، ولم یرو فی هذا الباب عن السلف کثیر شئ، الاماروی عن ابن عباس رضی الله تعالٰی عنه ان الوحی هو القذف فی القلب ولم ینفصل الامر منه، فان القذف و القذف یتغایران فلا ندری ما کیفیته، فأ ننا ایضاً نقذف فی قلوبنا۔ والأ ولی عندی أن یقتصر علی ما اقتصر علیه النص ۔" (۱۰۱)

ترجمہ۔حقیقت یہ ہے کہ وحی اور اس کی حقیقت پر گفتگو کرنا ممکن نہیں، شیخ اکبر نے "فتوحات" میں لکھا ہے کہ جو چیز تم کو حاصل نہ ہو سکے، تم اس کی دریافت حقیقت سے بھی عاجز ہو۔ یہی شیخ اکبر لکھتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اولیاء کی جماعت میں پہنچا تو وہ مقام موسیٰ علیہ السلام پر گفتگو کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے کہ آپ بھی رائے دیں؟ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں گفتگو نہیں کر سکتا، اس لیے کہ میں خود مقام موسیٰ علیہ السلام پر نہیں پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ سلف نے وحی کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کی۔صرف حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما

کہتے ہیں کہ وحی کا مطلب ہے دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ میں کہتا ہوں اس سے بھی وحی کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ ہمارے دل میں بھی کچھ چیزیں ڈالی جاتی ہیں تو کیا وہ وحی کہلائیں گی؟ بہتر یہی ہے کہ نص قرآنی پر ہی اکتفا کیا جائے۔

وحی کی اقسام

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ وحی کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان الوحی علی ثلاثه أنحاء: الاول أن یسخر باطن الموحی الیه الی عالم القدس ثم یلقی فی باطنه فلاتوسط للملك فی هذا النوع ـ الثانی ما یکون فیه دخل الحواس الموحی الیه فسمع فیه الصوت وهو صوت الباری عند البخاری بحیث لا یشبه أصوات المخلوقین لیس فیه مخارج ولا تقطیع وقال الشیخ المجدد السرهندی :ولیس بجزء ولا کل و لیس بزمانی ولا مکانی، والثالث أن یجئ الملك وهو علی نحوین: الأول أن یسخر الملك باطن النبی۔ والثانی أیتمثل بنفسه فی صورة البشر (۱۰۲)

کقوله تعالی : فتمثل لها بشراً سویا۔(۱۰۳)

ترجمہ:وحی کی تین قسمیں ہیں:(۱) جس پر وحی کی جاتی ہے،اس کے باطن کو کلیۃً عالم قدس کی طرف متوجہ کرلیا جاتا ہےاور پھر وحی کا القاء ہوتا ہے یہ سب کچھ فرشتے کے واسطے کے بغیر ہوتا ہے۔

(۲) جس پر وحی کی جاتی ہےاس کے حواس بدستور کام کرتے ہیں،وہ اللہ تعالیٰ کی آواز سنتا ہے،یہ آواز مخلوق کی آواز سے قطعاً ممتاز ہوتی ہےاوران تمام اسالیب سے جدا ہوتی ہے جو مخلوق کی آواز میں ہوتے ہیں۔حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس قسم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ جزئی وکلی زمانی وغیر

زمانی کی تقسیم میں نہیں آسکتی۔

(۳) وحی کی تیسری قسم یہ ہے کہ اس میں فرشتہ آتا ہے، اس کی دوصورتیں ہوتی ہیں پہلی یہ کہ فرشتہ نبی کے باطن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور دوسری یہ کہ فرشتہ انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ میں ہے: "فتمثل لها بشراً سويًا"۔

استقبالِ قبلہ

قرآن مجید کی آیت: "وما كان الله ليضيع ايمانكم" (۱۰۴) کا شان نزول مفسرین اور محدثین نے یہی بتایا ہے کہ ابتدائے اسلام میں بیت المقدس مسلمانوں کے لیے بھی قبلہ تھا۔ تحویل قبلہ کے بعد بیت اللہ قبلہ متعین ہوا۔ اس پر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں اپنی ان نمازوں کے بارے میں تردد پیدا ہوا جو بیت المقدس کو قبلہ بنا کر ادا کی گئی تھیں۔ آیا ان کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ امام بخاریؒ نے ایک خاص عنوان کے تحت اس خلجان کی تفصیل حدیث ہی کی روشنی میں پیش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اصحاب النبی ﷺ کے ذہنوں میں یہ خلجان کیوں پیدا ہوا؟ جب کہ منسوخ پر عمل کرنا ناسخ سے پہلے قطعاً جائز ہے۔ مولانا انظر شاہ لکھتے ہیں کہ علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ نے اس اشکال کا جواب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تصریحات کی روشنی میں یہ دیا ہے کہ اسلام میں یہ سب سے پہلا نسخ تھا، اس لیے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اُن تفصیلات سے آشنا نہیں تھے جو نسخ سے متعلق ہیں۔ (۱۰۵)

مفتی کا سواری کی حالت میں فتویٰ

مولانا انظر شاہ مسعودی تحریر کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے۔ مختلف صحابہؓ کو جو مسائل پیش آتے اور آکر آپؐ سے دریافت کرتے تو آپؐ سواری کی حالت میں مسئلہ کا حل بیان فرمادیتے۔ اس پر علماء نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خیال ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے

اطمینان سکون و دماغ، اہل علم سے مشورہ بہتر ہے، چلتے پھرتے فتویٰ دینا احتیاط کے خلاف ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس باب سے اس وہم کی ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر علمی کام کے لیے سکون ضروری ہے۔ بلکہ امام موصوف کا یہ خیال ہے کہ سواری کی حالت میں بھی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ حافظ بدر عینی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مشغولیت میں بھی اہل علم سے مسائل دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا خیال ہے کہ امام بخاریؒ اس حدیث کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جس میں سواری کی پیٹھ کو منبر بنانے سے ممانعت کی گئی ہے۔ مصروف رفتار جانور کو روکنا اور باتوں میں مشغول ہو جانا جانور کے لیے اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے روکا گیا۔ (۱۰۶)

لیلۃ المعراج

کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج والی رات میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہوئی یا نہیں؟

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عدم رؤیت کے قائل نہیں ہیں۔ (۱۰۷) اگرچہ امت کا کثیر طبقہ رؤیت پر متفق ہے۔ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنی عالمانہ و فاضلانہ تحقیق اس طرح بیان کرتے ہیں کہ رہ گئی یہ بات کہ لیلۃ المعراج میں آنحضور ﷺ کو رؤیت و کلام دونوں نصیب ہوئے یا رؤیت بھی بغیر کلام اور کلام من وراء حجاب ہوا؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کلام کے وقت رؤیت نہیں ہوئی تھی بلکہ کلام بدون رؤیت کے ہوا۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ رؤیت و کلام دونوں ایک ساتھ ہوئے تو پھر یہ بھی کہنا ہوگا کہ رؤیت بھی داخل حجاب ہی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں یہ ہے کہ:

"ان حجابه النور لو کشفه لأ حرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه"۔ (۱۰۸)

معلوم ہوا کہ حجاب نور اٹھایا ہی نہیں گیا اس لیے رؤیت حجاب میں ہوگی اور وہ

حجاب نور ہی ہے۔ صحیح مسلم کی دوسری روایت " نور انّی اراہ " (۱۰۹) کی تائید بھی کرتی ہے۔

آنحضور ﷺ رؤیت کی نفی نہیں فرما رہے ہیں بلکہ "نور" کا ابتدأ میں لفظ استعمال فرما کر ذات خدا کی کنہ، اس کا احاطہ، اس کی حقیقت کی دریافت سے اپنا عجز ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ جب نور کامل ہوگا تو اس کا ادراک ممکن نہیں ہوگا۔ (۱۱۰)

علامہ موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

" فالنبی صلی الله علیه وسلم حصل له الرویة البتة و لکنها کانت رویة دون رویه وهی التی تلیق بشانه تعالی " ۔ (۱۱۱)

کسی کے لیے ممکن نہیں کہ اپنی نظروں کو خدا کے وجہ منیر پر مرکوز کر سکے ان کی کبریائی و ہیئت اس سے مانع ہے۔ خود آپ بھی دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں پر جلال شخصیتوں کو ہم صرف گوشہ نظر ہی سے دیکھ پاتے ہیں۔ انھیں مرکز نظر بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ اس رؤیت کے بارے میں سوالات پر قطعی جواب احتیاط کے خلاف سمجھ رہے ہیں۔ کبھی آپؐ انکار کرتے ہیں، کبھی اقرار، اس کی توجیہہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ رؤیت ہے اور ایسی بھی نہیں جو منظور نظر کو کما حقہ کھول دے۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے: " وما رمیت اذ رمیت و لکن الله رمیٰ " (ص:۱۱۲) اس آیت میں نفی بھی ہے اور اثبات بھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معاملات ربانی کے اجمال کی تفصیل الفاظ میں ممکن بھی نہیں۔ اس لیے اثبات ونفی کے تضاد کو ثابت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں نفی بھی صحیح ہے اور اثبات بھی درست ہے۔ اس حدیث نے انکار کا دروازہ کھول دیا ہے اور اثبات کی راہیں بھی کشادہ کر دی ہیں۔ چاہے تو اس رؤیت کا انکار کریں جو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہو اور جی چاہے تو اس رؤیت کا اقرار کریں جس میں حقیقت کی دریافت نہیں ہوئی۔ (۱۱۳)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں "نور" کا استعمال قرآن سے مؤید ہے۔ جیسے " اللّٰہ نور السمٰوات والارض " (۱۱۴) رہ گئی وہ حدیث جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "

رأیت نوراً" تو اس کے بھی دو محمل ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے دیکھا لیکن ذات خدا نہیں دیکھی۔ ان کا نور ان کی ذات کی رؤیت سے مانع ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے ایک منور ذات کو دیکھا۔ (۱۱۵)

رؤیت رب رضی اللہ عنہ

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ علماء ان دونوں احتمالات میں تقابل سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تقابل نہیں۔ میرا یقین ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رؤیت رب سے مشرف ہوئے ہیں۔ اور آپ پر یہ خدا تعالیٰ کا خصوصی فضل و رحمت تھی۔ امام احمد بن حنبلؒ نے تو کہہ دیا ہے کہ رؤیت الٰہی دو بار ہوئی ہے۔ اور یہ رؤیت ایسی تھی جیسا کہ ایک طالب کی مطلوب پر یا بندے کی آقا پر کہ عاشق محبوب کو دیکھنے سے محروم بھی نہیں رہتا لیکن جمالِ محبوب اسے مسلسل دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ میرے نزدیک "مازاغ البصر وما طغٰی" (۱۱۶) کا یہی مطلب ہے۔ "زیغ" کا مطلب یہ ہے کہ جمال حبیب سے نظریں چرائی جائیں اور آنکھ بھر کر نہ دیکھا جائے اور "طغیان" کی مراد یہ ہے کہ محبوب کے دیکھنے میں اس حد تک تجاوز ہو کہ جس سے سوئے ادبی کا ارتکاب ہو۔ حضرت حق جل مجدہ نے اس آیت میں جناب رسول خدا ﷺ کے لیے رویت اور اس میں حدود ادب کی رعایت بھرپور ثابت کی۔ (۱۱۷)

سباق رؤیت میں رؤیت قلب کو مقدم فرمایا اور بصر کا لفظ مؤخر کر دیا گیا، تاکہ اس حقیقت پر ایک لطیف اشارہ ہو جائے کہ اصل رؤیت قلب سے ہوئی ہے آنکھ محض تابع تھی۔ "مازاغ" فرمادیا کہ اندرونی بصر نے جب اس بیرونی بصر سے کام لیا تو وہ ساتھ ہوگئی اور کوئی سرکشی و بغاوت اس کی جانب سے عمل میں نہ آئی۔ پس بات رؤیت قلب سے چلی، ظاہری آنکھ پر اس کا اثر منتہی ہو گیا۔ (۱۱۸)

معراج جسمانی تھی یا روحانی

یہ بھی ایک اختلاف چلا آتا ہے کہ معراج آپ کا واقعتاً جسمانی سفر بحالت بیداری تھا

یا کوئی حیرت انگیز خواب تھا۔ جس کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی ہیں۔ امت کا عام طبقہ اس کا قائل ہے کہ یہ خواب نہ تھا بلکہ واقعی ایک سفر تھا۔ خواب کہنے والوں کو اہل علم ہمیشہ شافی جواب دیتے رہے۔ اس بحث میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کی تحقیقات خاص اہمیت کی حامل ہیں: چنانچہ فرماتے ہیں۔

> ''انبیاء علیہم السلام بیداری میں بھی وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو عوام خواب میں دیکھتے ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھئے کہ حضرات اولیاء بحالت کشف اشیاء کو بچشم سر دیکھتے ہیں درانحالیکہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے ہی انبیاء غیب کی چیزوں کو بحالت بیداری کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں۔ اور کیونکہ یہ چیزیں ہمارے لیے محسوس ومرئی نہیں ہیں تو انبیاء علیہم السلام ہمارے فہم سے قریب تر کرنے کے لیے اپنے ان مشاہدات کو خواب سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ہماری اور ان کی رؤیت بالترتیب بیداری ومنامی میں یکساں نتائج پر منتج ہوتی ہے تو اس کی تعبیر خواب سے بھی ہو سکتی ہے اور رؤیت سے بھی۔ میں ایک زمانہ تک یہی رائے رکھتا تھا کہ بعینہ یہی بات علامہ سیوطیؒ نے ''تنویر الحوالک'' میں لکھی ہے۔ اس پر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی''۔(۱۱۹)

الحاصل یہ کہ یہ ایسی کیفیات ہیں جنھیں الفاظ میں اس طرح ڈھالا نہیں جا سکتا کہ وہ حقیقی حالات کا صحیح مرقع ہوں۔

خواب کی حقیقت

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ:

> " قد كنت حققت في سالف من الزمان أن الرؤيا ليست بنوم ولا يقظة، بل هي حالة متوسطة بينهما ولذا لا تزال تتسلسل ولا تنقطع الا بالنوم الفرق اؤ اليقطة ، ثم اطلعت بعد زمن طويل على " دائرة المعارف " لفريد وجدى، فرأيت فيهما تحقيق اهل أوروبا الآن بعين ما كنت حققته

سابقاً"۔ (۱۲۰)

ترجمہ: ''زمانہ دراز سے میری رائے تھی کہ خواب کو نہ نیند ہی کہا جاسکتا ہے اور نہ بیداری، بلکہ یہ ایک درمیانی کیفیت ہے، اس لیے اس کا تسلسل باقی رہتا ہے اور اسے نیند کا غلبہ شدید ختم کرتا ہے یا بیداری۔ ایک زمانہ کے بعد فرید وجدی کی 'دائرۃ المعارف' میں دانشوران یورپ کی خواب سے متعلق بعینہ یہی تحقیق میری نظر سے گزری۔''

رؤیائے انبیاء علیہم السلام وحی ہوتے ہیں

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں کہ:

''انبیاء علیہم السلام کے خواب بلاشبہ وحی ہوتے ہیں۔ البتہ تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ان کے خواب وحی نہ ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کی بنا پر نور نظر کو ذبح کے لیے کیوں تیار ہو جاتے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اپنے خواب کو وحی سمجھتے تھے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ کفار اپنی اولاد کی ہمیشہ قربانی پیش کرتے رہے اور تقرب الٰہی کا ذریعہ گردانتے رہے لیکن کسی آسمانی دین میں اولاد کی قربانی کا جواز نہیں رہا۔'' (۱۲۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بیٹے کی قربانی مقصود نہ تھی

مولانا انور شاہ کشمیریؒ انبیاء علیہم السلام کے خواب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی قربانی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بیٹے کی قربانی مقصود نہ تھی بلکہ وہ ایک آزمائش تھی مگر انھوں نے اپنے خواب کو اس کے ظاہر پر رکھنا چاہا تو حضرت حق کی طرف اعلان ہوا تھا " ونادیناہ ان یا ابراهیم قد صدقت الرؤیا "(۱۲۲)

اور اس کے بعد دنبہ کی قربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے عوض میں پیش کی گئی۔ یہ اس لیے کہ جو وحی بذریعہ خواب ہوتی ہے، اس کا انداز اس وحی سے بدلا ہوا ہوتا ہے جو صراحۃً

ہو۔ خواب والی وحی میں اگر صاحب خواب معمولی سی بھی تعمیل کردے تو وحی کا تقاضا پورا ہوگیا۔'' (۱۲۳)

ابن عربی کی رائے درست نہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کے بارے میں ابن عربی کی رائے کو غیر معقول اور غیر صحیح قرار دیتے ہوئے مولانا انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں کہ:

''ایسا نہیں جیسا کہ شیخ محی الدین محمد بن عربی کی رائے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہی نہیں ہوا تھا بلکہ انھیں دنبہ ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے خود عمل میں اپنے لیے تشدد پسند کیا اور خواب کو ظاہر سے ہٹانے کی بجائے اس کے ظاہر پر ہی عمل پیرا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا کہ بیٹے کی قربانی کرانا مقصود نہیں بلکہ بھیڑ کی قربانی دو۔ شیخ اکبر نے اس وجہ سے "قد صدقت الرؤیا" کا مطلب بھی بدل لیا اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ابراہیمؑ! تم خواب کے ظاہر پر عمل کر رہے ہو حالانکہ ہم تم سے نورِ نظر کی قربانی نہیں چاہتے بلکہ بھیڑ کی قربانی کرو۔'' (۱۲۴)

شیخ اکبر کی تردید میں لکھتے ہیں:

شیخ اکبر کی یہ توجیہات صحیح نہیں ہیں۔ کیا انبیاء علیہم السلام معاملات کے فہم میں اولیاء اللہ سے بھی پیچھے ہیں؟ کہ شیخ اکبر تو حقیقت تک پہنچ رہے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دریافت حقیقت سے قاصر رہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنے خواب میں تعبیر کی صورت بھی پیش آئی ہے جیسا کہ قرآن ہی کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے خواب کی اپنے والد سے تعبیر دریافت کرنا پڑی''۔ (۱۲۵)

غارِ حرا کی خلوت گاہ

رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے غار حرا میں تشریف لے جاتے اور تخلیہ میں وقت گزارتے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ:

''صوفیا کی خلوت نشینی اور فقہاء کا اعتکاف یکساں ہیں، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کا بیشتر حصہ حرا ہی میں گزارتے اور اسے آپؐ نے بطور خلوت گاہ اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہاں سے خانہ کعبہ کا دیدار جو مرکز تجلیات ربانی ہے ہو جاتا تھا۔ ممکن ہے اس طرح آپ کی اس خلوت نشینی میں خلوت بھی تھی عبادت بھی تھی اور خانہ کعبہ کی زیارت بھی۔ [۱] (بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے دادا عبدالمطلب بھی کبھی کبھی آپ کے ساتھ خلوت نشین ہوتے۔ وہ ملت حنفیہ پر تھے اور ان کے بعض ایسے کلمات موجود تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے بھی قائل تھے)۔''

مناظرۂ ابلیس ایک عظیم موعظہ

مناظرۂ ابلیس میں بنی نوع انسان کے لیے ایک بہت بڑا درس ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے قول کا مفہوم یوں ہے:

''نصبِ خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسلِ انسانی کو دے دیا گیا تھا کہ اسے اپنی انقیاد و اطاعت کا امتحان دینا ہوگا اور کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہوگی جب کہ خدائے رب العزت کی رضا جوئی میں اس کے رسولوں کے لیے بھی وہی جذبہ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لیے موجزن ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ رسولوں کی باتوں پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں ایمان قرار دیا گیا ہے۔'' (۱۲۷)

ایمان کی تعریف

شریعت میں ایمان و اسلام صفت انقیاد و اطاعت کی آخری منزل کا نام ہے جس کے

---

[۱] بقول استاذی المکرّم جناب حضرت مولانا محمد نافع، جامعہ محمدی شریف جھنگ مذکورہ روایت درست نہیں ہے۔

بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیاتِ شرعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبر صادق پر وہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ پھر دل کی تمام خوشی اور روح کی کامل مسرت اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے، گویا جذبہٗ وفاداری طلبِ دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہ حق میں ہر نئی قربانی، نئی لذت ہو اور ایک ادنیٰ نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو گلے سے اتارے نہ اترے۔ (۱۲۸)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ ایمان کے وجود کی تین صورتیں ہیں:

۱۔لفظی ۲۔ذہنی ۳۔عینی

شریعت نے ایمان کا لفظی وجود بھی ایک حد تک تسلیم کیا ہے کیونکہ عالم بشریت کی سرا سر محتاجی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کر سکے۔ اس کی قلبی تصدیق کا یہی ایک آلہٗ ناتمام ہے۔ اگر وہ بھی ناقابل اعتبار ٹھہرے تو عالم انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بےکار محض ہو جائے اس ملیے ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔ اسلام میں قلبی تصدیق کے بغیر صرف زبانی دعویٰ کوئی وزن نہیں رکھتا ہے۔ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی کسی حالت میں قطع نظری کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اقرار سے مراد وہ اقرار ہے جسے ضمیر کی آواز کہا جا سکے ورنہ اسے اقرار ہی نہ کہا جائے گا۔ اسلام کے اس لفظی وجود کو فقہاء کی اصطلاح میں اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللسان

فقہاء کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنی چاہیے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے بیان کو مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اس طرح نقل کرتے ہیں:

> ’’ہمارے فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اس لیے اقرار کا اضافہ کر دیا ہے کہ جو تصدیق قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ رہے۔ اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار لازم ہوگا تو اب انکار

کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔" (۱۳۰)

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے جس کا مفہوم مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے یوں نقل کیا ہے:

"جب اقرار نہ ہو، ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے قلب میں حقیقتاً تصدیق موجود ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اس پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان ایمان کا جزء قرار دیا جائے۔" (۱۳۱)

ہم کہتے ہیں کہ اگر اقرار کرنا اس مقصد کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے جو مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر رکنیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھانا نہ چاہیے بلکہ مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار کرنا بالاتفاق ضروری ہے مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کر کے رکنیت کا لفظ کہہ دیا ہے اور دوسری جماعت نے گو اہمیت کو تسلیم کیا ہے مگر رکنیت کا لفظ نہیں کہا۔ پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے تو لفظ زائد کہہ کر اسے ذرا پھیکا بھی کر دیا ہے۔

محلِ ایمان:

مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ "فیض الباری"، کتاب الایمان میں امام شافعیؒ کی رائے کو نقل کرتے ہیں:

ان کی رائے ہے کہ ایمان کا محل قلب ہے اور امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے خیال میں ایمان کا مستقر دماغ ہے۔ "مجمع البحار" میں امام صاحب کا یہی قول ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس انتساب کی تردید کی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"امام صاحبؒ کی جانب یہ انتساب صحیح نہیں، متقدمین احناف کے ہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا بلکہ فقہ کی کتاب "الهدایہ" کی تصریحات اس

کے خلاف ہیں۔ مصنف ہدایہ نے ''کتاب الجنائز'' میں لکھا ہے کہ امام کو جب وہ جنازہ کی نماز پڑھانے لگے تو میت کے محاذ میں کھڑا ہونا چاہیے۔ (۱۳۲) چونکہ قلب محل ایمان ہے اس تصریح نے صاف کر دیا کہ حنفیہ بھی محل ایمان قلب ہی کو سمجھتے ہیں۔ خود میرے نزدیک یہ بات محقق ہے کہ ایمان کا محل '' قلب'' ہے اور اس کا ظہور دماغ ہے۔ قلب اور دماغ میں قرب ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ قلب انسان صغیر ہے جو انسان کبیر کے دو پہلوؤں کے درمیان رکھا گیا ہے۔ صحت کی درستگی و بگاڑ بلکہ اصلاح و فساد سب کچھ اس قلب کی صحت و مرض پر موقوف ہے۔'' (۱۳۴)

دل کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی نکتہ آفرینی

دل جسم انسانی میں اوندھا لٹکا ہوا ہے، اس میں کیا مصلحت ہے اس کے متعلق مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

''پھر یہ قلب جسم انسانی میں اوندھا لٹکا ہوا ہے۔ جس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ اس کائنات میں مخلوق کئی صورتوں پر ہے۔ بعض وہ ہیں جو زمین سے پھوٹ رہی ہیں اور ان کا رخ آسمان کی طرف ہے جیسا کہ درخت۔ بعض وہ ہیں جو عرض میں پھیلی ہوئی ہیں جیسا کہ حیوانات۔ اور انسان چونکہ آسمان سے زمین پر اتارا گیا ہے تو اس کی خلقت اوپر سے نیچے کی جانب ہے۔ انسان کا سر جو درخت کی جڑ کی مانند ہے بجائے نیچے کی جانب مائل ہونے کے اوپر آیا ہوا ہے۔ انسان کے اعضاء نیچے کی جانب مائل ہیں جیسا کہ اس کے ہاتھ، پاؤں، بال وغیرہ تو مناسب تھا کہ قلب کا رخ زمین کی جانب ہو جو انسان کو، ہمیشہ اس کا احساس دلاتا ہے کہ تیرا تعلق علو سے ہے نہ کہ اسفل سے۔''

اس طرح دل کے بائیں جانب ہونے کے بارے میں شاہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ یہ بھی لطیفہ ہے کہ دل کو بائیں جانب رکھا تا کہ اس کی حکومت و سلطنت داہنی جانب پر رہے۔ اطباء نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء سے متعلق دس ہزار حکمتیں بیان کی ہیں،

لیکن قلب کے اوندھا ہونے کی کوئی حکمت نہیں بیان کی ، یہ میری اپنی تحقیق تھی جس کا ذکر کیا گیا۔(۱۳۴)

حیاء ایمان کی شاخ ہے

عام طور پر اہل علم حیاء کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک شرعی دوسرا عرفی۔ اس حدیث کے ذیل میں (آنحضور ﷺ نے حیاء کو ایمان کا شعبہ و شاخ قرار دیا ہے)۔(۱۳۵) مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے قول کا مفہوم یہ ہے :

> ''میں حیاء کو دو قسموں میں اس انداز پر تقسیم نہیں کرتا جو عام علماء کی رائے ہے یعنی شرعی و عرفی۔ میرے خیال میں حیاء کی ایک ہی قسم ہے البتہ متعلق کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ جس پر ذکر الٰہی کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب میں خدا تعالیٰ سے حیاء کرتا ہے اور جس پر دنیا کا غلبہ ہوتا ہے وہ ان چیزوں سے بچتا ہے جو اہل دنیا کی نظر میں معیوب ہوتی ہیں۔ اس لیے حیاء کی ایک ہی قسم ہے۔ صرف اس کے متعلق بدل رہے ہیں۔ پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ بعض اخلاق حسنہ ایمان کے مبادی ہیں جو ایمان سے پہلے بھی آئے ہیں اور ان پر ایمان کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔''(۱۳۶)

انبیاء اور گناہوں کا صدور

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

" لیغفرلکم اللہ ما تقدم من ذنبك وما تأخر " (۱۳۷)

اے نبی (ﷺ)! خدا تعالیٰ نے آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے۔

اس ارشادِ ربانی کے نتیجہ میں ایک بحث چل پڑی کہ کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے گناہوں کا صدور ممکن ہے؟

اشاعرہ

اشاعرہ کے خیال میں انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے اور بعد صغائر کا ارتکاب کر سکتے

ہیں۔ یہ ارتکاب سہواً تو ہو ہی سکتا ہے بلکہ اشاعرہ کے خیال میں قصداً بھی امکان ہے۔

ماتریدیہ

ماتریدیہ انبیاء علیہم السلام سے گناہوں کا صدور ممکن نہیں مانتے، ارادۃً نہ بلا ارادہ۔ پھر اس آیت ربانی کا کیا مطلب ہوگا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذنوب سے درگزر کرنے کا ذکر آیا۔ یہ آیت تو چاہتی ہے کہ گناہوں کا صدور تسلیم کرلیا جائے۔ علماء نے اس اشکال کا جواب اپنے اپنے ذوق کے مطابق دیا ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب کی تحقیقات بھی قابل توجہ ہیں جس کا اردو ترجمہ مولانا انظر شاہ نے اپنی کتاب ''نقش دوام'' میں کیا ہے:

> ''ذنب معصیت نہیں ہے۔ گناہوں کی بہت سی صورتیں ہیں۔ گناہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ عربی میں ہر ایک کے لیے علیحدہ الفاظ ہیں۔ معصیت کا ترجمہ ہے: ''عدول حکمی، اطاعت سے سرتابی، آمر کے امر کے مقابل میں مخالف رویہ اور کھلی نافرمانی''۔ یہ گناہ کی شدید قسم ہے۔ اس کے بعد خطا ہے۔ یہ صواب کی ضد ہے، اس کا ترجمہ اردو میں ''نادرست'' ہوگا۔ تیسرا درجہ ذنب کا ہے کہ سب سے زیادہ ہلکی معصیت ہے جسے عیب ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں آیت میں کوئی اشکال نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاکیزہ احساسات کے تحت جن ہلکی چیزوں کو اپنے لیے عیب سمجھ رہے تھے اور وہ حقیقتاً عیوب نہیں تھے۔ آپ کے اطمینان خاطر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی نظر انداز کرنے کی بشارت دے دی۔ اس لیے اہل علم جو آیت کے ذیل میں معاصی کے ارتکاب اور عدم ارتکاب کی گفتگو کرتے ہیں یہ بے محل اور مضر ہے کیونکہ یہ تقسیم معصیت میں نافذ ہے نہ کہ ذنوب میں۔'' (۱۳۸)

رئیس الاعضاء

مشہور حدیث ہے:

'' الآوان فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلہ و

اذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب "۔ (۱۳۹)

اس حدیث کے ذیل میں مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ کی تحقیق و تدقیق قابل صد ستائش ہے۔ کہتے ہیں:

''قلب کا تعلق جسم کے ساتھ آمر و مامور کی حیثیت رکھتا ہے کہ دل حاکم ہے اور جسم اس کا محکوم یا قلب اصل ہے اور اعضاء فروع۔ دل ہی خزینہ علوم و معرفت ہے اور یہی سرچشمہ اخلاق و ملکات ہے۔ بیہقی کی ایک روایت ہے کہ کان مسموعات کو خارج سے اٹھاتے ہیں اور قلب تک پہنچاتے ہیں۔ دونوں آنکھیں ایک ہتھیار ہیں جن کے ذریعے سے انسان شجر و حجر اور موذی و مہلک اشیاء سے بچتا ہے۔ دونوں ہاتھ دو بازو ہیں اور پاؤں قاصد ہیں۔ جگر مجسمۂ رحمت ہے اور طحال وسیلہ ضحک ہوتا ہے۔ اطباء نے اس کی کوئی توجیہہ نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ طحال میں انقباض و انبساط پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ضحک کی بھی یہی حقیقت ہے۔ صوفیاء نے قلب کو تمام لطائف کا مدار قرار دیا ہے چونکہ یہی مہبط انوار و منبع اسرار ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدم کا پتلا تیار ہوا تو شیطان اس کے پتلے کے اردگرد گھوما، پھر اس کے اندر گھس گیا، اندرونی طور پر کچھ منفذ اس نے پائے تو بولا کہ یہ مخلوق ایسی ہوگی کہ اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکے گی۔ تفسیر فتح العزیز میں یہی حدیث اس اضافہ کے ساتھ موجود ہے کہ شیطان نے جسد آدم میں بائیں جانب ایک بند کوٹھی دیکھی تو بولا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا حالانکہ قلب اس میں محفوظ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ قلب چونکہ تجلیات ربانی کا مظہر ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے اسے ہر جانب سے بند کر دیا ہے جس میں کوئی سوراخ و شگاف نہیں ہے۔ اب قلب ایک بند قبہ ہے جس کے اطراف و جوانب میں بھی کوئی سوراخ نہیں ہے۔ جس کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں اور اس کے اسرار کو ماسوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔'' (۱۴۰)

علم کی حقیقت

ماتریدیہ کے ہاں: ''علم قلب کی صفت ہے اور قلب میں اس طرح محفوظ و

موجود ہے جس طرح آنکھوں میں بینائی۔ علم کو اگر اس کے شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ حقائق کے انکشافات کا ذریعہ بنتا ہے۔ ماتریدیہ کی اس تحقیق پر معلومات بے پناہ ہوتی ہیں جبکہ علم میں تعدد نہیں۔" (۱۴۱)

فلاسفرز کے ہاں: "علم حصول صورت یا حاصلہ کا نام ہے۔" (۱۴۲)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ علم و معلوم میں بھرپور مغایرت ہے حالانکہ فلاسفرز دونوں کو متحد قرار دیتے ہیں۔ آگے کہتے ہیں:

"یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علم کی خوبی و برائی معلومات کے برے بھلے ہونے پر موقوف ہے۔ اگر معلومات اچھی ہیں تو علم بھی اچھا اور معلومات کی برائی علم کی برائی پر منتج ہوگی۔ علم وہی کامل ہے جو مرضیات خدا کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ جس علم سے کام نہیں لیا گیا وہ علم نہیں بلکہ جہل ہے۔ ایسا علم جس سے خوشنودی خداوندی نصیب ہو انبیاء ہی کے خزانہ علوم سے حاصل کیا جاسکتا ہے اس لیے نبوت کا اقرار بہرحال ضروری ہوگا۔" (۱۴۳)

آدم علیہ السلام کی فضیلت: عام مفسرین یہی کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی فضیلت کا راز علم ہے مگر میرے خیال میں ان کی فضیلت بندگی میں مستور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمینی خلافت کے بظاہر تین مستحق تھے:

۱۔ آدمؑ ۲۔ فرشتے ۳۔ ابلیس

۱) ابلیس کی ملعونیت و مردودیت تو معلوم ہے پھر وہ زمین پر بطور خلیفہ کس طرح آسکتا تھا۔

۲) فرشتوں نے خدا تعالیٰ سے خلافت کے اسرار معلوم کرنا چاہے۔ انسان کے ظاہری احوال سے وہ خونریزی کی بو سونگھ رہے تھے۔ سوال کیا جاسکتا تھا لیکن سوال کا طریقہ و انداز باری تعالیٰ عز اسمہ کے شایان شان اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس انداز پر خدا تعالیٰ کو حق تھا کہ فرشتوں سے شدید مواخذہ کرے۔ فرشتے بہت جلد مطلع ہو گئے اور انھیں اپنی بھول چوک پر اصرار نہ تھا۔ اس لیے خدا تعالیٰ بھی درگزر فرما گئے۔ (۱۴۴)

رہ گئے سیدنا آدم علیہ السلام جب ان کے نسیان اور مخالفت کے باوجود ممنوعہ شجر کے

استعمال پر مواخذہ شروع ہوا تو انہوں نے سوائے گڑگڑانے تضرع وزاری اور عبدیت کے مظاہرہ کے اور کوئی رخ اختیار نہیں کیا، حالانکہ وہ جواب دے سکتے تھے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس طرح کے اعتراض پر انھیں خاموش کر دیا تھا۔ (۱۴۵)

علم کا مظاہرہ کیوں کرایا گیا؟: رہا یہ خلجان کہ اگر عبودیت و بندگی استحقاق خلافت کی بنیاد تھی تو خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے علم کا مظاہرہ کیوں کرایا۔ حالانکہ ان کی عبودیت و بندگی کا مظاہرہ زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علم ایسا وصف ہے جس کا اظہار ہو سکتا ہے جبکہ عبودیت بندے میں ایک مستور صفت ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کی خوبی اور اس کا شرف اس وقت تسلیم ہوگا جب اس کے ساتھ حسن عمل کا پیوند لگا ہوا ہو۔

آدم کی تعریف یہی ہے کہ ان کا عمل مطابق علم تھا اور ذرا غور سے کام لیجئے تو معلوم ہوگا کہ علم تو عمل کا وسیلہ ہے۔ وسائل مقاصد پر فائق نہیں ہوتے اس لیے علم پر عمل ہی کو ترجیح ہوگی۔ علامہ کشمیریؒ کہتے ہیں:

"ولا ننکر فضل العلم"۔

یعنی میری گزارشات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں علم کے شرف کا منکر ہوں درانحالیکہ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ شغل علم کو نوافل کی مشغولیت سے بھی زیادہ افضل قرار دیتے ہیں اور امام احمدؒ بن حنبل کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ علم افضل ہے اور دوسرا قول ہے کہ جہاد میں مشغولیت باعثِ فضیلت ہے۔ آپ اپنے مقصد کو ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ولکنی اردت بیان جهة الخلافة علىٰ ما كانت عندی"(١٤٦)

احمد اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لفظی و معنوی تحقیق: عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" الا تعجبون كيف يصرف الله عنی شتم قريش و لعنهم يشتمون مذمماً ويلعنون مذمماً و انا محمد" (١٤٧)

فرمایا! تم نے یہ عجیب اور پر لطف بات بھی دیکھی؟ اللہ تعالیٰ نے کس خوبی سے قریش

کی لعنت ملامت کو میرے نام پر پڑنے نہیں دیا۔ وہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں، مذمم پر لعنتیں برساتے ہیں اور میں محمد ﷺ ہوں۔

مولانا محمد بدر عالمؒ قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بے نظیر تھی، آپؐ کے یہ اسماء بھی بے مثل تھے۔ آپؐ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپؐ کی ولادت کا زمانہ قریب آ گیا۔ کاہنوں، منجموں اور اہل کتاب نے نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی منتظر کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے اپنی اولاد کے نام محمد اور احمد رکھنا شروع کیا۔ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جن کے نام محمدؐ اور احمد رکھے گئے تھے ان کی کل تعداد چھ تک ہے۔ سہیلیؒ نے صرف تین نام بتلائے ہیں:

۱) محمد بن سفیان بن مجاشع
۲) محمد بن یحییٰ بن الحلاج
۳) محمد بن عمران بن ربیعہ۔ (۱۴۸)

سہیلیؒ سے پہلے ابوعبداللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجر آٹھویں صدی ہجری میں جب اس کی تحقیق میں لگے تو انہوں نے ان کی تعداد بیس تک پہنچا دی۔ تکرار اور اوہام کو چھوڑ کر ان کی تعداد پندرہ رہ جاتی ہے۔ (۱۴۹)

محمد نام کے سب سے پہلے مشہور شخص: سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی بن ربیعہ ہیں۔ ان کا واقعہ مولانا محمد بدر عالم میرٹھی بغوی، ابن سعد اور ابن السکن سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

"خلیفہ بن عبداللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا۔ تمہارے والد نے تمہارا نام زمانہ جاہلیت میں محمد کیسے رکھا؟ انھوں نے جواب دیا۔ اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن حنفیہ غسانی کی ملاقات کے لیے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسے چشمے پر اترے جو گرجا گھر کے قریب تھا۔ اس کا منتظم ہمارے پاس آیا اور کہا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے تم دوڑ کر اس کو قبول کر لینا۔ ہم نے کہا ان کا نام؟ اس

نے کہا۔ ان کا نام ہے محمد (ﷺ)۔ جب ہم اس سفر سے واپس ہوئے تو اتفاقاً ہم سب کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے اور اس لیے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کے نام محمد رکھ دیئے۔'' (۱۵۰)

اسم محمد ﷺ کی شرح: اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح کرتے ہوئے مولانا بدر عالمؒ حافظ ابن قیمؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں۔ محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے جو مبالغہ اسم تفضیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا۔ اس لیے محمد، محمود سے زیادہ بلیغ ہے۔ محمد اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جائے۔ تورات میں آپ کا نام محمد ہی ذکر کیا گیا ہے۔ آپؐ کے اوصاف حمیدہ، آپؐ کی امت اور آپؐ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول کو بھی آپ کی امت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی۔ (۱۵۱)

احمد (ﷺ): یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں صیغوں میں مستعمل ہوسکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں " احمد الحامدین لربه " تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں۔ احق الناس واولا هم بان يحمد۔ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف اور ثناء کا مستحق۔ (۱۵۲)

احمد اور محمد میں فرق: محمد وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصاف حمیدہ و جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جائے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جائے۔ محمد بلحاظ کمیت اور احمد بلحاظ کیفیت۔ دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ اپنے خصائل واخلاقِ عالیہ کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ (۱۵۳)

قضاء وقدر: مسئلہ قضاء وقدر بے شک بہت مشکل ہے لیکن ہمارے ہاں حق تعالیٰ کا وجود تسلیم کرنے کے بعد اس کا انکار اس سے بھی مشکل ہے۔ جس نے یہاں شریعت کا بیان کردہ اعتدال چھوڑا اس کو ہدایت کا انکار کرنا پڑا یعنی یا تو بندہ کو پتھر کی طرح مجبور ماننا پڑا یا اس کو خالقیت میں خالق کے برابر تسلیم کرنا پڑا۔

جملہ اسلامی فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ان سب کا اللہ ﷻ کو پہلے سے علم ہے اور یہ بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق جو کچھ ہونا ہے وہ سب کچھ قید کتابت میں بھی آچکا ہے اور عالم کا ایک ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تقدیر وتدبیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ تقدیر اور تدبیر میں جنگ نہیں ہے اور جنگ تو اس وقت ہوتی ہے جب کہ تدبیر تقدیر کے احاطہ سے باہر ہوتی ہے۔ اب تو تدبیر بھی تقدیر کا جزو بنی ہوئی ہے۔ تقدیر وتدبیر کے مراتب کو اس طرح ملحوظ رکھنا یہ علوم نبوت کا فیض ہے۔ (۱۵۴)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ قضاء وقدر کے متعلق اپنے خیالات ونظریات منظوم صورت میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ ایا صاحبی ان کلام بقدر تك
طویل و تحریر الخلاف یطول

۲۔ ففیك اختیار لیس منك و ذلك
لجبر اختیار لا یکناك ذهول

۳۔ و اما اختیار مستقل فانه
محال فلا یسألك عنه سئول

٤۔ فا فعالنا منا علی اختیار نا
ولکنها نحو القدیر یؤل

٥۔ ولا یستوی المیزان الا بحضلة
تفوت باد نیٔ میلة فیعول (۱۵۵)

(۱) عزیز من! تمہاری قدرت کی داستان بڑی دراز ہے اگر اس مذہب کی تفصیلات بھی بیان کی جائیں تو افسانہ اور دراز ہوتا ہے۔
(۲) اس لیے مختصر یہ سن لو کہ تم میں اختیار کی صفت تو یقیناً پیدا فرمائی گئی ہے

مگر اس اختیار پر تمہارا اختیار نہیں ہے اس لیے یہاں بھی جبر ہے مگر افعال پر نہیں، اختیار پر ہے۔

(۳) اب رہا ایسا اختیار جس کے اوپر کسی کا جبر نہ ہو وہ تو مخلوق کے حق میں محال ہے نہ مخلوق خالق بن سکتا ہے نہ اختیار اس کو مستقل مل سکتا ہے لہٰذا اس کے متعلق تم میں سے کوئی سوال نہ کرے۔

(۴) خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے افعال ہماری قدرت سے سرزد ہوئے ہیں اور ہمارے اختیار ہی سے صادر ہوتے ہیں لیکن ہماری قدرت واختیار قادر مطلق کے عطا فرمودہ ہیں اس لیے افعال کی نسبت اس طرف بھی رہتی ہے۔

(۵) ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے جہاں ایک طرف جھکاؤ ہوا اور وہ ختم ہوئی اسی طرح تقدیر کے جبر واختیار کے پلووں کو برابر رکھنا چاہیے ورنہ جبریہ یا قدریہ میں شامل ہو جاؤ گے۔

سِرّ تقدیر فہم سے بالاتر ہے: مولانا محمد انور شاہ کشمیری اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف بندہ کے افعال میں خود اس کی قدرت کا احساس بدیہی ہے، ادھر مذہب یہ کہتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اختیار وقدرت سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی چارۂ کار نہیں کہ دونوں کو تسلیم کرلیا جائے۔ اب جو فعل بھی بندہ سے صادر ہوتا ہے ہر جگہ اس میں ان دو قدرتوں کو ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں جو باریکی پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کتنا ہی تجزیہ کریں مگر کسی مرتبہ پر بھی جا کر بندہ کی قدرت اور خدا تعالیٰ کی قدرت کو علیحدہ علیحدہ ممتاز نہیں کر سکتے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل میں اتنا کام تو بندہ کی قدرت سے ہوا اور اتنا قدرت الٰہیہ سے ہوا۔ آپ بندہ کے افعال کا تجزیہ کرتے چلے

جائیں آپ کو کوئی مرتبہ ایسا نہیں ملے گا، جس میں قدرت الٰہیہ کا اثر نہ ہو اور جب تک یہ بات صاف نہ ہو اس وقت تک بندہ کو مختار کہنا بھی مشکل ہے اور مجبور کہنا بھی، اس لیے اب اس کو نہ مختار کہے بنتی ہے نہ مجبور''۔ دیکھئے ایک شہ سوار گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ارادہ واختیار سے اس کو چلاتا ہے اور گھوڑا اس کے اختیار کے ماتحت ہی چلتا ہے مگر آپ یہ بھی بداہتا جانتے ہیں کہ چلتا ہے وہ اپنی قدرت سے اپنے مالک کی قدرت سے نہیں چلتا۔ مگر یہاں دو قوتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک گھوڑے کی اور دوسری اس کے مالک کی۔ اور دونوں ممتاز ہیں کہ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی لیکن یہاں قدرت عبد کی حقیقت یہ نہیں۔ اس کے جس مرتبہ میں بھی غور کیجیے گا وہ قدرت الٰہیہ سے علیحدہ ثابت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لیے آپ تجزیہ کئے چلے جائیں مگر قدرت عبد کے علیحدہ علیحدہ اور قدرت الٰہیہ کے علیحدہ علیحدہ کرنے سے آخر عاجز ہو جائیں گے۔ اور جب تک یہ اختیار پیدا نہ کریں اس وقت تک جبر و اختیار کے اشکالات حل ہوتے نہیں اس لیے یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔'' (۱۵۶)

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ کا اشکال یوں نہیں ہے کہ یہاں کوئی غیر معقول چیز موجود ہے بلکہ یوں ہے کہ اس کی نظیر کوئی نہیں ملتی اور حسیات میں جہاں نظائر ملتے نہیں، عقل خود اپنا ہی حکم مقدم رکھتی ہے۔ اس لیے شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو مجھ کو تسلیم کر چکا ہے، اس کو میرا حکم ماننا ہوگا اور یہی ایمان بالتقدیر ہے۔ آخر جنت و دوزخ کو کس نے دیکھا ہے بلکہ خدا ہی کی ذات کو کس نے دیکھا ہے۔ یہ تمام حقائق غائب ہیں۔ یہاں جو شخص محض انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کر چکا ہے بس وہی مؤمن ہے اور جس نے راہ انحراف اختیار کی وہ دوسری طرف شمار ہوگا۔

<u>ناتمام اختیار:</u> انسان میں اختیار تو ہے مگر ناتمام اور ناتمام ایسا کہ جو صرف انسان کے لفظی طور پر مختار کہلانے کے لیے کافی ہو اور بس۔ تو صرف اتنے سے اختیار کو مان لینے سے تو جزا اور سزا کا مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ اس کا پہلے تو یہ جواب ہے کہ اگر حاکم علی الاطلاق ایسا ہی حکم دیتا تو ظلم پھر بھی نہ ہوتا مگر اس کی حکمت نے چاہا کہ عمل اور اس کی جزا و سزا کے مابین

کچھ ضروری مناسبت بھی باقی رکھے۔ اس لیے اس نے انسان کو ایک ناتمام اختیار مرحمت فرمادیا ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں :

''قدرت نے انسان کو عملی اور علمی ہر دو پہلوؤں سے دوسرے حیوانات سے امتیاز بخشا ہے۔ اس کا عملی امتیاز یہ ہے کہ اس کا نفس اپنے برے بھلے افعال کے اثرات کو اس طرح جذب کر لیتا ہے جیسا کہ سیاہی کو جاذب۔ حیوانات کے نفوس میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ ان سے بھی افعال اختیار سے سرزد ہوتے ہیں مگر ادھر صادر ہوئے ادھر فنا ہو گئے۔ انسان جب افعال اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کا نفس اس کے مناسب اثرات سے رنگین ہوتا چلا جاتا ہے۔ افعال غیر اختیاریہ کا یہاں بھی کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ مدح کی جاتی ہے نہ قدح۔''(۱۵۷)

ہمارے ممدوح مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں :

''یہاں دو عالم علیحدہ علیحدہ موجود ہیں ایک عالم تقدیر، وہ غیب در غیب ہے، دوسرا عالم تکلیف یعنی جس میں ہم کو افعال شرعیہ کا مکلّف بنایا گیا ہے۔ یہ مشہود ہی مشہود ہے۔ عالم تکلیف میں بندہ کھلا ہوا مختار رکھا گیا ہے حتیٰ کہ جب تک اس کا اختیار مستقل نظر نہیں آنے لگتا یعنی وہ بالغ نہیں ہو جاتا اس سے افعال شرعیہ کا مطالبہ بھی نہیں ہوتا مگر یہاں عالم تقدیر ظاہر نہیں ہے اور جہاں عالم تقدیر ظاہر ہے وہاں اس کو مجبور ہی مجبور بنایا گیا ہے، مگر وہاں ہم مکلّف بھی نہیں ہیں۔ ان دونوں کو خلط ملط کر دینے سے مفت میں اشکالات پیدا ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے غیبی نظر میں ہم صرف ایک مجبور مخلوق ہیں۔ حکمت ایزدی نے اس جہاں کے لحاظ سے مستقل اختیار کہہ دیا۔ جزاء و سزا کا مسئلہ بس اس پر دائر ہے جو اس عالم میں موجود ہے اس کو دوسرے عالم میں اپنے مجبور ہونے کا عذر نہ کرنا چاہیے اور نہ یہ معقول ہو سکتا ہے۔ مشہور ہے ''قصہ زمین برسر زمین'' یہاں جب کبھی اپنے نفس کو دیکھو گے تو اس کو مختار ہی پاؤ گے۔ پھر اپنے اس بدیہی وجدان کو چھوڑ کر تقدیر میں کٹ حجتی نہیں تو اور کیا ہے۔''(۱۵۸)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان جب کتے کو لاٹھی مارتا ہے تو کتا کبھی لاٹھی کو قصوروار نہیں سمجھتا ہے وہ انسان پر ہی حملہ کرتا ہے یا کسی پھلدار درخت سے کوئی پھل اس پر گرتا ہے تو وہ کبھی درخت پر حملہ نہیں کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ مجبور و مختار کے فرق کو ایک کتا بھی سمجھتا ہے، جس کو مختار سمجھتا ہے اس پر حملہ کرتا ہے اور جس کو مجبور سمجھتا ہے اس پر حملہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کھلے ہوئے فرق کو نظر انداز کر کے محض تقدیر کے مسئلہ میں الجھنے کے لیے اپنے نفس کو مجبور محض کہہ دینا کتنا غیر معقول ہے۔ (۱۵۹)

حوالہ جات

۱	علمائے دیوبند اور علم حدیث	ص ۳
۲	مقالات: ہندوستان میں علم حدیث	ص ۱۵۰
۳	علمائے دیوبند اور علم حدیث	ص ۴
۴	مقدمہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند (عربی ادب)	ج ۲، ص ۲
۵	الطبقات الکبری	ج ۷، ص ۲۷۷
۶	میزان الاعتدال	ج ا، ص ۲۰۸
۷	تہذیب التہذیب	ج ا، ص ۲۶۱
۸	العقد الثمین فی فتوح الہند	ص ۲۸۷
۹	علمائے دیوبند اور علم حدیث	ص ۵
۱۰	ایضاً	ص ۶
۱۱	ایضاً	
۱۲	مقالات: ہندوستان میں علم حدیث، معارف	ص ۲۵۲
۱۳	علمائے دیوبند اور علم حدیث	ص ۷
۱۴	نزھۃ الخواطر	ج ا، ص ۸۲
۱۵	رجال السندھ والہند	ص ۲۳۵
۱۶	ماخوذ نزھۃ الخواطر	ج ا، ص ۱۰۵
۱۷	علمائے دیوبند اور علم حدیث	ص ۹
۱۸	تاریخ فرشتہ	ج ۲، ص ۴۰۴
۱۹	تاریخ فرشتہ	ج ۲، ص ۴۰۴

۲۰	نزہۃ الخواطر	ج۱،ص۱۲
۲۱	نزہۃ الخواطر	ج۱،ص۱۲۰
۲۲	نظام تعلیم وتربیت	ج۱،ص۱۵۸
۲۳	اخبارالاخیار	ص۶۷
۲۴	اخبارالاخیار	ص۹۱
۲۵	ایضاً	
۲۶	نزہۃ الخواطر	ج۲،ص۵۰
۲۷	نزہۃ الخواطر	ج۲،ص۶۸
۲۸	علمائے دیو بند اور علم حدیث	ص۱۳
۲۹	مقالات : ہندوستان میں علم حدیث معارف	ص۲۵۷
۳۰	نزہۃ الخواطر	ج۳،ص۴۷
۳۱	ایضاً	ص۶۱
۳۲	مقالات : ہندوستان میں علم حدیث معارف	ص۲۵۸
۳۳	ایضاً	ص۲۵۸،۲۵۹
۳۴	اخبارالاخیار	ص۲۵۲
۳۵	: ہندوستان میں علم حدیث	ص۲۶۰۔
۳۶	ماخوذ از مقالات : ہندوستان میں علم حدیث	ص۲۶۰،۲۶۱
۳۷	اخبارالاخیار	ص۲۴۲
۳۸	علمائے دیو بند اور علم حدیث	ص۲۱
۳۹	مقالات سلیمان	ص۳۳۴
۴۰	علمائے دیو بند اور علم حدیث	ص۲۴
۴۱	مقالات : ہندوستان میں علم حدیث	ص۳۳۶
۴۲	ایضاً	ص۳۳۸
۴۳	ایضاً	ص۳۳۹

۴۴	برھان اکتوبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۲
۴۵	ایضاً	
۴۶	ایضاً	ص ۱۳
۴۷	مآثر حکیم الامت	ص ۱۹۸
۴۸	برھان اکتوبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۴
۴۹	مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ۔۔۔۔۔۔	
۵۰	علمائے دیو بند اور علم حدیث	ص ۶۶
۵۱	برھان اکتوبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۵
۵۲	القرآن	۲۔ ۱۲۹
۵۳	ایضاً	۳۔ ۱۶۴
۵۴	ایضاً	۲۔ ۶۲
۵۵	بینات، محرم/صفر ۱۳۹۸ھ	ص ۹۲
۵۶	تجلیات انور	ص ۲۲۷
۵۷	ماخوذ از مقدمہ فیض الباری	ص ۵۷
۵۸	ایضاً	
۵۹	ایضاً	
۶۰	نطق انور	ص ۱۲۸
۶۱	دار العلوم دیو بند جولائی ۱۹۶۷ء	
۶۲	الحق اکوڑہ خٹک رجب ۱۳۹۷ھ	
۶۳	مقدمہ فیض الباری	ص ۵۸
۶۴	ماخوذ از دار العلوم دیو بند جولائی ۱۹۶۷ء	
۶۵	ماخوذ از فیض الباری	ج ۱، ص ۱۷۰
۶۶	نفحۃ العنبر	ص ۱۰۴
۶۷	الضوء اللامع	ج ۱، ص ۳

۶۸	نفحۃ العنبر	ص۱۰۴
۶۹	ایضاً	
۷۰	قیام دارالعلوم دیوبند	ص۴۳
۷۱	تجلیات انور	ص۲۳۱
۷۲	نفحۃ العنبر	ص۴۹
۷۳	بینات	ص۱۱۸
۷۴	نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین	ص۳
۷۵	نیل الفرقدین	ص۱۳۵،۱۳۶
۷۶	بینات	ص۱۲۴
۷۷	ماخوذ از نفحۃ العنبر	ص۳۳
۷۸	نفحۃ العنبر	ص۲۲۲
۷۹	القرآن	۱۵_۹
۸۰	تدوین حدیث	۲۲۷
۸۱	فیض الباری	ج ۱،ص۲۰۸
۸۲	ایضاً	
۸۳	ایضاً	
۸۴	ایضاً	
۸۵	نقش دوام	ص۳۹۱
۸۶	البخاری	ج ۱،ص۴
۸۷	فتح الباری	ج ۱، ص۱۱
۸۸	تجلیات انور	ص ۲۵۳
۸۹	نفحۃ العنبر	ص ۵۲
۹۰	فتح الباری	ج ۱، ص ۱۲
۹۱	مشکواۃ	ج ۱، ص ۱۷۲

۹۲	تجلیات انور	ص ۲۵۵
۹۳	ترمذی	۴۸
۹۴	تجلیات انور	ص ۲۵۵
۹۵	ایضاً	ص ۲۵۶
۹۶	تجلیات انور	ص ۲۵۶
۹۷	ماخوذ از فیض الباری	ج ۱، ص ۳
۹۸	بخاری	ج ۱، ص ۳
۹۹	ایضاً	ص ۲
۱۰۰	فیض الباری	ج ۱، ص ۱۴
۱۰۱	القرآن	۴۲_۵۱
۱۰۲	فیض الباری	ج ۱، ص ۱۴،۱۵
۱۰۳	القرآن	۱۹_۱۸
۱۰۴	القرآن	۲_۱۴۲
۱۰۵	نقش دوام	ص ۴۱۴
۱۰۶	نقش دوام	ص ۴۱۳
۱۰۷	مسلم	ج ۱، ص ۱۱۰
۱۰۸	مسلم	ج ۱، ص ۱۱۱
۱۰۹	ایضاً	
۱۱۰	فیض الباری	ج ۱،ص ۱۵
۱۱۱	ایضاً	ص ۱۶
۱۱۲	القرآن	۸ _ ۱۷
۱۱۳	فیض الباری	ص ۱۶
۱۱۴	القرآن	۲۴_۳۵
۱۱۵	فیض الباری	ج ۱، ص ۱۶

۱۱۶	القرآن	۵۳۔۱۷
۱۱۷	فیض الباری	ج ۱، ص ۱۷
۱۱۸	روزنامہ سیاست لاہور ۲۲/ فروری ۱۹۲۵ء	
۱۱۹	فیض الباری	ج ۱، ص ۱۷
۱۲۰	فیض الباری	ج ۱، ص ۲۲
۱۲۱	فیض الباری	ج ۱ص ۲۲
۱۲۲	القرآن	۳۷۔۱۰۴،۱۰۵
۱۲۳	ماخوذ از فیض الباری	ج۱،ص ۲۲
۱۲۴	ایضاً	ص ۲۴
۱۲۵	اردو ترجمہ از فیض الباری	ج۱،ص ۲۲
۱۲۶	ایضاً	ص ۲۴
۱۲۷	ترجمان السنۃ	ج۱،ص ۴۶۹
۱۲۸	ایضاً	ص ۴۶۵
۱۲۹	ترجمان السنۃ	ج۱،ص ۴۷۴
۱۳۰	ایضاً	ص ۴۷۳
۱۳۱	ایضا	ص ۴۷۴
۱۳۲	ہدایہ	ج۱،ص ۱۸۱
۱۳۳	ترجمہ از فیض الباری	ج۱،ص ۶۷
۱۳۴	ماخوذ از فیض الباری	ج۱،ص ۶۸، ۶۹
۱۳۵	بخاری	ج۱،ص ۲۸
۱۳۶	فیض الباری	ج۱،ص ۷۹
۱۳۷	القرآن	۴۸۔۲
۱۳۸	نقش دوام	ص ۴۲۹
۱۳۹	مشکوٰۃ	ج۱،ص ۲۴۱

۱۴۰	فیض الباری	ج۱، ص۱۵۵
۱۴۱	ایضاً (کتاب العلم)	ص۱۶۱
۱۴۲	ایضاً	
۱۴۳	فیض الباری	ج۱، ص۱۶۱
۱۴۴	ایضاً	ص۱۶۲
۱۴۵	صحیح بخاری	ج۳، ص۵۴۸
۱۴۶	فیض الباری	ج۱، ص۱۶۲
۱۴۷	ترجمان السنۃ	ج۱، ص۴۵۲
۱۴۸	ایضاً	
۱۴۹	ایضاً	
۱۵۰	ایضاً	ص۴۵۲
۱۵۱	ایضاً	
۱۵۲	ترجمان السنۃ	ج۱، ص۴۵۲
۱۵۳	ایضاً	ص۴۵۳
۱۵۴	حجۃ اللہ البالغہ	ص۱۲۴
۱۵۵	ترجمان السنۃ	ج۳، ص۲۴
۱۵۶	ترجمان السنۃ	ج۳، ص۳۰
۱۵۷	حجۃ اللہ البالغہ	ص۵۱
۱۵۸	ترجمان السنۃ	ج۳، ص۳۸
۱۵۹	ایضاً	

باب: ۵

شاہ صاحبؒ کی فقہی تحقیق وتدقیق

تاریخ الفقہ

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ عام طور پر ایک محدث کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں مگر ان کی فقہی خدمات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بہت سے فقہی مسائل کا حل آپ نے پیش کیا ہے اور بہت سے فقہی موضوعات پر آپ نے رسالے بھی تحریر کئے ہیں۔اس باب میں ہم آپ کی انھی خدمات کو پیش کر رہے ہیں لیکن اس سے پہلے فقہ کی مختصر سی تاریخ، برصغیر میں فقہ کی اشاعت وترویج اور یہاں کے مشہور فقہاء کی خدمات کا بھی اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں کیونکہ شاہ صاحب کی خدمات بھی انھی سے مربوط ہیں۔

فقہ کی بنیاد آنحضور ﷺ کے مقدس دور میں پڑ گئی تھی، آپ کے وصال کے بعد اعیان صحابہ کے اجتہادات سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں کوفہ علم و فضل کا گہوارہ بن چکا تھا اور فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہیں درس دیتے تھے۔ آپ علم القرآن اور فقہ واجتہاد میں سب سے آگے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا دارالخلافہ کوفہ میں منتقل کر لیا تو اس کی علمی مرکزیت مزید ممتاز ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس مسند تدریس پر ان کے نامور شاگرد حضرت علقمہ فائز ہوئے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی جلیل القدر صحابہؓ سے استفادہ کیا تھا۔ آپ اپنے وقت میں علم کا ایک بہت بڑا مرکز تھے۔ ان کے بعد اس مسند درس پر حضرت ابراہیم نخعیؒ جلوہ افروز ہوئے۔ اعمشؒ انھیں صیرفی الحدیث کہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اصحاب الحدیث نے حضرت حماد بن ابی سلیمان کو اس مسند درس پر بٹھایا۔ ان کی وفات کے بعد یہی مسند درس حضرت امام ابوحنیفہؒ سے فیض یاب ہوئی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اساتذہ کرام، کبار تابعین اور فقہائے صحابہ سے حاصل ہونے والے عظیم ذخیرہ علمی کو باقاعدہ مدون کرنے کی مہم اٹھائی۔ بڑے بڑے محدثین اور اپنے جلیل القدر شاگردوں کے مشورہ سے فقہ کے اصول قائم کئے اور فقہ کو باقاعدہ مدون

کیا۔ بعد میں آنے والے تمام فقہاء گو بعض جزئیات فقہ میں امام صاحبؒ سے مختلف ہوں، اصول فقہ میں سب امام موصوف کے عیال ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ: پاک و ہند میں فقہی مسائل کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا جب ۷۱۱ عیسوی میں محمد بن قاسمؒ اور اس کے رفقائے کار کے بابرکت قدم اس سرزمین میں پہنچے۔ نئی مملکت میں نو واردوں کو جو مسائل حل کرنے پڑے ان میں سب سے اہم غیر مسلم آبادی کی نسبت نئی حکومت کا نقطہ نظر تھا۔ مقامی سندھی یا ہندو تھے یا بدھ مت کے ماننے والے۔ بہرکیف سارے بت پرست تھے اور مصر و شام کے باشندوں کی طرح اہل کتاب نہ تھے۔ ان کے متعلق اسلامی قانون میں ایک واضح اور روادارانہ طریق کار متعین ہو گیا تھا۔ لیکن عرب فاتح نے مقامی ہندوؤں اور بدھوؤں کو وہ رعائتیں دیں جو اہل کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کو شریعت اسلام میں حاصل تھیں۔ مقامی عبادت گاہوں کے متعلق محمد بن قاسم کی رائے تھی کہ یہ بت خانے ہمارے لیے عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوسیوں کے آتش کدوں ہی کی طرح ہیں۔ یہ احکام حجاج بن یوسف سے استصواب کے بعد جاری کئے گئے۔(۱)

داہر کے دارالسلطنت کے بت خانے کی نسبت مقامی باشندوں نے درخواست کی کہ ہمارا بت خانہ مسمار ہو گیا ہے، امیر عادل ہمیں اجازت دیں کہ اس کی تعمیر کریں اور اپنے معبود کی عبادت کریں:

”و ایں بت خانہ ما خراب شدہ است۔ و از خدمت اصنام بماندہ ایم۔ امیر عادل رابفرماید تا عمارت تعمیر کنیم و در عبادت معبود خود باشیم“۔ (۲)

اس درخواست کے بارے میں محمد بن قاسمؒ نے حجاج بن یوسف کو لکھا۔ وہاں سے جواب آیا:

”جب ان لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے اور دارالخلافہ کی رقوم کی ادائیگی کا ذمہ لیا ہے تو پھر ہمارا ان پر مزید حق نہیں رہتا۔ اس لیے اب وہ ذمی ہیں اور ان کے جان و مال میں ہمارا کوئی تصرف نہیں، اس لیے اجازت دی

جاتی ہے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں اور کسی شخص کو اس کے مذہب کے متعلق ممانعت اور تنبیہ نہ ہوتا کہ اپنے گھروں میں اپنی رائے کے مطابق رہیں سہیں۔" (۳)

حجاج بن یوسف نے بعض احکام کے بارے میں علمائے کوفہ و بصرہ اور خلیفہ وقت سے استصواب کیا تھا۔ (۴) محمد بن قاسمؒ کی واپسی کے بعد بھی ملکی معاملات میں یہ طریق کار جاری رکھا گیا۔ فقہی اور دینی نقطہ نظر سے بعد میں یہاں کشمکش شروع ہوگئی۔ (۵)

پاک و ہند کے مشہور فقہاء: اب ہم گفتگو کا دامن سمیٹتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف فقہاء کی مختصر فہرست پیش کرتے ہیں:

مولانا اسلامی دیبلیؒ: یہ دیبل کے رہنے والے تھے۔ محمد بن قاسمؒ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کو انھوں نے ایک شامی بزرگ کے ساتھ بطور پیغام رساں کے راجہ داہر کے پاس بھیجا تھا۔ (۶)

اسرائیل بن موسیٰؒ: یہ تبع تابعین میں سے تھے، بصرہ کے باشندے تھے، وہاں سے ترک مکانی کر کے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ (۷)

قاضی موسیٰ بن یعقوب ثقفیؒ: یہ عرب تھے لیکن سندھی مشہور ہوئے۔ تمام زندگی سندھ میں رہے، بہت بڑے فقیہ اور قاضی تھے۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسمؒ نے ان کو شہر ارور کا قاضی مقرر کیا تھا۔ (۸)

ابو معشر نجیح بن عبدالرحمان سندھیؒ: یہ اہل مدینہ میں سے ام سلمہ کے مولیٰ اور بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ (۹)

ابوبکر ربیع بن صبیح سعدیؒ: محدث و فقیہ تھے، سندھ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ (۱۰)

عبداللہ بن محمد علویؒ: ہاشمی قریشی تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے تھے۔ اہل بیت میں سے یہ پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان آئے۔

عمرو بن مسلم باہلیؒ: عالم و فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بلاد سندھ میں عامل مقرر کر کے بھیجا تھا۔ جے سنگھ نے ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ (۱۲)

ابراہیم بن محمد دیبلیؒ: یہ سندھی تھے اور بہت بڑے عالم تھے۔(۱۳)

ابو العباس احمد بن محمد بن صالح منصوری سندھیؒ: منصورہ کے قاضی القضاۃ تھے اور امام داؤد ظاہری کے مسلک کے حامل تھے۔(۱۴)

خلف بن محمد دیبلیؒ: یہ سندھ سے بغداد چلے گئے تھے۔انھوں نے علی بن موسیٰ دیبلی سے روایت حدیث کی۔(۱۵)

ابو القاسم شعیب بن محمد دیبلیؒ: یہ دیبل سے مصر چلے گئے تھے، محدث اور فقیہ تھے۔(۱۶)

ابو محمد عبداللہ منصوریؒ: منصورہ کے رہنے والے تھے۔ متعدد محدثین سے روایت حدیث کی۔ یہاں کے قاضی بھی تھے اور اصحاب الحدیث میں سے بھی۔(۱۷)

علی بن موسیٰ دیبلیؒ: یہ دیبل کے عالم اور محدث تھے۔(۱۸)

ابو نصر فتح اللہ بن عبداللہ سندھیؒ: بہت بڑے فقیہ و متکلم تھے اور حسن بن سفیان سے روایت کی۔(۱۹)

حسین زنجانی لاہوریؒ: یہ بڑے فقیہ اور عابد و زاہد تھے۔لاہور میں اسی روز وارد ہوئے جس روز شیخ علی بن عثمان ہجویری کا انتقال ہوا۔(۲۰)

علی بن عثمان ہجویریؒ: حضرت شیخ امام عالم و فقیہ غزنی سے لاہور تشریف لائے اور اسی سرزمین میں مدفون ہوئے۔

عبدالصمد بن عبدالرحمان لاہوریؒ: عظیم محدث و عالم تھے، لاہور میں رہائش پذیر تھے۔(۲۱)

محمد بن عثمان جوزجانی لاہوریؒ: فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے عظیم عالم تھے۔(۲۲)

یوسف بن ابو بکر گردیزی ملتانیؒ: غزنہ کے نواح میں گردیز نامی بستی میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عابد و زاہد اور عالم فقیہ تھے، ملتان آ گئے اور وہیں فوت ہوئے۔(۲۳)

شیخ ابو بکر بن یوسفؒ: فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے اکابر علماء میں سے تھے، طویل مدت تک دار الخلافہ دہلی میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔(۲۴)

شیخ اسحاق بن علی بخاری دہلویؒ: نامور علماء و فقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔(۲۵)

قاضی اسماعیل بن علی ثقفی سندھیؒ: عربی النسل تھے، سندھ کے مشہور مقام ارور کے قاضی تھے۔فقہ میں بلند پایہ عالم تھے۔(۲۶)

مولانا برہان الدین بزازؒ: سلطان غیاث الدین کے عہد کے مشہور فقیہ تھے۔(۲۷)

شیخ حسن بن محمد صغانیؒ: لاہور میں پیدا ہوئے۔حدیث،فقہ،لغت اور دیگر علوم میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔(۲۸)

قاضی رفیع الدین گاذرونیؒ: سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں عرصہ تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔(۲۹)

قاضی رکن الدین سامانویؒ: معروف فقیہ تھے۔(۳۰)

مولانا سدید الدین دہلویؒ: فقہ،اصول اور علوم عربیہ میں اونچے درجے پر فائز تھے۔(۳۱)

مولانا شرف الدین دہلویؒ: سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے مشہور فقیہ تھے۔(۳۲)

شیخ محمد بن مامون لاہوریؒ: لاہور سے خراسان چلے گئے،فقہ شافعی کے جلیل القدر عالم تھے۔(۳۳)

یہ تو چند علمائے ذوی الاحترام اور فقہائے عالی مقام کے نام ہیں۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب سے اسلام اس خطہ میں داخل ہوا ہے۔اس میں بے شمار علماء وفقہاء پیدا ہوئے، کچھ باہر سے آئے، یہاں کے ہزار سالہ اسلامی دور میں اس ملک نے متعدد حکمرانوں کو دیکھا اور انقلاب وتغیر کی مختلف لہروں سے اس کو دوچار ہونے کا اتفاق ہوا لیکن اس میں ایک چیز نمایاں رہی وہ یہ کہ ہر دور میں اور ہر عہد حکومت میں یہاں مختلف النوع علوم وفنون کا ہمیشہ چرچا رہا۔ بالخصوص حدیث وفقہ نے اس خطہ ارض میں خوب ترقی کی۔اور علمائے عظام کی ایک مضبوط جماعت ہر دور میں اور ہر عہد حکومت میں علم وحکمت کے موتی پرونے میں مصروف رہی۔خالص مطلق العنانی اور شخصی عہد حکومت میں بھی علماء فقہاء کو بڑی قدر اور احترام وتعلیم کی نظر سے دیکھا گیا۔جن بلند مرتبت شخصیتوں کو اس سرزمین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کے نام نامی بھی شامل ہیں۔اگرچہ امام اوزاعیؒ فقیہ ملک شام تھے اور امام ابوحنیفہ کا مولد و منشاء ملک عراق تھا لیکن ان کے بزرگ نسلی اعتبار سے سندھی تھے۔امام اوزاعیؒ کے بارے میں مرقوم ہے کہ وہ اصلاً اسیران سندھ میں سے تھے۔(۳۴)

عہدِ غزنوی: اس عہد میں بھی ہندوؤں کے متعلق وہی طریق کار رہا جس کی مثال محمد بن قاسمؒ

نے قائم کی تھی۔ سلطان محمودؒ اور امیر مسعودؒ کی فوج میں ہندو بھی شامل تھے۔ اس عہد میں سلطان محمودؒ نے ایک طرف تو ملتان اور منصورہ کی اسماعیلی حکومتوں کو ختم کر دیا اور دوسری طرف لاہور کو سیاسی اور فقہی امور میں مرکزی ایشیاء سے ملا دیا۔ (۳۵)

جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی اور تا تاری فتنہ کے دوران بے شمار علماء و فقہاء دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

بعض کے نام یہ ہیں: قاضی فخر الائمہؒ، قاضی حمید الدین نا گوریؒ، شیخ نظام الدین ابوالمؤید غزنویؒ، قاضی قطب الدین کاشانیؒ، نجم الدین صفراءؒ۔ لیکن ان میں سرفہرست سید نور الدین مبارک غزنوی (م۔ ۱۲۳۴ھ) کا نام ہے۔ (۳۶) ان کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> " خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی است۔ مقتداء و شیخ الاسلام دہلی بود، ودرزماں شمس الدین (التمش) او را میردہلی مے گفتند۔ "(۳۷)

سید نور الدین مبارک غزنویؒ شریعت اور طریقت کے جامع تھے۔ سلطان محمود غزنوی اور سلطان شمس الدین دونوں ان کے بڑے معتقد تھے اور جنگوں سے پہلے فتح و نصرت کے لیے ان سے دعا کے طالب ہوتے۔ (۳۸)

اس زمانے میں ایک اور قابلِ ذکر عالم جس کی شہرت بطور ایک ادیب اور مورخ کے ہے لیکن وقت کے فقہی رجحانات پر بھی جنھوں نے بڑا اثر ڈالا وہ قاضی منہاج الدین بن قاضی سراج الدین بن منہاج الدین جرجانی ہیں۔ (۳۹) سرزمینِ ہند میں فقہ کی تعلیم و تدریس کی بنیاد اور قانون اسلامی کی سب سے زیادہ رائج الوقت کتاب "الھدایہ" کو فروغ دینے میں مولانا برہان الدین بلخی کو شرف حاصل ہوا تھا۔ (۴۰)

عہدِ بلبن: سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں تو بے شمار علماء و فضلاء دنیا کے کونے کونے سے کھنچ کر بادشاہ کے دربار کی زینت بنے۔ سلطان نے ان کا بڑا احترام کیا۔ اس عہد کے فقہاء میں سے یہ نام قابل ذکر ہیں:

سراج الدین ابوظفر سجزیؒ، مولانا شرف الدین ولوالجیؒ، مولانا برہان الدین بزازؒ، قاضی

جمیل الدین کاشانیؒ ،قاضی رکن الدین سالونویؒ،(ان کا تذکرہ پہلے بھی کیا گیا ہے)۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں مولانا کہرامیؒ اور قاضی مغیث الدینؒ بڑے عالم اور فقیہ تھے۔سلطان نے ثانی الذکر کو قاضی مقرر کیا تھا۔اس سلطان کے زمانے میں علم بدیع ،فقہ، اصول فقہ،اصول دین،نحو اور تفسیر کے بعض اتنے بڑے علماء دہلی میں جمع تھے جو بخارا،سمرقند، بغداد، قاہرہ،دمشق،اصفہان اور تبریز کے عالی مرتبت علماء سے بھی زیادہ فاضل تھے۔(۴۱)

غیاث الدین تغلقؒ نے علماء وفضلاء کی سرپرستی کی ،مدرسے قائم کئے،علماء،مشائخ و سادات کے وظیفے مقرر کئے۔ایک فقہ بھی مرتب کی جو قرآن اور سلطنت دہلی کے بعض معمولات پر مبنی تھی۔سلطان محمد تغلق فقہ حنفی کی کتاب ''ہدایہ'' کا حافظ تھا۔فیروز شاہ تغلق نے بے شمار مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔اس نے فیروز آباد میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جو فیروز شاہی مدرسہ کے نام سے مشہور ہوا۔اس مدرسہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ (یہ صاحب مثنوی مولانا روم نہیں ہیں) جو تفسیر ،حدیث،فقہ کے جلیل القدر عالم تھے درس دیتے تھے۔(۴۲)

دورِ مغلیہ: جو اہل علم سب سے پہلے بابر کی توجہ اور سرپرستی سے مستفید ہوئے وہ تین تھے اول میر خوند کا پوتا خوندامیر مصنف ''حبیب السیر'' دوم شہاب الدین ہمائی اور سوم مرزا ابراہیم ہراتی۔ہمایوں نے اپنے مقربوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔(۱)علماء مشائخ (۲)ادباء وشعراء(۳)فقہاء وقضاۃ ،یہ حضرات اہل سعادت کہلاتے تھے۔بادشاہ کے اعزاء،امراء،وزراء اور سرداران فوج کو ''اہل دولت'' سے موسوم کیا جاتا تھا۔حسن ونشاط اور فنون لطیفہ کی قابلیت رکھنے والے ''اہل مراد'' تھے۔اورنگ زیب نے جن بڑے بڑے علماء اور اہل حق سے تعلیم وتربیت حاصل کی ان میں مولانا عبداللطیف سلطان پوریؒ،مولانا ہاشم گیلانیؒ ،سعد اللہ خانؒ (وزیر شاہ جہاں)،مولانا محی الدین عرف ملا موہن بہاریؒ، مولانا سید محمد قنوجیؒ، ملا شیخ احمدؒ (ملا جیون)،شیخ عبدالقویؒ ملا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔تفسیر،حدیث اور فقہ پر اس کی توجہ خاص مبذول رہتی تھی۔(۴۳)

عالمگیر کو فقہ اسلامی سے خاص شغف تھا۔اس نے شیخ نظام کے تحت حنفی علما کی ایک

پوری جماعت کو فقہ کی کتاب لکھنے پر مامور کیا۔ جس کا نام بعد میں ''فتاویٰ عالمگیری'' رکھا گیا۔ جو فقہ حنفیہ کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔ حضرت شاہ عبد الرحیمؒ والد شاہ ولی اللہؒ، مولانا میر محمد قنوجیؒ، ملا محمد جمیلؒ، قاضی محمد حسین جونپوریؒ، ملا حامد جونپوریؒ، شیخ وجیہ الدینؒ، شیخ رضی الدینؒ، سید علی اکبر سعد اللہ خانیؒ، سید نظام الدین ٹھٹھویؒ، مولانا جلال الدین محمدؒ، مولانا محمد شفیعؒ، ملا وجیہ العربؒ، ملا محمد فائقؒ، ملا محمد اکرم ملتانیؒ، ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہوریؒ، علامہ ابوالفرج عرف (سیدن معدنؒ)، ملا محمد غوثؒ، میر میرانؒ، قاضی سید عنایت اللہ مونگیریؒ اس کتاب کی ترتیب میں شامل تھے۔ بادشاہ خود ہر روز اس کتاب کے ایک دو صفحے سنتا تھا اور علماء کو مشورے دیتا تھا۔ (۴۴)

عہد عالمگیری کی قابل ذکر کتابوں میں سے یہی ایک ''فتاویٰ عالمگیری'' ہے جسے ہندوستان کے حنفی علماء ''ہدایہ'' کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں لیکن کوئی کتاب مبسوط اور جامع نہ تھی۔ جب اورنگ زیب نے باقاعدگی سے شرع رائج کی تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں، جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے اس لیے بادشاہ نے پاک و ہند کے ممتاز علماء کو حکم دیا کہ فقہ کی تمام کتابوں سے ''مفتیٰ بھا مسائل'' منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے۔ (۴۵) اس کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے اور آٹھ سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب تیار ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء اور طلبہ کو فقہ کی تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ (۴۶)

خاندان شاہ ولی اللہؒ: یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ سے چلا اور بارہویں صدی کے بعد حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان میں جمع ہو گیا۔ پاک و ہند بلکہ بیشتر بلاد عربیہ کی دینی فضا اسی گھرانے سے قائم ہوئی اور بعد میں آنے والوں کے لیے یہی خاندان روشنی کا مینار رہا۔ حضرت شاہ صاحب جن کے بیٹوں شاہ عبد القادر دہلویؒ، اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے قرآن پاک کے پہلے اردو ترجمے کئے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے حدیث و فقہ کی مسند سنبھالی۔ انگریزی عملداری میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا اور شاہ صاحبؒ کے پوتے شاہ اسماعیلؒ شہید عملی جہاد کے لیے اٹھے۔ (۴۷)

فقہ اور علمائے اہل سنت دیوبند: فقہ حنفی امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد، ان کے تلامذہ کے استخراجات اور پھر اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس طریق عمل میں ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر فقہاء و ائمہ کی تخریجات تک محدود رہتی اور گو وہ اعمال حضور ﷺ کی سنت اور صحابہؓ کے طریق سے متجاوز نہ ہوتے مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہ کر سکتا تھا۔ علمائے اہل سنت دیوبند نے اعمال و عبادات کو ان کے مصادر کی طرف لوٹایا، احادیث کے دفاتر کھولے، تحقیقات پھیلیں، رجال کی نئے سرے سے پڑتال ہوئی۔ مطالب و معانی میں بحثیں کی گئیں۔ اس راہِ تحقیق نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا اب وہی مسائل نور سنت کی روشنی دینے لگے، یہ سارا انقلاب اسی فکری تبدیلی سے ہوا۔

تیرہویں صدی ہجری میں فقہاء کی خدمات: اس صدی میں علما اہل سنت دیوبند نے نہ صرف پاک و ہند کے احناف کو سنت کا شعور بخشا بلکہ ان کی حدیثی تحقیقات نے شام و مصر تک ان حضرات کے علوم پھیلائے۔ اسی صدی میں علماء احناف کے پاس اصحاب ترجیح کے کچھ متون رہ گئے تھے، جن سے فقہ کی تدریس باقی تھی۔ ان میں مرکزی کتاب ''الہدایہ'' تھی جسے علامہ برہان الدین المرغینانی (م۔۵۹۳ھ) نے اس پیرائے میں لکھا تھا کہ دین کی اصل حجت ائمہ مجتہدین نہ سمجھے جائیں بلکہ طالب کا مرکز توجہ کتاب الٰہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہو۔ علامہ ابن ہمام اسکندریؒ (م ۸۶۱ھ) اور صاحب بحر علوم ابن نجیمؒ (م۔۹۶۹ھ) کے بعد فقہ حنفی کا دارومدار درمختار، عالمگیری، طحطاوی اور شامی پر رہ گیا تھا۔ ان کتب میں فقہ حنفی کے فتاوٰی نہایت منقح اور قابل اعتماد صورت میں ملتے ہیں۔ اس فقہ کی اساس امام محمدؒ کی کتابوں پر تھی۔ امام محمدؒ، امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے اور حضرت امام مالکؒ (م۔۱۷۹ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ آپ نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے ذوق اجتہاد کا تقابلی مطالعہ کیا تو امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کو اصول سنت کے زیادہ قریب پایا۔ آپ نے ان احساسات پر ''الحجة علی اهل المدینه'' لکھی اور اس کا ایک نسخہ مدینہ منورہ بھجوایا۔ یہ کتاب مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ میں موجود تھی۔ ایک نقل ترکی کے مکتبہ نور عثمانیہ میں تھی۔ (۴۸)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ایک شاگرد مولانا مفتی مہدی حسنؒ نے اس کتاب پر تحقیقی کام کیا اور بیس (۲۰) سال میں اس کے مسودے کی تصحیح اور تعلیق مکمل ہوئی۔ حیدر آباد دکن کے مطبع ''المعارف النعمانیہ'' نے ۱۳۸۵ھ میں اس کی دو جلدیں شائع کیں۔ دوسری جلد ''کتاب البیوع'' پر ختم ہوتی ہے جبکہ پوری کتاب چار جلدوں میں ہے۔

امام محمدؒ کی کتاب ''المبسوط'' جو ظاہر الروایہ میں کتاب الاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے اس نام سے بھی موسوم کرتے ہیں، استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں چھ جلدوں میں موجود تھی۔ دیوبند کے ایک عالم مولانا ابوالوفاءؒ افغانی رئیس لجنتہ المعارف النعمانیہ نے اس پر تحقیقی کام کیا اور تعلیق لکھی۔ ۱۳۹۰ھ میں اس کی پہلی دو جلدیں شائع ہوئیں۔ ان کی کتاب ''السیر الکبیر'' بھی امام سرخسی کی شرح کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

نصب الرایہ: آٹھویں صدی میں حافظ جمال الدین زیلعیؒ (م۔۷۶۲ھ) نے علم حدیث کا ایک بڑا خزانہ ''نصب الرایہ'' کے نام سے جمع کیا تھا۔ یہ عظیم علمی سرمایہ سالہا سال سے نایاب تھا۔ علماء دیوبند نے نہ صرف اسے طبع کرانے کا اہتمام کرایا بلکہ اس پر "بغية الالمعی فی تخریج الزیلعی " کے نام سے ایک حاشیہ بھی لکھا۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔[۱] (۴۹)

شرح نقایہ: محدث کبیر ملا علی قاریؒ کی کتاب ''شرح نقایہ'' فقہ و حدیث کا عظیم سرمایہ تھی مگر زیور طباعت سے آراستہ نہ تھی۔ دارالعلوم کے شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علیؒ نے ''محمود الرایہ'' کے نام سے اس پر ایک مستقل حاشیہ لکھ کر اسے شائع کیا۔ اب یہ کتاب ''حلب'' سے شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے مختصر القدوری، نور الایضاح اور کنز الدقائق پر اعلیٰ عربی حاشیے تحریر کئے۔ آپ نے آزاد قبائل اور افغانستان کے طلبہ کے لیے نور الایضاح کا فارسی

---

[۱] مجلس علمی ڈابھیل نے بھی شائع کی ہے۔

حاشیہ بھی تحریر کیا جسے مطبع قاسمیہ نے شائع کیا ہے۔(۵۰)

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے تمام فقہی ابواب کو احادیث و روایات کی روشنی میں مرتب کرنے کا اہتمام کیا اور خانقاہ تھانہ بھون میں، اعلاء السنن کے نام سے ایک عظیم علمی ذخیرہ بیس جلدوں میں مرتب ہوگیا۔ یہ علمی خدمت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے آپ کی زیر نگرانی انجام دی۔ اس کا مقدمہ فوائد علوم الحدیث علماء مصر نے شائع کیا۔ علامہ ابن ہمام ؒ(م۔۸۶۱ھ) کی کتاب " زاد الفقیر " پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے " المستتر الحقیر " کے نام سے عربی زبان میں ایک حاشیہ لکھا۔(۵۱)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتاویٰ رشیدیہ تین حصوں میں، مولانا تھانویؒ کا فتاویٰ ''فتاویٰ امدادیہ'' چھ ضخیم جلدوں میں، مولانا مفتی عزیز الرحمان نقشبندی کا ''عزیز الفتاویٰ'' مفتی محمد شفیع کا ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند''، مفتی عبدالرحیم کا ''فتاویٰ رحیمیہ'' اور مفتی رشید احمد کا ''احسن الفتاویٰ''۔۔۔۔ یہ وہ فقہی مواد ہے جو علماء دیوبند کی فقہی خدمات میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی فقہی بصیرت

قدرت نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو ایک وسیع، رنگا رنگ اور ہمہ گیر دماغ عطا کیا تھا۔ اور انھوں نے اپنے دور کے تمام شعبوں پر اثر ڈالا ہے۔ آپ ایک محققانہ ذہن لے کر آئے تھے، تفسیر حدیث، منطق، فلسفہ اور علم الکلام کے میدان میں آپ نے بڑا تحقیقی اور علمی کام کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد وہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے درس حدیث کو روایتی طریقے سے ہٹ کر نئے طریقے پر چلایا۔ وہ پاک و ہند کے ان محدثین میں سے ہیں جنھوں نے درس کے دوران روایت، درایت، مختلف علماء کے فقہی و نظری افکار، رجال کی تحقیق، فن حدیث پر محققانہ تبصرے کئے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیقات نہایت سلجھی ہوئی، سنجیدہ اور سادہ ہیں۔ جس قسم کا مضمون بیان کرتے ہیں اسی مناسبت سے لکھنے والا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ مشکل پسند علماء کی طرح وہ اپنے خیالات کو الفاظ و اصطلاحات کا پابند نہیں بناتے بلکہ خیالات کے

مطابق اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں عبارت میں زور اور فصاحت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ کی تحقیقات میں اہم خصوصیات ان کا استدلالی رنگ ہے، لیکن اکثر و بیشتر دلچسپ تمثیلات کے ذریعے استدلال کرتے ہیں۔ ان کی قوت علمی، قوت فیصلہ اور قوت استدلال علمائے وقت کے ہاں مسلم تھی۔

احمد رضا بجنوریؒ آپ کے متعلق لکھتے ہیں :

''شاہ صاحبؒ کی شخصیت ایسی جامع، معقول و منقول شخصیت تھی کہ ہر علم و فن کی امہات کتب کا مطالعہ فرما کر ان کے مشکلات مسائل کو حل کر چکے تھے اور کہا کرتے کہ ہر علم میں اپنی رائے رکھتا ہوں، سوائے فقہ کے اور فقہاء کی علمی کاوشوں کی بہت زیادہ تعریف فرمایا کرتے تھے اور کتب فقہ میں مبسوط، بحرالرائق کے علاوہ ''بدائع الصنائع'' کی زیادہ تعریف کرتے تھے کہ یہ کتاب فقیہ النفس بنا دینے والی ہے۔'' (۵۲)

آگے لکھتے ہیں کہ:

''غیر معمولی تبحر اور وسعت مطالعہ کے باوجود شاہ صاحبؒ سلف کے مسلک سے الگ ہو کر کسی تحقیق کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اکابر و اساتذہ کے مسلک کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے تھے۔'' (۵۳)

درس میں جب مسائل خلافیہ پر کلام کرتے تو جا بجا شیخ ابن ہمامؒ کی تحقیقات کا حوالہ دیتے۔ طبقات فقہاء پر ان کی بصیرت کا یہ حال تھا کہ جب ان کا ذکر کرتے تو بتلاتے کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے۔ امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاویؒ (م۔ ۳۲۱ھ) کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ امام طحاویؒ صرف مذہب حنفی کے عالم ہی نہیں بلکہ مذاہب اربعہ کے بھی امام ہیں۔

آپ نے صرف فقہ حنفی نہیں بلکہ متداول و غیر متداول چاروں فقہوں سے متعلق تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ ایک موقع پر خود کہا کہ طحاوی کی مختصر الطحاوی کا میں بیس (۲۰) بار مطالعہ کر چکا ہوں۔ جب آپ کشمیر، بارہ مولہ میں تھے تو فتویٰ بھی دیتے رہے۔ چنانچہ کہا

کرتے تھے:

"ان سالوں میں کسی فتویٰ کی کتاب کی جانب رجوع کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" (۵۴)

کتاب الأم: امام شافعیؒ کی کتاب "الام" کی بے حد تعریف کرتے اور کہتے کہ میں ہر کتاب کی تلخیص پر قادر ہوں لیکن کتاب الام کے بارے میں نہیں۔ جب کبھی اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو امام شافعیؒ کی ذکاوت وذہانت اوران کی فطانت ورذانت کا یقین بڑھتا ہے۔ (۵۵)

بدائع الصنائع: حنفیہ کی کتابوں میں "بدائع" کے بے حد معتقد تھے۔ ان کی رائے میں عراقی فقہائے احناف، خراسانی فقہائے احناف کے مقابل میں زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ مگر پھر بھی "بدائع" کے مصنف ابوبکر کاسانی حالانکہ وہ خراسانی ہیں، تثبت اور اتقان میں کسی عراقی سے کم نہیں۔ کہا کرتے کہ "بدائع الصنائع" ایسی کتاب ہے اگر کوئی عالم غور وفکر سے اس کا مطالعہ کرے تو خود اس کا مزاج تفقہ میں ڈھل جائے گا۔

کوئی شخص بحر الرائق لابن نجیم "رد المختار" اور فقہ حنفی کے مبسوطات کا مطالعہ کئے بغیر فتویٰ دینے کا حق نہیں رکھتا۔ (۵٦)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنی ترجیح کا معیار اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کسی مسئلہ میں جب امام ابو حنیفہؒ کا خود کوئی قول ہوتا ہے تو میں اس کو لائق التفات سمجھتا ہوں، اگر امام اعظمؒ کی کوئی رائے نہ ہو تو پھر امام ابو یوسفؒ کی شخصیت میرے نزدیک معتمد ترین ہے اور اگر ان کی بھی رائے نہ ہو تو پھر امام محمدؒ کے اقوال کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان تینوں کا کوئی قول اگر نہیں تو میں امام طحاویؒ کے فکری سرمایہ سے استفادہ کرتا ہوں اور اگر عراقی و ماوراء النہر کے احناف میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے تو میں فقہائے عراق کے قول پر زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔" (۵۷)

مجتہدانہ نظریات: فقہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی کئی تصانیف عربی و فارسی میں موجود ہیں جن کا تفصیلی ذکر تصانیف کے باب میں آرہا ہے۔ مقالہ کے اس باب میں بعض نادر تحقیقات کو شاہ صاحبؒ کی تصانیف و تالیفات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ان کے

فقہ میں مجتہدانہ نظریات بھی واضح ہو جائیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مؤطا امام مالک کی شرح فارسی زبان میں "المسویٰ" کے نام سے لکھی ہے۔ انھوں نے فقہائے حدیث کے طریقہ پر احادیث و آثار کی تشریح بھی کی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تحقیق مناط، تخریج مناط اور تنقیح مناط کی طرف بھی اس کتاب میں توجہ دی ہے۔ اس سے مراد علماء اصول فقہ کی اصطلاح ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی انہی اصول فقہ کی تشریح و توضیح کی ہے۔

تحقیق المناط: اس کا مطلب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام سے کسی جزئی صورت میں کوئی حکم صادر ہوا۔ پھر یہی حکم اس نوع کی ساری جزئیات ثابت کر دے۔ مثلاً شریعت نے حالت احرام اور حدود حرم میں شکار کی ممانعت کی ہے اور پھر احرام میں شکاری کے لیے شکار کردہ جانور کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔ اس قیمت کی تشخیص ہی تحقیق مناط ہے۔ اس کا تعلق فقہ کی اہم بنیاد قیاس سے نہیں ہے۔ اس میں کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں اور یہ کام ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ تجربہ و شعور رکھتا ہو۔ (۵۸)

تنقیح المناط: کسی صورت میں شارع علیہ السلام کی طرف سے ایک حکم صادر ہو جائے اور اس صورت میں بہت سے امور جمع ہو جائیں، ان میں سے بعض امور میں تو یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اسی حکم مذکور کے لیے مناط یعنی علت بن جائیں اور بعض امور کو مدار حکم بننے میں کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ تو ان امور کثیرہ میں سے یہ پہچاننا کہ مناط حکم اور علت حکم ان میں کون سا ہے اور اسے متعین کرنا تنقیح المناط ہے۔ اس کی مثال حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ "ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ! میں تباہ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا: بتاؤ کیا بات پیش آئی۔ اس نے کہا کہ رمضان شریف میں روزے کی حالت میں میں نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی ہے۔ فرمایا: کیا تیرے بس میں ہے کہ ایک غلام آزاد کرے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا: کیا یہ کر سکتے ہو کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ؟ عرض کیا۔ نہیں۔ فرمایا: کیا یہ کر سکتے ہو کہ متواتر دو مہینے روزے رکھو؟ عرض کیا نہیں"۔ (۵۹)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے ہاں وجوب کفارہ کے حکم کے لیے مناط اور علت

رمضان شریف میں روزے کی حالت میں قصداً روزہ افطار کرنا ہے، خواہ وہ مضطر فعل جماع ہو یا کھانا یا پینا ہو۔ بشرطیکہ یہ عمل عمداً کیا جائے اور رمضان شریف کے مہینے میں کیا جائے۔ اور یہ بات کہ اس واقعہ خاص میں وہ عمل جماع کی صورت میں پیش ہوا محض اتفاقی امر ہے۔ امام احمدؒ کے ہاں وجوب کفارہ کے لیے مناط اور علت اس فعل کا خاص بصورت جماع ہونا ہے۔ لہٰذا جماع کی صورت میں اگر افطار ہوا تو کفارہ ہوگا، لیکن کھانے پینے تک اس حکم کو متعدی نہیں کر سکتے۔

تخریج المناط: شارع علیہ السلام سے کوئی حکم کسی صورت کا صادر ہو جائے اور اس صورت میں بہت سے امور جمع ہوئے ہوں کہ ان میں سے ہر ایک میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ علت حکم بن سکتا ہے تو مجتہد اپنی قوت اجتہاد و استنباط کے ذریعے ان امور میں سے کسی ایک امر کو حکم کے لیے علت قرار دینے کے لیے راجح کر دیتا ہے اور اسی کو مناط حکم ٹھہراتا ہے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جس میں اشیاء میں کمی بیشی کو اور دست بدست تبادلہ نہ کرنے کو ربوا قرار دیا گیا ہے۔ حضرات مجتہدین نے دیکھا کہ ان اشیاء ستہ میں بہت سے امر موجود ہیں۔ قدر و جنسیت، طعم و ثمنیہ، اقتیات و ادخار۔۔۔۔۔ اب یہ تعین کرنا چاہیے کہ حرمت ربوا کے لیے علت کیا ہے؟ امام اعظمؒ نے یہ اجتہاد کیا کہ مناط حکم یعنی تفاضل کی حرمت کا دار و مدار وصف اول (قدر و جنس) پر ہے اور امام شافعیؒ نے کہا کہ علت حکم وصف ثانی یعنی طعم و ثمنیہ ہے اور امام مالکؒ نے کہا کہ مدار حکم امر ثالث یعنی اقتیات و ادخار ہے، ان حضرات کا جیسا اجتہاد تھا، اسی کے مطابق ہر ایک نے حکم ربوا کے لیے علت کی تعیین و تشخیص کی۔

تنقیح المناط اور تخریج المناط میں فرق: تنقیح المناط اور تخریج المناط میں فرق یہ ہے کہ اول میں ایسے امور جمع ہو جاتے ہیں کہ ان کو حکم کے مناط ہونے میں اصل مناط حکم کے ساتھ کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس صورت میں مجتہد کا کام ہوتا ہے کہ وہ قوت اجتہادی سے مناط حکم کی تنقیح کر کے واضح کر دیتا ہے کہ ان امور میں سے درحقیقت مناط یہ ہے اور تخریج المناط میں ایسے امور جمع ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ حکم کے لیے مناط اور علت ہو تو مجتہد ان میں سے کسی ایک کی تعیین کر دیتا ہے۔ تنقیح المناط اور تخریج المناط یہ دونوں مجتہد کے کام ہیں اور مجتہدین اس بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اجتہاد میں

اختلاف کرتے ہیں۔(۶۰)

مسئلہ رفع یدین: مالک بن حویرث سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع فرماتے تو" رفع یدیه حتی یحاذی بهما اذنیه " ۔دوسری روایت میں ہے۔" یحاذی بهما فروع اذنیه "۔(۶۱)

قدوری میں ہے:

" واذادخل الرجل فی صلوٰته کبرو رفع یدیه مع التکبیر حتی یحاذی با بهامیه شحمة اذنیه " ۔(۶۲)

امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے اور اس سے تمام روایات پر عمل ہو جاتا ہے کیونکہ جن روایات میں ہاتھوں کا کندھوں کے برابر لانا مذکور ہے۔کانوں کی لوتک ہاتھ لے جانے سے ان پر بھی عمل ہو جائے گا۔امام شافعیؒ کا مسلک ہاتھوں کو کندھوں تک لے جانا ہے۔

رفع یدین کا مسئلہ علماء کے نزدیک بہت ہی معرکۃ الاراء سمجھا جاتا ہے۔دیگر علماء، ائمہ احناف سے اشد اختلاف رکھتے ہیں۔بحث و مباحثے بھی ہوتے ہیں، اپنے اپنے مسلک کے حق میں رسائل و کتب لکھی جاتی ہیں۔اس سلسلہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا اور اپنی تحقیق سے مسئلہ کی حقیقت کھول کر سامنے رکھ دی۔آیئے ان علماء وائمہ کی رائے اور ان کے اقوال پر نظر ڈالتے ہیں جو اس مسئلہ میں احناف سے اختلاف کرتے ہیں۔سب سے پہلے حافظ ابن حجر العسقلانی کی سنئے! کہتے ہیں۔کہ علماء احناف ترک رفع یدین کے قائل ہیں اور دلیل میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرتے ہیں۔جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

''میں نے حضور اکرم ﷺ کو کسی بھی نماز میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی اور تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''(۶۳)

حافظ صاحب چونکہ شافعی المسلک ہیں اس لیے وہ احناف کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا اس حدیث سے استدلال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، کیونکہ ابوبکر بن عیاشؒ ایک راوی ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آخری عمر میں ان کی قوت حافظہ خراب ہوگئی تھی۔اس لیے ان سے روایت کی ہوئی یہ حدیث ناقابل قبول ہوگی۔احناف

کے خلاف دوسری دلیل جس سے بھی ان کے مسلک کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔انھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا واقعہ ہے کہ اگر وہ کسی کو رفع یدین کرتے نہ پاتے تو اسے کنکریوں سے مارتے، اس صورت میں احناف کا ان کی روایت سے استدلال کس طرح درست ہو سکتا ہے۔(۶۴)

حافظ ابن حجرؒ اپنے مسلک کی تائید میں امام بخاریؒ کے ایک قول کا بھی سہارا لیتے ہیں جس میں انھوں نے کہا کہ جس شخص نے بھی رفع یدین کو بدعت سمجھا یا اس کے اثبات میں کسی قسم کا شک کیا تو گویا اس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کیا کیونکہ صحابہؓ میں سے کوئی بھی عدم رفع کا قائل نہیں ہے۔(۶۵)

اس کے بعد حافظ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"ان تمام آراء سے رفع یدین کے ثبوت کو تقویت ملتی ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔"(۶۶)

رفع یدین کے مسئلہ میں احادیث دونوں قسم کی وارد ہوئی ہیں، ایسی روایات بھی ہیں جن سے رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے اور ایسی بھی ہیں جو عدم رفع پر دلالت کرتی ہیں۔(۶۷)

امام محمدؒ کے قول کا یہ مفہوم لینا درست نہ ہو گا کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسری تکبیرات میں رفع یدین سے نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ انھوں نے یہ اختلاف افضلیت اور عدم افضلیت کی بنا پر کیا ہے ورنہ رفع یدین کے ثبوت سے انھیں بھی انکار نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مسئلہ رفع یدین: آپ نے احادیث اور آثار پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"جب رکوع میں جائے تو اپنے دونوں ہاتھ مونڈھوں تک خواہ کانوں تک اٹھائے۔اسی طرح جب رکوع سے سر اٹھا کر کھڑا ہو تو رفع یدین کرے اور سجدہ میں ایسا نہ کرے۔میرے نزدیک اس میں راز یہ ہے کہ رفع یدین ایک تعظیمی فعل ہے جس سے نفس کو ان اشغال سے روکا جاتا ہے جو نماز کے منافی ہیں۔ اس واسطے تعظیمات ثلاثہ میں سے ہر ایک فعل کی ابتداء رفع یدین سے کی گئی

تاکہ نفس کو اس فعل کے ثمرہ یعنی تعظیم پر آگاہی رہے اور یہ ان ہیئات میں سے ہیں کہ کبھی تو آپ نے کرلیا اور کبھی ترک کردیا۔ مگر دونوں سنت ہیں۔ ہر ایک کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ رفع یدین کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن میں اہل المدینہ اور اہل الکوفہ کا اختلاف ہے اور ہر ایک کے قول کے لیے دلیل ہے اور ایسے مسائل میرے نزدیک حق ہیں کہ سب سنت ہیں۔ جو شخص رفع یدین کرتا ہے میرے نزدیک اس شخص سے جو رفع یدین نہیں کرتا اچھا ہے کیونکہ رفع یدین پر جو حدیثیں دلالت کرتی ہیں وہ زیادہ بھی ہیں اور ثابت بھی خوب ہیں۔'' (۶۸)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے عدم رفع یدین پر شاہ ولی اللہ کا تبصرہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے عدم رفع یدین پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

'' کچھ بعید نہیں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے خیال کیا ہو کہ اخیر سنت رفع یدین کا ترک کرنا ہو، اس خیال سے کہ نماز کا دارومدار اعضاء کے سکون پر ہے اور ان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی کہ رفع یدین ایک تعظیمی فعل ہے، اس لیے نماز کی ابتداء اس سے کی گئی ہے یا انہوں نے یہ سمجھا ہو کہ رفع یدین ایک ایسا فعل ہے جس سے کسی چیز کا ترک معلوم ہوتا ہے اس واسطے اثناء نماز میں اس کا ہونا نامناسب ہے اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو کہ نماز کے اندر جتنے فعل مقصود بالذات ہیں اور ان سب کے شروع میں بار بار نفس کو ماسوا کے ترک پر تنبیہ کرنا منظور ہے۔'' (۶۹)

بہرحال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عدم رفع یدین کے قائل ہیں لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی تعداد رفع یدین کی قائل ہے۔

علامہ عینیؒ کی رائے: علامہؒ یہ کہتے ہیں کہ:

'' احادیث کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ قبل رکوع اور بعد رکوع تکبیر کہنے کے ساتھ رفع یدین بھی کیا جائے کیونکہ بکثرت احادیث سے اس کا حکم ملتا ہے۔ امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کا بھی یہی مسلک ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ

رفع یدین کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی تائید عامر الشعبیؒ، ابواسحاق السبیعیؒ، مغیرہؒ، وکیعؒ، عاصم بن کلیبؒ اور امام زفرؒ وغیرہ کرتے ہیں اور عدم رفع کی احادیث پر عمل کرتے ہوئے رفع یدین کی احادیث کو ضعیف بتلاتے ہیں۔"(۷۰)

جو حضرات رفع یدین کے قائل ہیں وہ حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں یزید بن ابی زیاد کا نام آتا ہے جن پر محدثین نے اعتراض کیا ہے اس لیے ان کی روایت قابل قبول نہ ہوگی۔ ان کی روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ پہلے کی روایت ہو جب رفع یدین جائز تھا، بعد میں منسوخ ہوگیا، جیسا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھوں نے ایک شخص کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو کہا، "ایسا نہ کرو" کیونکہ یہ فعل آنحضور ﷺ نے آخر میں ترک فرمادیا تھا۔

اب رفع یدین کے قائلین کے پاس صرف ابن حمید ساعدی کی وہ حدیث رہ جاتی ہے جس سے وہ استدلال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابوداؤد نے اس روایت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے جس میں ایک روایت احمدؒ بن حنبل سے بھی ہے، اس میں بوقت رکوع رفع یدین کا تذکرہ نہیں ہے۔ جس حدیث سے رفع یدین کا تذکرہ ملتا ہے وہ عبدالحمید بن جعفرؒ سے مروی ہے جو کہ ضعیف راوی ہیں۔ لیکن اگر اس بات کو صحیح سمجھتے ہوئے عبدالحمیدؒ بن جعفر کو مقبول الحدیث تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس روایت سے استدلال نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں محمد بن عمر بن عطاء کا نام آتا ہے۔ جن کا سماع عبدالحمید بن جعفر سے ثابت نہیں ہے۔ بیہقی نے امام بخاریؒ کا قول اثبات سماع میں نقل کیا ہے لیکن عدم سماع کے قائل شعبیؒ بھی ہیں جن کا درجہ اس سلسلہ میں امام بخاریؒ سے بڑھا ہوا ہے اس لیے انھی کا قول قابل قبول ہوگا۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عدم رفع یدین بہتر اور اولیٰ ہے۔ ویسے رفع یدین کے جواز میں بھی کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق اور رائے: آپ حنفی المسلک تھے ہر اور فن سے اس کے مؤیدات کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ امام اعظمؒ اور ائمہ احناف کی عظمت فکر

،اصابت رائے اور معتدل مسلک کی قدر کی جائے۔ان کا کارنامہ یہ تھا کہ فقہ حنفی اور حدیث میں اتصال کرادیا بلکہ محدثانہ طرز سے اس کی تعلیم کا رواج ڈالا۔اس کا اصل کریڈٹ اور امتیاز مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہی کو پہنچتا ہے،اس کے باوجود کہتے ہیں کہ میں ہر فن میں رائے رکھتا ہوں اور اپنی خود کو رائے دینے کا مجاز سمجھتا ہوں مگر فقہ میں مقلد محض ہوں۔(۱۷)

اس مسئلہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا موقف وہی ہے جو ائمہ احناف کا چلا آرہا ہے لیکن ان کے تنقیدی و تحقیقی ذہن نے کسی جگہ بھی تقلیدی انداز کی گفتگو نہیں کی ہے، ہر مقام پر سنجیدگی اور تحقیقی وقار کو برقرار رکھا ہے۔

رفع یدین میں اتفاق یا اختلاف جو کچھ ہے وہ قبل الرکوع و بعدہ و بین السجدتین و بعد الرکعتین سے متعلق ہے۔امام شافعیؒ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اور ایک قول کے مطابق قعدہ اولیٰ سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کے قائل ہیں لیکن امام ابوحنیفہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور تکبیرات میں رفع یدین کے قائل نہیں ہیں۔امام احمدؒ اور امام مالکؒ بھی امام شافعیؒ کے موافق ہیں لیکن امام مالکؒ کی مشہور روایت کے مطابق جس کا ''بدایۃ المجتہد'' میں ابن رشد مالکی نے ذکر کیا ہے، وہ امام ابوحنیفہؒ کے موافق ہیں۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اس سلسلہ میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔اپنی کتاب ''نیل الفرقدین'' کی پہلی فصل میں انھوں نے ''معنی رفع الیدین پر بحث کی ہے اور اس میں بہت سی احادیث ،افعال صحابہ اور آثار کو نقل کیا ہے۔رفع یدین کے معانی اور اصلیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تقریباً چالیس مشہور اور عظیم الشان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔رفع الیدین پر علمی تحقیقی بحث کے بعد بڑے استدلالی انداز میں لکھتے ہیں:

"مغزی الکلام ان الیدین مشغولتان بوظائف عند الترك ایضاً و انما اقل النقل فی الترك لکونه من التروك مع کونه کثیراً فی نفسه کاخفا بسم الله و اخفاء آمین و ترك جلسة الاستراحة و انما تردد فیه من اختار الرفع مذهباً او کان من

عادته ترجیح جانب الاختلاف المباح "۔ (۷۲)

دوسری فصل میں "معنی التکبیرو موضعه و مزید خصوصیة برفع الصوت و الاعلان " پر بحث کی ہے کہ:

" واذا علا شرفاً و فی العساکر کما فی العمدة عن الطبری من باب الذکر بعد الصلوٰة و کذا عند ابن ماجه فتح قسطنطنیه بالتکبیر رفع الفاروق الصوت به فی لیلة التعریس "

مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے عمدۃ القاری اور مصنف ابی شیبہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، محمد بن سیرینؒ، قاسمؒ، سالم بن عبداللہؒ، سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ، ابن عمرؓ، عمرؓ بن خطاب اور ابن عباسؓ جلیل القدر صحابہؓ اور تابعین جھکتے وقت اور سجدہ میں جاتے وقت رفع یدین تو کیا کرتے وہ سرے سے تکبیر ہی نہیں کہتے تھے لکھا ہے:

لا یکبرّون فی الصلوٰة اذا خفضوا۔ (۷۳)

اور مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

ان عمر بن عبدالعزیز کان لا یتم التکبیر ۔ (۷۴)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔

" صلیت خلف القاسم و کانا لایتمان التکبیر " (۷۵)

عمرو بن مرہؒ کہتے ہیں:

" صلیت مع سعید بن جبیر فکان لا یتم التکبیر "۔ (۷٦)

اس طرح جابر بن زیدؒ بیان کرتے ہیں:

" صلیت مع ابن عباس بالبصره فلم یکبر "۔(۷۷)

تکبیر میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے۔ رکوع اور سجدہ کی حالتیں پستی کی ہیں۔ عظمت اور پستی دونوں کو ایک جگہ جمع نہیں کیا جا سکتا۔

اس تصریح کے بعد بھی مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ان حضرات کے فعل کو مسلک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ اتفاقات اور بیان جواز پر محمول کیا ہے یا اس بات پر محمول

کیا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ آہستہ تکبیر کہنے کی وجہ سے کسی راوی نے صرف اپنی سماعت پر اعتبار کرتے ہوئے اس کو روایت کردیا ہو۔

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ تکبیرات سنت ہیں اور دوسری جماعت ان کے واجب ہونے کی قائل ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

" تكبيرات الانتقالات سنة ام واجبة ، قلت اختلفوا فيه فقال قوم هي سنة ، قال ابن المنذور به قال ابو بكر الصديق و عمرو جابر و قيس بن عباد و الشعبي و الاوزاعي، سعيد بن عبد العزيز و مالك و الشافعي و ابو حنيفه۔ و نقله ابن بطال ايضاً عن عثمان و علي و ابن مسعود و ابن عمرو ابي هريره و ابن الزبير و مكحول، والنخعي و ابي ثور، و قالت الظاهرية و احمد في رواية كلها واجبة۔"(۷۸)

بعض علماء کہتے ہیں کہ تکبیر حرکات امام کی اطلاع اور شعار صلاۃ ہے، سنت صرف جماعت کی حالت میں ہے۔ اکیلے نماز پڑھنے والے کو تکبیر کہنے یا نہ کہنے میں اختیار ہے۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

" انما شئی یزین به الرجل صلوٰته " (۷۹)

تیسری فصل میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے وہ احادیث وآثار نقل کئے ہیں جن سے رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے اور ابو بکر جصاصؒ اور رازیؒ کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔ جہاں تک نفس رفع یدین کا تعلق ہے وہ ثابت ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

" ان الرفع متواتر اسناداً عملاً ولا يشك فيه "۔ (۸۰)

اسی طرح آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ترک رفع کے متعلق روایات کم ہیں لیکن اصحاب کوفہ کے نزدیک عملاً وہ روایات متواتر ہیں۔ اہل کوفہ کے علاوہ مدینہ طیبہ کے بہت سے

حضرات نے رفع یدین ترک کر دیا تھا۔ جس کی بنا پر امام مالکؒ کا مذہب مختار ترک رفع کا ہے، اس کا اعتراف ابن قیمؒ نے بھی کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو حجت نہیں تسلیم کیا۔ (۸۱)

کثرت رواۃ کا جواب: رفع یدین کے بارے میں کثرت رواۃ کا جواب دیتے ہوئے علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لکھا ہے:

"جن لوگوں نے رفع یدین کے رواۃ کی تعداد پچاس کے قریب بتائی ہے انھوں نے ان راویوں کو بھی شامل کیا ہے، جنھوں نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی روایت کی ہے۔ ورنہ زیر بحث رفع یدین کے راوی تو صرف بیس (۲۰) کے قریب ہیں۔ ان راویوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو نقد و جرح کی زد میں آچکے ہیں۔ اس لیے ایسے راویوں کو نکال کر صرف ثقہ راویوں کی تعداد پندرہ یا اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔" (۸۲)

اس کے بعد آپ نے رفع یدین کی روایتوں پر نہایت معقول اور جامع بحث کی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے اقوال و آثار نقل کئے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے:

" كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفع يديه حذو منكبيه اذا افتتح الصلواة و اذ كبر للركوع و اذا رفع راسه من الركوع رفعها "۔ (۸۳)

ابی حمیدؒ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتلایا ہے، اسے مختلف محدثین نے روایت کیا ہے:

" اذا قام الى الصلواة رفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم كبر حتى يقر كل عضو منه فى موضعه معتدلاً و قيل يبتدئ بالرفع مع ابتداء التكبير "۔ (۸٤)

مختصر یہ کہ جو لوگ رفع یدین کے جواز کے قائل ہیں انھیں مختلف روایتوں کی تطبیق میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے، دشواری ان لوگوں کو پیش آتی ہے جنھوں نے تشدد کی راہ اختیار کی ہے اور اختلافات کے باعث تمام روایات پر عمل نہ کر سکنے کی وجہ سے طرح طرح کی تاویل

وتوجیہہ پر مجبور ہوئے ہیں۔ بقول انور شاہ صاحبؒ یہ اس لیے ہوا کہ :

" انما یضیق الامر فیه علی بعض الناس حیث انهم شددوا فی الرفع " ۔ (۸۵)

ترک رفع یدین پر بحث: ان حقائق کی وضاحت کے بعد مولانا انور شاہ کشمیریؒ ترک رفع یدین پر بھی مفصل بحث کرتے ہیں اور حدیث کی مشہور کتاب "التعلیق الحسن" للشیخ النیموی ؒ سے اس بحث کا وافر حصہ نقل کرتے ہیں، اس کے علاوہ بھی آپ نے اور بہت سے علمی جواہر پارے اس سلسلہ میں شامل کئے ہیں۔ یہ بحث تین حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ روایت پر گفتگو

۲۔ الفاظ کا اختلاف

۳۔ اعتراض کا جواب۔

(ا) روایت ابن مسعود ؓ: حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی مشہور روایت ہے جس سے ترک رفع یدین کا جواز ملتا ہے:

علقمہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: "کیا میں تمھیں ایسی نماز نہ پڑھاؤں جیسی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے نماز پڑھائی اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔" (۸۶) یہ صحیح حدیث ہے۔

اس حدیث کے بارے میں عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ یہ ابن مسعودؓ سے ثابت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے پہلی مرتبہ کے پھر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ابن مبارکؒ کے اس قول کے بارے میں لکھتے ہیں :

" درحقیقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں، ایک تو خود ان کا فعل ہے جس کو ابی داؤد، ترمذی، نسائی اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے پہلی مرتبہ کے اور کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس حدیث کو امام طحاویؒ اور دیگر حضرات نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ روایت بالمعنی ہے اور اس پر عبداللہ

بن مبارکؒ نے تنقید کی ہے۔" (۸۷)

آپ نے حدیث کے اضطراب اور امام بخاریؒ کے اعتراض کا جواب نہایت تفصیل کے ساتھ دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے ترک رفع ثابت ہے۔ (۸۸)

بعض لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علمی مرتبہ کو گھٹانے کے لیے ان کو مطعون کیا ہے، بقول ان کے کہ ان کی لاعلمی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ سجدہ میں کہنیاں زمین پر رکھ دیتے تھے یا رکوع میں تطبیق کرتے تھے۔ مولانا انور شاہ کشمیری نے عمدۃ القاری کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہ افعال لاعلمی کی بنا پر نہیں تھے بلکہ رخصت پر عمل کرنے کی وجہ سے تھے، اس معاملہ میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت: رفع یدین کے ترک میں دوسری روایت براء بن عازبؓ کی ہے:

" ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم اذا کبر لافتتاح الصلوٰۃ رفع یدیہ حتی یکون ابھاماہ قریباً من شحمتی اذنیہ ثم لا یعود۔" (۸۹)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس روایت پر تفصیل سے محدثانہ ومحققانہ گفتگو کی ہے اور جن اشخاص نے اس کے رواۃ پر جرح کی ہے ان کا شافی و وافی جواب دیا ہے۔ اس لفظ "لایعود" یا اول تکبیر کی وجہ سے بعض لوگوں نے حدیث میں اضطراب ثابت کیا ہے اس کا بھی آپ نے خاطر خواہ جواب دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کو بعض لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ بجائے عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہونے کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہاں تک کہ "نصب الرایہ" کے عام نسخوں میں بھی یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے۔ آپ نے مختلف حوالوں سے "نصب الرایہ" کی تصحیح کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اصل عبارت اس طرح ہے:

"عن طاؤس بن کیسان عن ابن عمر کان یرفع یدیه"۔
کلکتہ کی لائبریری میں جو نصب الرایہ کا صحیح نسخہ موجود ہے اس میں بھی عمرؓ کی بجائے ابن عمرؓ مرقوم ہے۔ حضرت علی ﷺ سے رفع یدین کے ترک کی جو روایت مروی ہے وہ اس طرح ہے:

"عن عاصم عن کلیب عن ابیه ان علیاً کان یرفع یدیه فی اول تکبیره من الصلواة ثم لا یرفع۔"

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس کے صحیح الاسناد ہونے پر حافظ ابن حجرؒ، علامہ زیلعیؒ اور علامہ عینیؒ کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ بیہقی نے اس روایت کی صحت پر جو اعتراض کیا ہے اس کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ آپ نے جواہر النقی کی عبارت نقل کر کے اس اعتراض کو لغو ٹھہرایا ہے اور راویوں کو ثقہ ثابت کیا ہے۔ (۹۰)

ابن عمر ﷺ کا دوسرا اثر: یہ اثر ان الفاظ میں روایت کیا گیا ہے:

''مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر تکبیرات میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔'' (۹۱)

امام بخاریؒ نے مختلف طریقوں سے اس پر اعتراض کیا ہے، آپ نے استدلالی انداز سے ہر ایک اعتراض کا تسلی بخش جواب دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ساری بحثیں تکلفات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ اس کے اٹھانے کے لیے اس قدر کوشش کی جاتی لیکن فریق مخالف نے اپنے مسلک کی روایتوں کو جس انداز سے پیش کیا ہے اور دوسری روایتوں کی جس شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے اس سے خواہ مخواہ اختلافات پیدا ہو گئے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یہ تمام کاوش اور محنت دراصل باہمی نزاع کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''رفع یدین اور ترک رفع یدین دونوں ثابت اور جائز ہیں اور دونوں پر اسلاف کا عمل رہا ہے" وانا بقی الکلام فی الافضلیة" (۹۲)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ مدیر بینات کراچی نے اس نزاع کا فیصلہ ہی کر دیا ہے۔

کہتے ہیں:

''رفع یدین اور ترک رفع یدین دونوں سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ سنت صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے دور سے لے کر آج تک اس امت میں متواتر و متوارث چلی آتی ہے لیکن یہ ایسے امور ہیں جن کی بنا پر حنفیہ اور مالکیہ ترک رفع یدین کی سنت کے قائل ہیں اور ترک رفع یدین کو رفع یدین پر ترجیح دیتے ہیں۔''(۹۳)

<u>مسئلہ قرأت خلف الامام</u>: قرآن مجید میں ہے:

"واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون"(٩٤)

ترجمہ۔ جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان دھرو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں صحابہ کرام میں سے حضرت ابن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہم کے اور تابعین میں سے سعید بن جبیرؒ، عطا بن ابی رباح، عبدالرحمان بن زیدؒ، اسلمؒ، ابراہیم نخعی، شعبیؒ، حسن بصریؒ، ابن شہاب زہریؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کے ارشادات نقل کیے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"فی القرآة فی استفاض عن السلف لانها نزلت الصلواة و قال بعضهم فی الخطبة و ذكر احمد بن حنبل الاجماع على انها نزلت فی ذلك "

حافظ ابن تیمیہؒ امام احمدؒ کے حوالے سے اپنے فتاویٰ میں نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ لوگوں کا اجماع ہے اور سلف سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "واذا اقرا فانصتوا" (۹۵) بھی اس کا موید ہے۔ ابن قدامہ ''المغنی'' جلد اول صفحہ نمبر ۵۶۲ پر لکھتے ہیں

کہ ابوداؤد کی روایت ہے کہ امام احمدؒ نے کہا لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔

یہ آیت نماز باجماعت میں امام اور مقتدی دونوں کا الگ الگ وظیفہ مقرر کرتی ہے کہ امام کا وظیفہ قرأت ہے اور مقتدی کا وظیفہ امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ہے۔

ابن قدامہؒ نے اس کی تفصیل امام احمدؒ کے حوالے سے نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام جہری قرأت کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہ ہوگی جب کہ وہ خود قرأت نہ کرے۔ امام احمدؒ نے فرمایا: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہؓ اور تابعینؒ ہیں، یہ اہل حجاز ہیں، امام مالکؒ ہیں، یہ اہل عراق ہیں، امام ثوریؒ ہیں۔ یہ اہل شام ہیں امام اوزاعیؒ ہیں۔ یہ مصر میں امام لیثؒ ہیں۔ ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قرأت کرے مقتدی اور قرأت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔"

اس آیت میں تین مضامین کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اول: مقتدی کا کام قرأت کرنا نہیں بلکہ امام کی قرأت کو سننا اور خاموش رہنا ہے۔

دوم: قرأت مقتدی کے ذمہ نہیں بلکہ امام یہ فرض اس کی طرف سے ادا کرے گا۔

سوم: امام کی قرأت تنہا اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے اس لیے امام کی قرأت مقتدی ہی کی قرأت ہے۔

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ملخصاً جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولاالضالین فقولوا آمین۔ یحببکم اللہ فاذا کبر ورکع کبروا ورکعوا" (مشکوۃ) (۹۶)

ترجمہ: فرمایا ''جب تم نماز شروع کرو تو صفیں خوب اچھی طرح سیدھی کرلیا کرو، پھر تم میں سے ایک شخص امام بنے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام "غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین" کہے تو تم "امین" کہو، اللہ تمہاری دعا قبول کریں گے، پس جب وہ تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم تکبیر کہو اور رکوع کرو۔''

حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

" انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا و اذا قرء فانصتوا " ۔ (۹۷)

امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش ہو جاؤ۔

بعض روایات ایسی بھی ہیں جن سے قراۃ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً عبادہ بن صامت ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" لا صلوۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب" (متفق علیہ)

مسلم کی روایت میں ہے:

" لم یقراء بام القرآن فصاعداً "۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل ہے:

" من صلی صلوٰۃ لم یقراء فیھا بام القران فھی خداج "۔

عبادہ بن صامت ؓ کی ایک دوسری روایت جسے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے یہ ہے:

" لا تفعلوا الا بفاتحہ الکتاب فانہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بھا" ۔ (۹۸)

ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز خواہ جہری ہو یا سرّی، پڑھنے والا مقتدی ہو یا امام، منفرد ہو یا با جماعت پڑھ رہا ہو، سورت فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا ہر حال

میں ضروری ہوگا۔ ائمہ کی آراء اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ بعض نے فاتحہ خلف الامام کا سرے سے انکار کیا ہے بعض نے صرف جہری نمازوں میں جائز قرار دیا ہے، بعض سنت مؤکدہ قرار دیتے ہیں اور بعض صرف جہری نمازوں میں واجب کہتے ہیں۔(۹۹)

اس مسئلہ میں اصل اختلاف امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے درمیان ہے۔ امام شافعیؒ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب قرار دیتے ہیں، خواہ نماز پڑھنے والا مقتدی ہو یا امام، نماز سری ہو یا جہری لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام کے پیچھے کچھ جائز نہیں۔ مقتدی کو خاموش ہوکر قرآن سننا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت اذا قرء القرآن۔ الخ۔ سے واضح ہے۔ مولانا کشمیریؒ لکھتے ہیں:

''قرأت امام از جانب همه قوم محسوب است بلكه انصاف قوم امارت است که امام را وكيل ساخته اندو اگر در قرأت خود بخود مشغول بودندے ہر گز صورت توكيل متبادر نبودے بل 'هر یکے علی حیاله مستقل شہرده شدی و ازینجا متفهم گردید'' (۱۰۰)

خلاصہ یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کی اقتداء اور متابعت کا حکم دیا ہے اور اس متابعت اور اجتماعیت کی غرض سے نماز باجماعت شروع کی گئی ہے اور قرأت کے موقع پر امام کی متابعت یہی ہے کہ مقتدی امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہو اور خاموش رہے، امام کے مقابلہ میں خود اپنی قرأت شروع کردینا متابعت نہیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ: '' واذا قرأفانصتوا''۔

اس حدیث میں بھی امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت کہا گیا ہے۔ فرمایا:

'' من كان له امام فقرأة الامام قرأة له ''۔(۱۰۱)

یہ حدیث متعدد طریق سے روایت کی گئی ہے۔ بعض نے اس کو حضرت عبداللہ بن شداد سے مرسلاً روایت کیا ہے اور بعض نے سند متصل کے ساتھ۔ حافظ ابن حجر کی اس حدیث کے متعلق تصحیح کی ہے۔ مولانا انورشاہ کشمیریؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کے بقول:

''جمیع طرق این حدیث ضعیف اند ''۔(۱۰۲)

حافظ صاحبؒ کی تردید میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں:

''وبعضی و گراں هم نوشته اند محفرض بیدلیل است که هرگز اتباع رانشاید بلکه اتباع وافعه از همه اولی ترست وچوں مدار صحت بر ثقه روایت است لیس حدیث مدئرد لا محاله صحیح وثابت است۔''(۱۰۳)۔

شیخ ابن تیمیہؒ اپنے فتاوی جلد نمبر ۲۳ صفحہ ۲۷۱ پر لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:

''یہ ثابت ہوا کہ اس حالت میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے جیسا کہ جماہیر سلف وخلف صحابہ وتابعین اس کے قائل ہیں اور اس باب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معروف حدیث وارد ہے آپؐ نے فرمایا جس کے لیے امام ہوتو اس کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کی اقتداء میں قرأت کی جائے تو فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرأت کافی ہے اور جب تنہا پڑھے تو قرأت کرے۔ نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔(۱۰۴)

مولانا انور شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں:

''رین حدیث نیک تامل کنی که بنگری که مر مجرد قرأت امام سزا ست''(۱۰۵)پس ازیں تحقیق واضح گردید که این ایت'' واذاقرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا '' بحق صلواة از سری و جهری مطلق است''(۱۰۶)

الغرض متعدد شواہد کی روشنی میں حدیث ''من کان له امام فقرأة الامام قرأة له۔''

بلاشبہ صحیح اور حجت ہے قرآن کریم، احادیث نبویہ اور فتاویٰ صحابہ مؤید ہیں۔ احمد بن حنبلؒ نے خود اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس لئے حنفیہ اور جمہور ائمہ، امام کی قرأت

کومقتدی کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور بحکم قرآن وحدیث امام کی قرأت کے وقت مقتدی کے خاموش رہنے کوواجب جانتے ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے نہ صرف فاتحہ خلف الامام پر کراہیت فرمائی بلکہ آپ نے منع بھی فرمادیا۔ میرا خیال ہے کہ امام شافعیؒ بھی صرف جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے قائل ہیں لیکن اس میں وہ وجوب کے قائل نہیں کیونکہ کتاب الام میں ان کا یہ قول موجود نہیں ہے۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ احناف کی نماز جس میں استماع پایا جاتا ہے وہ شوافع کی نماز سے افضل ہے کیونکہ قرآن سننے والے کے لیے دو اجر ہیں اور تلاوت کرنے والا صرف ایک اجر کا مستحق ہے جیسا کہ صاحب کنز کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

"من استمع الی آیة من کتاب الله کتب له حسنة مضاعفة ومن تلا آیة من کتاب الله کانت له نوراً یوم القیامة"۔ (۱۰۷)

مختصر یہ کہ مقتدی کے ذمہ قرأت واجب نہیں کی گئی بلکہ امام کی قرأت کو اس کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے اور مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس کی قرأت سے امام کی قرأت میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے، یہ اندیشہ سری اور جہری دونوں نمازوں میں یکساں ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ قرأت خلف الامام کے مطلقاً قائل نہیں۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کا عام معمول یہی تھا۔ آنحضور ﷺ زمانہ میں بھی اور بعد بھی۔

تمثیلات

حقیقت عید: عید خوشی اور مسرت کا نام ہے اور اہل دنیا کے نزدیک ہر قسم کا سرور وانبساط اور ہر طرح کی فرحت وابتہاج عید کے مترادف ہیں۔ (۱۰۸)

شریعت کی نظر میں عید: شریعت مقدسہ اور ملت بیضاء کی نظر میں عید اس مسرت وخوشی کو کہتے ہیں جو نعمائے ربانی اور کرمہائے الٰہی کے شکر اور اس کے فضل وجود پر ادائے نیاز کے لیے کی جاتی ہے۔ (۱۰۹)

عیدالٰہی: حقیقت عید پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حقیقت بین نظریں اور پر از معرفت نگاہیں اس حکمت ربانی سے بے خبر نہیں ہیں کہ عالم تشریعی کی اساس کہ جس کو عالم اوامر ونواہی کہنا بہتر ہے. بہت کچھ عالم تکوینی کے مظہر وشواہد پر قائم کی گئی ہے۔تاکہ عالم تکلیف میں اعمال وافعال کے لیے نظائر وامثال قائم ہوسکیں اور جن وانسان کو مرضیات الٰہی اور غیر مرضیات پر کار بند ہونے میں آسانی ہوسکے۔اس اصل اوراساس کے زیر عنوان عید بھی ہے۔(۱۱۰)

عالم تکوینی کی ابتداء اور اس کے منصۂ شہود میں آنے کے متعلق قرآن عزیز نے جو رہنمائی کی ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے قدوس نے عالم انسانی کو درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور تاریخ کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت وتعلیم دینے کے لیے ہمارے فہم کے مطابق اس طرح فرمایا کہ ہم نے ارض وسماوات اور کائنات عالم کو چھ روز میں پیدا کیا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہفتہ کی نوعیت اور اس کی روز شماری بھی تکوینی عالم سے اخذ کی گئی۔چند روز عالم کی تخلیق میں صرف کرنے کے بعد اس کی سالگرہ منانے اور خوشی کا اظہار کرنے کے لیے رب العزت نے ساتواں روز عید اور تعطیل کا مقرر فرمایا۔اور ان کو اعجازی کلمات میں ارشات فرمایا''ثم استوٰی علی العرش ''۔(۱۱۱)

آدم علیہ السلام کی پیدائش اور بعض محققین کا تردد: مولانا انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں:

> ''تخلیق عالم اور عید الٰہی کے بارے میں بعض محققین سخت تردد میں پڑ گئے ہیں۔جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن عزیز نے تخلیق ارض وسماوات کی مدت چھ روز قرار دی ہے اور صحاح ستہ کی بعض روایات میں ہے کہ خدائے قدوس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے روز پیدا کیا۔اگر تخلیق عالم کی ابتداء ہفتہ کے روز سے مانی جائے تو پھر پورا ہفتہ تخلیق ہی میں محیط ہے اور تعطیل واستواء علی العرش کے لیے کوئی دن باقی نہیں رہتا۔لہٰذا کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن مان کر چھ روز کو صحیح باقی رکھا جائے اور استواء کے لیے ایک روز فاضل نکالا جاسکے۔اس اشکال کے پیدا ہو جانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان محدثین ومحققین نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق

کی حدیث میں جو جمعہ کا دن ہے۔ اس کو اپنے خیال میں اس سلسلہ میں منسلک سمجھ لیا ہے جس میں تخلیق ارض وسماوات ہوئی ہے حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق اگرچہ جمعہ کے روز ہی ہوئی ہے لیکن یہ جمعہ وہ جمعہ نہیں ہے جو چھ روز کے تذکرہ کے بعد آتا ہے بلکہ عرصہ مدیدہ کے بعد حق جل جلالہ نے کسی ایک جمعہ میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور تخلیق ارض وسماوات کے متعلق جو جمعہ آیا تھا وہی درحقیقت استواء علی العرش اور عید الٰہی کا روز ہے۔ (۱۱۲)

یوم السبت کی تحقیق: تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم السبت ہفتہ کا نام ہے اور نصاریٰ کے عقیدہ میں یوم السبت اتوار ہے۔ عبرانی زبان میں "سبت" کے معنی تعطیل کے ہیں۔ اس لیے علماء کو اس کی تعیین میں مشکلات پیش آئی ہیں۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق تو تعطیل کا دن جمعہ ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ جیسے محدث ومحقق بھی اس مسئلہ میں متردّد ہیں۔ اور وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ یوم السبت ہفتہ کے ہی دن کا نام ہے۔ اس اشکال کو اس سے اور بھی زیادہ تقویت ہو جاتی ہے کہ خود عربی زبان میں یوم السبت ہفتہ ہی کے روز کو کہتے ہیں۔ علامہ کشمیریؒ ان اشکالات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل عرب کے ہاں دور جاہلیت میں دنوں کے نام یہ نہ تھے جو اب ان کے ہاں مستعمل ہیں۔ کتب تاریخ میں ان کا ذکر موجود ہے۔ موجودہ نام دراصل یہود کے ایجاد کردہ ہیں اور وہی ان کے واضع ہیں۔ کتب تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب جمعہ کو عروبہ کہتے تھے۔ عروبہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم وہی ہے جو ہماری زبان میں عرفہ کا ہے۔ اردو زبان میں عرفہ ہر اسلامی تہوار سے ایک روز قبل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ مفہوم یہود عروبہ کا لیتے تھے۔ وہ ہفتہ کے دن کو یوم تعطیل مانتے تھے اسی لیے جمعہ کو عروبہ کہا کرتے تھے۔ احادیث میں یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ جب ہفتہ کے موجودہ نام یہود سے لیے گئے ہیں تو لازمی تھا کہ وہ سبت ہفتہ کے دن کو مانیں اور اتوار کو اسی لیے انھوں نے یوم الاحد مانا، اسی وجہ سے علمائے اسلام نے سنیچر کو ہی یوم السبت قرار دیا اور جمعہ کی فضیلت کو صرف عہد اسلامی سے شروع سمجھا لیکن ہمارے نزدیک

یہ قول صحیح نہیں ہے اور خلاف تحقیق ہے۔ امام شافعیؒ کی روایت کے مطابق عید الٰہی جمعہ کے روز ہوئی۔ اب ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ جب تعطیل کا دن جمعہ تھا اور تخلیق کا آغاز سنیچر یعنی ہفتہ کو ہوا تو یقیناً یوم السبت جمعہ ہی کا نام ہے۔ اتوار یا ہفتہ کو سبت کہنا کسی طرح درست نہیں ہے۔'' (۱۱۳)

ایام ربّانی کی تجدید: قرآن مجید میں ستہ ایام کا ذکر ہے۔ آیا ان ایام کی مقدار ایام معمولہ ہی کے مطابق ہے یا اس سے زائد۔ یہ ایک سوال ہے جس کے متعلق محدثین وصوفیائے کرام دونوں نے قلم اٹھائے ہیں اور خوب بحثیں کی ہیں۔ اہل عقل ودانش کے نزدیک یہ چیز حیرت انگیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ درگاہ صمدیت زمانہ اور اس کی مقدار سے وراء الوراء ہے۔ اس جگہ زمانہ کا تخیل بھی نہیں ہے۔ زمانہ تو حرکت کا نام ہے اور حرکت وسکون کی نسبت اجرام واجسام کی طرف ہوتی ہے لیکن خالق حرکت وسکون کو ان فانی چیزوں سے کیا سروکار؟ قرآن مجید میں جو ایام کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ صرف ہماری عقول ناقصہ اور اذہان کاسدہ کی تفہیم کے لیے ہے۔ بعض محققین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ایام ایام معمولہ ہی کی طرح ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ان ایام میں ہر دن ایک ہزار سال کی مقدار رکھتا ہے۔

کائنات انسانی کی عمر: بعض علماء وصوفیاء کا خیال ہے کہ دنیائے انسانی کی عمر سات ہزار سال ہے کیونکہ سات ہی روز اس کی تخلیق اور اس پر عمل کے گزرے ہیں۔ اور اولوالعزم پیغمبران وانبیاء کے ادیان ترقی پذیر کا عہد مبارک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ساتویں ہزار کی ابتداء میں خاتم الانبیاء ﷺ مبعوث ہوئے اور ان کے مذہب میں اعلیٰ اور بے نظیر ترقی بھی ایک ہزار سال رہی اور اس کے بعد انحطاط شروع ہوگیا جس کی انتہاء وجود قیامت پر ہوگی۔ اور یہ سب کرشمے ایام ربوبیت ہی کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود ونصاریٰ اب تک اس کے منتظر ہیں کہ نبی آخر الزمانؐ ساتویں ہزار سال میں آئے گا اور اس پر ایمان لائیں گے لیکن بائبل کے تمام نسخوں کے بارے میں انھیں اختلاف ہے اس لیے صحیح حساب کی تشخیص نہ کر سکے۔ اور نبی آخر الزمانؐ پر ایمان نہ لائے۔ (۱۱۴)

بنی اسرائیل کی عید یوم عاشورہ: ایک ہفتہ کی عید کے علاوہ ادیان سماویہ میں سالانہ عید

منانے کا بھی دستور قدیم زمانے سے قائم ہے، ہر عید کسی خاص حکمت پر مبنی ہے اور کسی نہ کسی رحمت و فضل الٰہی کے ادائے تشکر میں اس کا راز مضمر ہے۔ اور ہمیشہ اس کا وجود بندگان خدا کے لیے سعادت دارین کا وسیلہ بنتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کا آج تک اعلان کر رہے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ صدیوں تک قبطیوں کے ہاتھوں مظلوم بنی اسرائیلی طوق و سلاسل اور غلامی میں گرفتار رہے اور فراعنۂ مصر کی تمام ذلتوں اور رسوائیوں کو جبراً و قہراً برداشت کیا لیکن ظلم و عدوان اور غرور و نخوت کا مظاہرہ ہمیشہ قائم نہیں رہتا اور انانیت و کبر ہمیشہ باقی نہ رہ سکے۔ بنی اسرائیل کے لیے بھی قدرت نے وہ وقت مہیا کر دیا کہ جس میں ان کی خواریوں اور ذلتوں کا خاتمہ ہوا۔ غلامی کی لعنت سے ان کو ہمیشہ کے لیے نجات ملی اور بحر قلزم کی موجوں نے اس ہیبت ناک مظاہرہ کا منٹوں میں اس طرح خاتمہ کر دیا کہ عبد صالح حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنی قوم کے تشرین اولیٰ میں قلزم سے پار ہو گئے اور خدائی کا جھوٹا مدعی فرعون اپنی فرعونیت کے لشکر سمیت قلزم کی تہہ میں فنا ہو گیا۔ انعام خداوندی کا یہی کرشمہ تھا جو بنی اسرائیل پر اس طرح جلوہ نما ہوا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں:

> ''یہی یوم عاشورہ کی عید ان کے مذہبی رسوم میں داخل ہو گئی تا کہ اس دن روزہ رکھ کر بنی اسرائیل نیاز مندی کے ساتھ اداء شکر کا اظہار کریں۔'' (۱۱۵)

یوم عاشورا کی تحقیق

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تشرین اولیٰ یہود کے مقرر کردہ مہینوں میں سال کا پہلا مہینہ ہے جو شمسی نظام پر قائم کیے گئے ہیں۔ اس کا تطابق ماہ محرم الحرام سے جو قمری سال کا پہلا مہینہ ہے کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ پھر ہمارے ہاں دس محرم الحرام کو عاشورہ کا ہونا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ دوسرا امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ طبری کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس روز ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو اس دن یہود عاشورہ کی عید منا رہے تھے اور روزہ دار تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ''ہم یہود سے زیادہ مستحق ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی رستگاری پر خوشی کریں اور شکر الٰہی بجا لائیں۔ تم میں سے جس شخص نے ابھی کھایا پیا نہ ہو وہ روزہ رکھ لے اور جو کھا پی چکے ہیں وہ اس وقت سے روزہ داروں کی طرح کھانے

پینے سے باز رہیں''۔ حالانکہ یہ امر محقق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مدینہ طیبہ میں داخلہ آٹھ ربیع الاول مطابق ۲۰/ ستمبر ۶۶۲ عیسوی کو ہوا تھا۔ (۱۱۶) تو پھر کس طرح یوم عاشورہ دس محرم الحرام کو صحیح ہو سکتا ہے؟ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس تاریخی گتھی کو اس طرح سلجھاتے ہیں:

''تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی مدینہ میں دو قسم کی جماعتیں تھیں، ایک جماعت اپنے مہینوں کا حساب نظام شمسی ہی کے ماتحت رکھتی تھی اور عاشورہ کو اسی اصول پر مناتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ربیع الاول میں جو عاشورہ کی تاریخیں اس مرتبہ آ کر پڑیں وہ اس نظام کے تحت تھیں۔ دوسری جماعت وہ تھی جس نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان قمری حساب سے اپنا نظام قائم کرتے ہیں اور محرم الحرام کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیتے ہیں اس لیے وہ مسلمانوں سے توافق پیدا کرنے کے لیے اپنی عید عاشورہ کو تشرین اوّل سے منتقل کر کے محرم کی دس تاریخ میں لے آئے۔ پھر یہی طریقہ جاری ہو گیا۔ تیسری جماعت یہود کی اور بھی تھی جو اپنے نظام پر عاشورہ مناتی تھی اور محرم کی تاریخ میں بھی عید عاشورہ قائم کرتی تھی۔'' (۱۱۷)

عید رمضان

جس طرح بنی اسرائیل کے لیے عاشورہ کی عید مقرر ہوئی اسی طرح امت مرحومہ کے لیے بھی سال میں دو مرتبہ رحمت خداوندی کے اداء نیاز کی خاطر عید منانے کا حکم دیا گیا۔ جس میں سے ایک عید الفطر یا عید رمضان ہے یہ امر واضح ہے کہ رمضان کی فضیلت کا تمام دارو مدار اور اس کی تمام تر اساس قرآن وحدیث پر مبنی ہے۔

رمضان میں قرآن عزیز کا لوح محفوظ سے بیت العزت میں نازل ہونا ہی وہ فضل و رحمت الٰہی ہے جس کی وجہ سے رمضان کو یہ شرف عطا ہوا۔ وہ قانون الٰہی جس نے تمام عالم کی ظلمت و تاریکی کو فنا کر کے ہدایت و رشد کی روشنی سے منور کر دیا، وہ کتاب ربانی جس کے فیض سے بھٹکے ہوؤں کو راہ ملی اور وہ قرآن عزیز جو حق و باطل کے لیے فیصلہ کن اور احکامات الٰہیہ کا آخری پیغام ہے رمضان میں نازل ہوا اور اس کی برکت سے تمام عالم پر فضل خدا

وندی اور رحمت باری ہوگئی۔

روزہ کی فضیلت اس لیے ہوئی کہ انسان روحانی فیض سے مستفیض ہو کر قرآن عزیز کی دائمی برکتوں سے مالا مال ہو سکے لہٰذا نعمت و فضل کے ادائے شکر میں ختم مہینہ کے بعد اسلام نے ایک دن خاص دعوت الٰہی کا مقرر کیا اور اس میں سب کو خداوند تعالیٰ کا مہمان خصوصی بنایا اور اس کا نام عید رکھا گیا۔

اتمام قرآن عزیز

خدا کا آخری پیغام اور روحانیت کی یہ بے نظیر ہدایت جس کی بدولت ہمیں دارین کی سعادت نصیب ہوئی، تئیس (۲۳) سال تک برابر نازل ہوتا رہا، آخر وہ مبارک روز آ گیا جس میں اس چشمۂ خیر کثیر کے اتمام و اکمال کی بشارت ہم کو دی گئی اور ۹/ ذی الحجہ یوم عرفہ میں "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی" کا فرحت انگیز پیغام عرفات کے میدان میں سنایا گیا اور قیامت تک کے لیے اس قانون کو مکمل کر کے ہمارے سپرد کر دیا گیا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں علماء یہود میں سے کسی نے اس آیت کو سن کر کہا اگر ہمارے ہاں یہ آیت نازل ہوتی تو ہم اس کو روز عید شمار کرتے۔ یہ سن کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس روز ہمارے ہاں دوہری عید تھی اس لیے کہ یہ آیت جمعہ کے روز عرفات میں نازل ہوئی اور جمعہ و عرفہ ہماری عیدیں ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اسلام میں عید کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> "بہر حال عید کی حقیقت ایک مسلمان کی نظر میں صرف یہ ہے کہ وہ اس روز خدا کے خالص فضل و انعام کے تشکر و امتنان میں مخمور ہو کر دربار خداوندی میں مسرت و شادمانی کے ساتھ سر نیاز جھکاتا ہے۔" (۱۱۸)

عید الفطر، عید الاضحیٰ، جمعہ، عرفہ یہ سب مسلمانوں کی عیدیں ہیں اور ان سب کا خلاصہ وہی ایک حقیقت ہے جو شاہ صاحب بیان کر چکے ہیں۔ یہی فرق ہے اسلام اور دیگر ادیان میں کہ اس کی غمی و خوشی، رنج و سرور، حزن و مسرت سب خدائے قدوس ہی کے لیے ہے۔

اس کی تمام عیدیں ہزلیات اور خرافات سے پاک اور بری ہیں اور ان کا ہر ہر جز صرف خدائے قدوس ہی کی یاد سے مملو ہے۔

استفتاء

ا۔کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے مسلمانان ہند کو قوم ہنود کے ساتھ معاہدہ صلح اور دشمن قوی کے مقابلہ میں اس سے استعانت اور شرکت عمل کرنا جائز ہے۔؟

یہ استفتاء ۱۳۴۰ھ میں شائع ہوا۔ اس کا جواب مولانا محمد حسینؒ مدرس دارالعلوم ضیاء شمس الاسلام سیال شریف ضلع سرگودھا نے لکھا تھا۔ جو تقریباً پندرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس فتویٰ پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے علاوہ اور بھی بہت سی جلیل القدر اور جید علماء وقت کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ امر بالمعروف کے نام سے معتمدین مجلس خلافت سرگودھا (دسمبر ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق شاہ پور کے بجائے سرگودھا کو ضلع بنایا گیا)۔ ضلع شاہ پور نے شائع کیا تھا۔

۲۔کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں کہ آج کل اسمبلی (جمعیۃ مقننہ ہند) میں دو مسودات قانون پیش ہوئے ہیں جن کا منشا یہ ہے :

(الف) کوئی معمر آدمی نوجوان اور کم سن عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرے گا تو تعزیرات ہند کی رو سے سزا کا مستحق ہوگا۔

(ب) نیز بلا تخصیص مذہب ہر مسلم مشرکہ اور مشرک مسلمہ سے نکاح کر سکتا ہے۔

کیا کم سن نوجوان عورت سے معمر مسلمان کا نکاح ممنوع ہے اور مسلم مرد یا عورت کا مشرک مرد یا عورت سے نکاح کرنا شریعت میں پایا جاتا ہے۔؟ بیّنوا۔

یہ استفتاء مولانا خلیل احمد فاضل دینیات نے ہفتہ وار مہاجر دیو بند میں ۷/ستمبر ۱۹۲۸ء کو شائع کروایا تھا۔ اس کا جواب مفتی مولانا عزیز الرحمانؒ دارالعلوم دیو بند نے لکھ کر شائع کروایا۔ اس فتوی پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بھی دستخط ہیں اور مولانا کشمیریؒ نے ''الجواب صواب'' لکھ کر فتوی کی توثیق کی ہے اور دستخط کئے ہیں۔

فقہی مسائل اور علامہ کشمیریؒ

آپ نے فرمایا کہ:

۱- میرے نزدیک ہندوؤں کی پکائی ہوئی چیزیں مکروہ ہیں اس لیے کہ گمان غالب نجاست کا ہے جیسا کہ گندی مرغی کے بارے میں مسئلہ ہے۔(۱۱۹)

۲- اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ کے وقت انگوٹھے چومنا بے اصل ہے سوائے ایک اثر کے جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملا علی قاریؒ نے موضوعات میں ذکر کیا ہے لیکن وہ منکر وضعیف ہے۔(۱۲۰)

۳- میلاد کا قیام بدعت ہے۔ تاریخ ابن خلکان میں ہے کہ ملک اربل نے اسے رائج کیا۔ ابن دحیہ نے میلاد پر کتاب لکھی تھی۔ سید یحییٰ اور ابن حجرؒ "قوموا لسید کم ----- سعد بن معاذ" پر قیاس کر کے اجازت دیتے ہیں، مگر یہ قیاس مع الفارق ہے اور قیاس المحقق علی الموھوم ہے۔(۱۲۱)

۴- حدیث میں زراعت اور کھیتی باڑی کی مذمت اس لیے آئی ہے کہ لوگ جہاد سے غافل نہ ہو جائیں۔ اس لیے امام صاحبؒ نے مکروہ کہا ہے۔(۱۲۲)

۵- استحسان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ قیاس خفی ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ جو بھی قیاس جلی کے مخالف ہو خواہ خفی ہو یا اور کچھ وہ استحسان ہے۔(۱۲۳)

۶- الحرب خدعۃ۔(۱۲۴) کا مطلب ہے کہ اس کا انجام مشتبہ ہے یا خفیہ تدابیر اختیار کرنے کا نام ہے۔ مگر قول کا پاس لحاظ جنگ وصلح کی ہر حالت میں ضروری ہے لہٰذا خداع لسانی جائز نہیں۔ جھوٹ، نقض عہد اور بات سے پھرنا جنگ میں بھی حرام ہیں۔(۱۲۵)

۷- متعہ اسلام میں کبھی نہ تھا بلکہ نکاح مہر قلیل کے ساتھ تھا جس میں نباہنے کا ارادہ نہ ہوتا تھا۔(۱۲۶)

۸- اولی الامر میں میرے نزدیک علماء بھی ہیں۔ طحاویؒ مشکل الآثار میں کہتے ہیں "ھم الوالخیر و العلم" پھر جابر عطاءؒ سے ناقل ہیں کہ وہ" اھل الفقہ و الدین" ہیں۔ (۱۲۷)

۹- فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ جب یقین ہو جائے کہ امر و نہی بیکار ہیں تو گوشہ گیری جائز ہے مگر عزیمت کی راہ دوسری ہے۔

۱۰- قضاء علی الغائب ہمارے ہاں جائز نہیں، مگر جب غائب کی نیت نقصان پہنچانے کی ہو۔ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ قاضی غائب کی طرف سے وکیل مقرر کرے گا۔

۱۱- حافظ سید محمد نعمانؒ تلمیذ مولانا کشمیریؒ نے بتایا کہ:

''مولانا انور شاہ صاحبؒ آخری قعدہ میں دعا نہیں پڑھتے تھے۔ یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔'' ؎ (۱۲۸)

؎ یہ حافظ محمد نعمان کا گمان ہو سکتا ہے قعدہ کے وقت پاس بیٹھا ہونا تو ناممکن ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ بعض دفعہ ایسا فرمایا ہو لیکن دواماً ایسا نہیں تھا کیونکہ یہ تو سنت طریقہ کے خلاف ہے۔

حوالہ جات

۱	آب کوثر	ص ۱۲۶
۲	چچ نامہ	ص۲۱۲
۳	تاریخ سندھ	ج۱، ص۹۳
۴	چچ نامہ	ص۲۲۸
۵	آب کوثر	ص۱۲۷
۶	چچ نامہ	ص۱۳۶، ۱۳۷
۷	نزھۃ الخواطر	ج۱، ص۲۳
۸	ایضاً	ص۴۴
۹	ایضاً	ص۴۵
۱۰	ایضاً	ص۲۱
۱۱	ایضاً	ص۳۲
۱۲	برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ	ص۲۲
۱۳	ایضاً	
۱۴	ایضاً	
۱۵	ایضاً	
۱۶	ایضاً	
۱۷	ایضاً	
۱۸	ایضاً	
۱۹	ایضاً	

۲۰	ایضاً	
۲۱	ایضاً	ص۲۳
۲۲	ایضاً	ص۲۳
۲۳	برصغیر پاک و ہند میں فقہ	ص۲۳
۲۴	ایضاً	
۲۵	ایضاً	
۲۶	ایضاً	
۲۷	ایضاً	
۲۸	ایضاً	
۲۹	ایضاً	
۳۰	ایضاً	
۳۱	ایضاً	ص۲۴
۳۲	ایضاً	
۳۳	ایضاً	
۳۴	تذکرہ الحفاظ	ج۱،ص۱۷۸
۳۵	آب کوثر	ص۱۲۸
۳۶	آب کوثر	ص۱۲۹
۳۷	اخبار الاخیار	ص۲۸
۳۸	آب کوثر	ص۱۲۹
۳۹	ایضاً	ص۱۳۱
۴۰	ایضاً	ص ۱۳۶
۴۱	مسلم ثقافت ہندوستان میں	ص۱۹۵
۴۲	ایضاً	ص۲۶۹
۴۳	ملخصاً مسلم ثقافت ہندوستان میں	ص۲۲۹

۴۴	مسلم ثقافت ہندوستان میں	ص ۲۲۹
۴۵	علماء ہند کا شاندار ماضی	ج ۱، ص ۵۵۶
۴۶	رود کوثر	ص ۴۷۶
۴۷	الرشید فروری مارچ ۱۹۷۶ء	ص ۱۰۵
۴۸	الرشید ساہیوال	ص ۱۱۳
۴۹	ایضاً	
۵۰	ایضاً	
۵۱	ایضاً	
۵۲	نطق انور	ص ۱۷
۵۳	ایضاً	ص ۱۸
۵۴	نقش دوام	ص ۴۴۲
۵۵	ایضاً	
۵۶	ایضاً	
۵۷	نقش دوام	ص ۴۴۲
۵۸	الرشید ساہیوال	ص ۲۳۹
۵۹	صحیح بخاری	ج ۳، ص ۳۱۵
۶۰	نفحۃ العنبر	ص ۷۵
۶۱	مشکوٰۃ	ج ۱، ص ۶۹
۶۲	قدوری	ص ۳۲
۶۳	مشکوٰۃ	ج ۱، ص ۷۰
۶۴	فتح الباری، باب رفع الیدین	ص ۱۸۲
۶۵	ایضاً	ص ۱۸۳
۶۶	ایضاً	
۶۷	مؤطا امام محمد	ص ۹۰، ۹۳

۶۸	ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ	ص۲۶۱
۶۹	حجۃ اللہ البالغہ	ص۲۶۱
۷۰	صلاۃ القاری	ج۳،ص۳۱۸
۷۱	دارالعلوم دیوبند اگست ۱۹۶۷ء	
۷۲	نیل الفرقدین	ص۱۸
۷۳	ایضاً	ص۲۰
۷۴	ایضاً	
۷۵	ایضاً	
۷۶	ایضاً	
۷۷	ایضاً	
۷۸	نیل الفرقدین	ص۲۰
۷۹	ایضاً	
۸۰	ایضاً	ص۲۲
۸۱	ایضاً	
۸۲	نیل الفرقدین	ص۲۲
۸۳	مشکواۃ	ج۱،ص۶۹
۸۴	مشکوٰۃ	ج۱،ص۷۰
۸۵	نیل الفرقدین	ص۶۰
۸۶	مشکوٰۃ	ج۱،ص۷۰
۸۷	نیل الفرقدین	ص۶۰
۸۸	ایضاً	
۸۹	طحاوی	ج۱،ص۱۳۲
۹۰	ماخوذ انیل الفرقدین	ص۲۲
۹۱	ایضاً	

۹۲	نیل الفرقدین	ص ۲۲
۹۳	بینات رجب/شعبان ۱۴۰۲ھ کراچی	ص ۱۱۲
۹۴	القرآن	ص ۲۰۴
۹۵	مشکواۃ	ج ۱، ص ۴۷
۹۶	مشکوٰۃ	ج ۱، ص ۲۷
۹۷	فصل الخطاب فی مسئلہ ام اکتاب	ص ۴۳
۹۸	ایضاً	
۹۹	فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب	ص ۴۳
۱۰۰	خاتمہ الکتاب فی مسئلہ فاتحہ الکتاب	ص ۴۴، ۴۳
۱۰۱	حاشیہ مشکواۃ	ج ۱، ص ۴۷
۱۰۲	خاتمہ الکتاب	ص ۹
۱۰۳	ایضاً	
۱۰۴	بینات کراچی رجب رشعبان ۱۴۰۲ھ	
۱۰۵	خاتمہ الکتاب	ص ۱۵
۱۰۶	ایضاً	ص ۱۶
۱۰۷	کنز الدقائق	ج ۱، ص ۱۳
۱۰۸	ہفتہ وار مہاجر قسط اول دیوبند ۲۹ ر مارچ ۱۹۲۸ء	
۱۰۹	الحق اکوڑہ خٹک مارچ ۱۹۶۶ء	ص [illegible]۴
۱۱۰	ہفت روزہ استقلال دیوبند، ۲۷ ر رمضان ۱۳۵۵ھ، مارچ ۱۹۶۶ء	
۱۱۱	انوار انوری	ص ۱۲۶
۱۱۲	مہاجر	
۱۱۳	روزنامہ سیاست عید نمبر ۲۳/ مارچ ۱۹۲۸ء	
۱۱۴	سیاست عید نمبر، ۲۳ ر مارچ ۱۹۲۸ء	
۱۱۵	انوار انوری	ص ۶۳

۱۱۶ انوار انوری ص ۶۳

۱۱۷ الحق ص ۴۸

۱۱۸ روزنامہ سیاست لاہور، عید نمبر

۱۱۹ فیض الباری ج ۱، ص ۲۷۶

۱۲۰ ایضاً

۱۲۱ فیض الباری ج ۲، ص ۳۱۹

۱۲۲ دار العلوم دیوبند، اگست ۱۹۶۷ء

۱۲۳ ایضاً

۱۲۴ صحیح مسلم ج ۵، ص ۱۴۳

۱۲۵ دار العلوم دیوبند اگست ۱۹۶۷ء

۱۲۶ دار العلوم دیوبند، اگست ۱۹۶۷ء

۱۲۷ ایضاً

۱۲۸ انٹرویو از حافظ نعمان

باب: ٦

علامہ کشمیریؒ کی فلسفہ وکلام کے میدان میں کدوکاوش

فلسفہ وکلام کی ابتداء

مولانا انور شاہ کشمیریؒ علوم عقلیہ یعنی فلسفہ اور منطق وغیرہ میں بھی گہری بصیرت رکھتے تھے اور بعض فلسفیانہ مسائل کی بھی انھوں نے عقدہ کشائی کی ہے۔ اس باب میں پہلے ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ فلسفہ وکلام کا آغاز کیسے ہوا؟ برصغیر میں اس علم نے دوسرے علوم کے دوش بدوش کس طرح عروج حاصل کیا؟ اور اس میں مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے اپنے تحقیقات سے کیا کیا اضافے کئے ہیں؟

اسلام کی توسیع اور اس کے عروج کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ بھی عربی میں منتقل ہوتا گیا۔ اس ادق کام کو عربی میں منتقل کرنے کا سہرا حسین بن اسحاق کے سر رہا، بوعلی سینا نے بھی فلسفہ پر خاطر خواہ طبع آزمائی کی۔ لیکن جو کچھ کیا وہ فلسفہ اسلامی و یونانی میں مطابقت پیدا کرنے اور دونوں کو ایک مرکزی نقطہ پر جمع کرنے کی ناکام کوشش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ (۱)

علم کلام کے قابل ذکر علم بردار ابوالحسن اشعریؒ ہیں لیکن ان کے ہم عصر ماتریدی سمرقندی اور طحاوی مصری بھی ہیں۔ ان میں سے طحاوی تو طاقِ نسیاں ہو گئے۔ عرصہ تک اشعریہ اور ماتریدیہ کلام میں اہل سنت کے دو مخالف مذہب رہے ہیں۔ ماتریدی نظام اب بھی کسی حد تک ترکی مسلمانوں میں رائج ہے لیکن اشعری کا نظام سب سے زیادہ مقبول عام ہے۔ (۲)

امام اشعریؒ: امام ابوالحسن (م۔۳۲۴ھ) اشعری شروع شروع میں معتزلی تھے لیکن ۳۰۰ھ میں انھوں نے اس جماعت کے خیالات سے تائب ہونے کا اعلان کیا اور پکے سنی ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اشعری تحریک کو امام غزالی اور قاضی ابوبکر محمد بن باقلانی جیسے سرگرم پیرو کار مل گئے جنھوں نے اس مسلک کی خوب اشاعت کی۔ (۳)

امام غزالیؒ: اشعری الٰہیات کی آخری کامرانی امام غزالی کی مرہون منت ہے انھوں نے اپنا وقت مطالعہ اور عبادت میں صرف کیا اور معتدل اشعری نظام کی تعلیم کے قائد بن گئے۔ جس پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ امام غزالیؒ نے فلسفۂ یونان پر سخت تنقید کی، عام مسلمانوں کو اس

کے اثرات بد سے آگاہ کیا اور اس فلسفہ کو ممنوع قرار دے دیا کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ارسطو کافر تھا اور ایسے دلائل استعمال کرتا تھا جنھیں اسے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ارسطو کے مطالعہ میں ناگزیر مشکلات تھیں اس کے اور اس کے عربی شارحین کے یہاں شدید غلطیاں پائی جاتی تھیں اس لیے لوگوں کی فلسفہ پڑھنے میں ہمت افزائی نہ کرنا چاہیے۔ (۴)

برصغیر پاک و ہند: برصغیر میں دیگر علوم کی طرح فلسفہ و کلام نے بھی خوب ترقی کی اور یہاں بھی بہت سے فلاسفہ و متکلمین پیدا ہوئے جنھوں نے اس کی اشاعت میں قابل قدر اضافہ کیا۔ برصغیر کے مشہور مسلم فلاسفہ میں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ڈاکٹر محمد اقبالؒ، سر سید احمد خانؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے نام کائنات فلسفہ و کلام میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ انہوں نے اس علم کو بھی مذہب کی تائید میں استعمال کیا اور بہت سی گتھیوں کو اپنی عقل رسا کے ذریعے سے عام الفہم بنا دیا۔ ان بزرگوں نے فلسفہ و کلام کو محض ذہنی ورزش کا سامان نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا کام لیا۔ برصغیر میں جہاں سلاطین وقت دیگر علماء و فضلاء کی قدر کرتے وہاں ان علماء کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور بڑے بڑے فلاسفرز اور متکلمین بادشاہوں کے درباروں کی زینت بنے رہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مسلمانوں کے اندر ایسی کوتاہیاں اور کمیاں آگئیں جنھوں نے ہر قسم کے مادی ذرائع کے باوجود انہیں ترقی کی راہ سے دور پھینک دیا۔

پاک و ہند میں علم فلسفہ و کلام: برصغیر پاک و ہند میں غزنویوں اور غوری بادشاہوں کی طرح سلاطین دہلی علمی و ادبی مذاق کے مالک تھے اور اہل علم کی سرپرستی کرنے میں پیش پیش تھے۔ مشہور ریاضی دان البیرونی، امیر خسرو شاعر، ابن بطوطہ سیاح، مؤرخ فرشتہ اور ضیاء الدین برنی جیسے فلاسفرز، متکلم اور مؤرخ ان بادشاہوں کی حوصلہ افزائیوں کے باعث ان کے درباروں کی زینت تھے۔ احمد نگر اور بیجاپور کے حکمرانوں کی بڑی بھاری لائبریریاں تھیں۔ عوام کی تعلیمی سہولت کے لیے خانقاہوں اور درس گاہوں کے ساتھ مدرسے اور مکتب ملحق تھے جن میں قرآن، حدیث، فقہ، طب، نجوم، علم الکلام، فلسفہ، ریاضی اور تاریخ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ لاہور، ملتان اور اُچ تعلیمی مرکز تھے۔ دہلی میں اقامتی یونیورسٹی تھی

جسے ''مدرسہ فیروز شاہی'' کہتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مسلمانانِ ہند مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنے تعلیمی نظام کو نہ ڈھال سکے۔ سائنسی علوم سے کمال بے توجہی برتی گئی۔ بین الاقوامی مسائل سے بے اعتنائی اپنائی گئی۔ فوجی تربیت کو نصاب تعلیم میں کوئی جگہ نہ دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال ہا سال کے بعد یہ تعلیمی نظام فرسودہ اور ناکارہ ہوگیا۔ اس سے حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، احمد شہید بریلویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے پایہ کے طلبہ نہ نکل سکے اور ترقی کی دوڑ میں مسلمان نہ صرف پیچھے رہ گئے بلکہ وقت کا ساتھ نہ دے کر بری طرح پٹ گئے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں سیاسی لحاظ سے ڈیڑھ سو سال (۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک) کا زمانہ محکومیت کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے انتہائی پستی کو پہنچ گئی لیکن قوم میں ابھی جان باقی تھی، اللہ کا ایک بندہ (سر سید احمد خانؒ) اٹھا اور اپنی ہمت، معاملہ فہمی اور مسلسل جدوجہد سے حالات کا نقشہ بدل دیا۔ اب قومی تنظیم اور بیداری کی کم از کم ایسی حالت ہوگئی کہ قومی حقوق کی حفاظت ہو سکے اور جب بالآخر ۱۹۴۷ء کو بدیشی حکمرانوں کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اگرچہ مغلیہ سلطنت بحال نہ ہوئی لیکن برصغیر پاک و ہند کے ایک وسیع خطے پر ایک خود مختار اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔

یہ نتیجہ خیز کوششیں سیاسیات تک محدود نہ تھیں۔ علمی، ادبی بلکہ مذہبی اور دینی معاملات میں بھی قوم نے نئی سربلندیاں حاصل کیں۔

اسی صدی میں فلسفہ میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے مفکر پیدا ہوئے جن کا مدمقابل جدید دنیائے اسلام میں شاید ہی نظر آئے۔ مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک جہاد اسی زمانے کے متعلق ہے۔ دیوبند کا مدرسہ جس کی مثال ہندوستان میں اسلامی حکومت کے عروج میں مشکل سے ملے گی، ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اسی زمانے میں قائم ہوئے۔ قرآن کریم کی اشاعت اور تفہیم کے لیے مسلسل کوششیں ہوئیں۔ سیرت میں ایک نیا معیار قائم ہوا۔ مغربی زبان میں اسلام کی اشاعت سید امیر علی نے کی۔ علم حدیث اور فلسفہ میں تحقیقی انکشافات علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے کئے۔ اور بلاد مغرب میں ہمارا سب سے

کامیاب مبلغ خواجہ کمال الدین اسی زمانے میں مصروف عمل تھا۔(۵)

اس صدی کے فلسفہ وکلام کے میں بلند پایہ مقام رکھنے والے مفکر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے نظریات وتحقیقات کو ضبط تحریر میں لانا ہمارا موضوع ہے۔قدرت نے علامہ انور شاہ صاحبؒ کو ایک وسیع ،رنگارنگ اور ہمہ گیر دماغ عطا کیا تھا انھوں نے اپنے دور کے تمام شعبوں پر اپنا اثر ڈالا ہے۔علامہ ایک محققانہ ذہن لے کر آئے تھے۔آپ نقلی علوم میں فاضل جلیل تھے ہی مگر بہت کم اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ عقلی علوم جیسے فلسفہ، منطق اور کلام پر بھی ان کی وسیع اور گہری نظر تھی۔انھوں نے ان علوم پر نہ صرف تقریریں اور بحثیں کی ہیں بلکہ فلسفہ وکلام کے کچھ اہم مسائل پر دو رسالے لکھے ہیں۔ان کے عہد میں طبیعیات اور ہیئت پر بہت سی باتیں منظر عام پر آرہی تھیں جنھوں نے قدیم طبیعیاتی اور ہیئتی تصورات میں بڑا انقلاب رونما کیا۔

علامہ انور شاہ صاحبؒ ان علمی تحقیقات سے باخبر تھے انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں معقولات کی کتابیں درس میں باضابطہ پڑھی تھیں دیوبند کی مدرسی اور صدر مدرسی کے زمانے میں اگرچہ استاذ حدیث تھے مگر یہاں بھی وہ فارغ اوقات میں چند خاص شاگردوں کو جدید سائنس کی تعلیم دیتے تھے۔(۶)

فلسفہ جدید وہیئت جدید کا مطالعہ:

شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں کہ:

> ’’فلسفہ جدید اور ہیئت جدید کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی کتاب بھی پڑھائی تھی۔اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کا علم بھی حاصل کرنا چاہیے۔‘‘(۷)

موجودہ سائنس کا مطالعہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ رقمطراز ہیں:

> ’’اس کا شاید کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کا بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اوران علوم میں

ان کی نظر مبصرانہ تھی۔''(۸)

ڈاکٹر سید محمد فاروق لکھتے ہیں کہ علامہ انور شاہ صاحبؒ انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی یہ بات قابل اعتبار نہیں کیونکہ موصوف علامہ نے نہ صرف انگریزی زبان کی تحصیل کی تھی بلکہ انگریزی کتب سے استفادہ بھی کرتے تھے۔

علامہ محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

" كان رحمه الله حصل اللغة الانجليزية فی نحو ستة اشهر حتی قدر علی التحاور فیها والا ستفادة من كتبها ۔ "(۹)

نیوٹن اور دوسرے علماء سائنس کی تصنیفات وتالیفات میں اس درجہ درک وبصیرت پیدا کی کہ طلبہ کی ایک مخصوص جماعت جن میں مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ بھی تھے، باقاعدہ سائنس کا درس دیتے تھے۔(۱۰) بالخصوص دودائرۃ المعارف (بستانی اور فرید وجدی) ان کی آنکھوں کے سامنے گویا کاغذ کا ایک ورق تھیں۔

بقول علامہ بنوریؒ:

" فهذا كتاب دائره المعارف للوجدی اوللبستانی كانهما صفحة واحدة بين عينيه ۔ " (۱۱)

<u>علامہ اقبالؒ کا سوال:</u> ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ نے نیوٹن کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ:

''میں نے نیوٹن کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور 'زمان ومکان' کے متعلق ان کی تحقیقات وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے عراقی فلسفی نے اپنے رسالے میں پیش کی ہیں۔''(۱۲)

اگرچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فلسفہ پر لکھے ہوئے دو رسالے ان کی علمی بصیرت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ تاہم عصری علوم سے متعلق بہت سی تحقیقات وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے دو رسالوں اور دوسرے منتشر افادات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور کلام میں بھی دوسرے ماہرین فن کی طرح وہ اپنا علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ایک شاگرد قاضی محمد زاہد الحسینیؒ مدرسہ ڈابھیل کے آخری سال کا نقشہ یوں

پیش کرتے ہیں:

"اللہ اللہ وہ ڈابھیل کا آخری سال، استاد زمان کی پڑھائی معقولات کے فاضل طلبہ وہاں پہنچے اور ہر ایک آپ کو ابن سینا سمجھتا تھا لیکن سارا کروفر اس وقت ختم ہو گیا جب حضرت شاہ صاحب نے اپنے معصومانہ انداز میں سفید مونچھوں اور داڑھی کے درمیان عنابی ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے یہ کہا: عالم مثال کے متعلق ابن سینا نے یہ کہا! امام غزالی کا نظریہ یہ ہے، ابن عربیؒ یہ کہتے ہیں، رازی کا خیال یہ ہے اور میں یہ کہتا ہوں۔" (۱۳)

شیخ الاسلام مصطفیٰ صبریؒ کا علمی استفادہ: ۱۳۵۷ھ میں جب شیخ مصطفیٰ صبریؒ نے علامہ کشمیریؒ کا رسالہ "مرقاۃ الطارم لحدوث العالم" کو دیکھا تو کہا کہ "میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے"۔ (۱۴) پھر کہا: "میں ان چند اوراق پر مشتمل رسالے کو صدر شیرازی کی بسیط و ضخیم تصنیف "اسفار اربعہ" پر ترجیح دیتا ہوں تو ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔"

ڈاکٹر سید محمد فاروق لکھتے ہیں کہ شیخ مصطفیٰ صبریؒ نے "موقف العقل والنقل" میں اس رسالہ کے کئی جگہ حوالے دیئے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے ان کے اس اعتراف کو نقل کیا ہے:

"جب شیخ موصوف اس موضوع (حدوث وقدم عالم) پر کتاب لکھ رہے تھے کہ انہوں نے علامہ محمد انور شاہ کشمیری کا رسالہ "مرقاۃ الطارم" دیکھا۔ اور مطالعہ کیا تو خوش ہوئے کہ وہ دونوں حضرات اس رائے میں متفق ہیں۔" (۱۵)

ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا علمی استفادہ: سید ابوالحسن علی ندویؒ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور علامہ کشمیریؒ کے تعلقات اور ڈاکٹر اقبالؒ کے علامہ موصوف سے علمی استفادہ کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ولم یزل یستفید فعلاً من العلامہ الکبیر انور شاہ الکشمیری والاستاذ الکبیر العلامہ السید سلیمان

الندوی۔" (۱۶)

یعنی وہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ سے علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے قریبی ساتھی اور مخلص دوست نیز ان کی تصانیف کے مشہور شارح پروفیسر سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''آخری دور میں انھوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ملا یعنی امام العصر، علامۃ الدہر حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب مرحوم ومغفور کسی طرح لاہور میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کریں۔'' (۱۷)

قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال مرحومؒ کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح (مولانا انور شاہ صاحبؒ) کے ارشادات سے ہوئی۔ ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پر آتے تھے اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی۔'' (۱۸)

ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اسلامی فلسفہ میں زمان ومکان کی حقیقت وحیثیت سمجھنے کے لیے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس پر آپ نے ڈاکٹر موصوف کے نام بہت سے خطوط بھیجے بلکہ علامہ عراقی کا ایک رسالہ انھیں ارسال کیا تھا، یہ رسالہ زمان ومکان کی حقیقت ہی سے بحث کرتا ہے اور علامہ اقبالؒ اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ علامہ اقبالؒ کے انگریزی خطبات میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا کہیں بھی نام نظر نہیں آتا مگر عراقی نام کے ایک صوفی کا کئی مقامات پر ذکر ہے۔ دوسری طرف آپ کے دو رسائل " ضرب الخاتم علی حدوث العالم " اور " مرقاۃ الطارم لحدوث العالم" میں عراقی کا حوالہ ملتا ہے۔ اس طرح دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے آپ کا ایک قلمی رسالہ حاصل کیا تھا جس کا تعلق ''اسطرلاب'' کے اعمال اور وظائف سے ہے انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ

کیا تھا۔(۱۹) اس سے بھی معقولات کی کتابوں سے علامہ انور شاہ کشمیری کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فلسفۂ یونان اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ: علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی فلسفہ یونان پر وسیع نظر تھی۔ آپ نے علماء اسلام کی کتابوں کے توسط سے یونانی فلسفہ سے واقفیت حاصل کی، آپ نے علامہ ابن تیمیہؒ امام غزالیؒ، ابن رشدؒ، امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدی، ابن سینا، صدرا شیرازی، محمد باقر، جلال الدین دوانی اور ہندوستان کے بلند پایہ حکماء اور متکلمین کی کتابوں کا بغائر مطالعہ کیا تھا۔ ان سب کے علوم اور افادات، ان کے رسائل اور امالی میں ملتے ہیں۔ ایک جگہ ذات وصفات باری تعالیٰ میں ابن سینا اور الفارابی کے خیالات کو پوری قوت کے ساتھ رد کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ تنبیہ کرتے ہیں جسے ڈاکٹر سید محمد فاروق نے اپنے مقالہ ''علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی علوم عقلیہ میں بصیرت'' میں نقل کیا ہے:

> ''تمہیں فکر وبصیرت سے کام لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوڑا کرکٹ کی سبزی دھوکے میں ڈال دے۔ فلاسفہ کی ساری ذہنی عیاشیوں اور چمک دمک کا یہی حال ہے۔ جب گہری نظر سے انھیں دیکھا جائے اور ان پر اچھی طرح غور کیا جائے تو ان کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آئے گا اس لیے تمہیں ان کی حیرت انگیز تعبیرات اور خوش نما اطلاقات پر ہوس نہ کریں۔ ان کی مثال ایسے حدی خواں کی ہے جس کے اونٹ نہیں ہیں یا چکی کے شور وغوغا کی جس سے آٹا نہیں نکلتا ہے۔''(۲۰)

عالم کے حدوث وقدوم کا مسئلہ: عالم کے حدوث وقدوم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فلسفہ یونان اور ان فلاسفۂ اسلام کو جنھوں نے آنکھیں بند کر کے یونان کے ملحدانہ افکار اپنائے پر تنقید کرتے ہوئے علامہ انور شاہؒ رقمطراز ہیں:

> ''حافظ ابن تیمیہ نقل کرتے ہیں کہ قدیم فلاسفہ میں سے کوئی فلسفی عالم کے قدیم ہونے کا قائل نہیں تھا اور خود افلاطون بھی حدوث عالم کا قائل تھا۔ اس کے بعد ارسطو کا زمانہ آیا تو اس نے قدیم عالم کا مذہب اختیار کیا۔ یہ باطل ہے اور اسلام میں اس کا قائل کافر ہے۔ تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ عالم

حادث ہے ۔ ہاں۔ بعض صوفیہ کی طرف بعض چیزوں کا قدوم منسوب کیا جاتا ہے جیسے شیخ محی الدین ابن عربیؒ۔ اگرچہ امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ انتساب شیخ اکبر پر افتراء ہے مگر میرے نزدیک یہ افتراء نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مسائل شیخ اکبر کے تفردات میں ضرور ہیں۔ انھوں نے فرعون کا ایمان بھی تسلیم کیا ہے کہ اسے اپنے کئے کی سزا ضرور ملے گی لیکن خلود فی النار نہیں ہوگا۔ بحرالعلوم مولانا عبدالعلیؒ نے بھی چند باتیں شیخ اکبر کی طرف منسوب کی ہیں۔ میرے نزدیک یہ انتساب صحیح ہے۔ ہاں جلال الدین دوانی نے حافظ ابن تیمیہؒ کی طرف عرش کا قدیم ہونا منسوب کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔"(۲۱)

ابن سینا پر تنقید: علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے منظوم کلام میں ابن سینا پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لسنا نقول کما یقول ال
ملحد الزندیق صاحب منطق الیونان
بدوام ھذا العالم المشھود وال
ارواح غی أزل و لیس لفان
وھو ابن سینا القرمطی غدامی
شرك الردیٰ و شریطة الشیطان(۲۲)

ترجمہ: ہم وہ بات نہیں کہتے جو اس ملحد زندیق یونانی منطق کے پجاری نے کہی ہے۔ وہ یہ کہ عالم مشہود اور عالم ارواح قدیم اور ازلی ہیں اور یہ کہ غیر فانی ہیں۔ میری مراد ابن سینا قرمطی سے ہے۔ جو شرک کا زبوں اور شیطان کی سواری ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ بھی ابن سینا کے ان نظریات کی تردید کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی ابن سینا کو اپنی کتاب " الرد علی المنطقیین " میں ملحد اور زندیق کہا ہے لیکن یہ بات بھی عجیب ہے کہ ابن تیمیہ سے پہلے امام غزالی جیسے مفکر اور صوفی اسلام بھی اس پر کفر کا فتوی لگا چکے ہیں۔(۲۳)

حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی امام غزالیؒ کے ساتھ ابن سینا کے مخالفین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"امام غزالی تکفیر او می نماید، والحق که اصول فلسفی او منافی اصول اسلام است۔" (۲۴)

علامہ انور شاہؒ اور علامہ اقبالؒ جو فکری اور نظری اعتبار سے دونوں قدیم و جدید فلسفہ کے مغز ہیں ابن سینا کی مخالفت میں وہ بھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ہم خیال ہیں۔ وہ جگہ جگہ بوعلی سینا سے چوکنا رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور ان کی ضلالت پر کڑی گرفت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

• یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینا کی لاش
عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی (۲۵)

طب و علم النفس میں ابن سینا کے اقوال: طب یا علم النفس سے متعلق کسی مسئلہ کی تحقیق ہوتی ہے تو اس وقت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الرئیس کے اقوال و تحقیقات کو بطور حجت پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد فاروق علامہ موصوف کے قول کا مفہوم ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

"روح، نسمہ، نفس اور ذرا ایک ہی چیز کے مختلف نام نہیں ہیں بلکہ یہ اپنی ماہیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہیں۔ ذرا اگرچہ روح کے ساتھ قربت رکھتا ہے مگر اس کا اطلاق جسم پر بھی ہوتا ہے۔ بوعلی سینا نے بھی اس کا فرق ملحوظ رکھا ہے، اس نے روح کا ترجمہ رواں اور حیوان کا ترجمہ جان سے کیا ہے۔" (۲۶)

رؤیا کی حقیقت: خواب کے بارے میں قرآن اور احادیث صریحہ میں بہت کچھ مذکور ہے۔ سورہ یوسف میں تین قسم کے خوابوں کا ذکر ہے۔ (۱) منام (۲) رؤیاء (۳) اضغاث احلام۔ فلاسفہ اور متکلمین اسلام نے خواب کی حقیقت و نوعیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس طرح جدید

تحقیقات نے بھی خواب (Dream) کے بارے میں بہت سی نئی باتیں دریافت کی ہیں۔ نفسیات کے مشہور فاضل سگمنڈ فرائڈ نے تعبیر خواب (The Interpretation of Dream) کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس نے لوگوں کو خوابوں کی نئی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ایک حدیث قدسی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن میں جو رؤیا مذکور ہے، اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ یہ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت کا نام ہے یعنی وہ حالت جسے نہ کامل نیند کہا جا سکتا ہے اور نہ کامل بیداری کہتے ہیں، یہ میری ذاتی تحقیق تھی، اس کے بعد میں نے فرید وجدی کی "دائرۃ المعارف" کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ اہل یورپ کی تحقیق بھی یہی ہے۔"

فیض الباری علی الصحیح البخاری میں آپ کی یہ تحقیق یوں نقل کی گئی ہے:

" قد كنت حققت في سالف من الزمان أن الرؤيا ليست بنوم ولا يقظة، بل هي حالة متوسطة بينهما ولذا لا تزال تسلسل ولا تنقطع الا بالنوم الفرق أو اليقظة، ثم اطلعت بعد زمن طويل على دائرة المعارف لفريد وجدي فرأيت فيها أهل أروبا الآن بعين ما كنت حققته سابقاً ۔"(۲۷)

جمادات بھی شعور رکھتے ہیں: جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز شعور رکھتی ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب کہتے ہیں کہ احادیث کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ جمادات کو بھی شعور حاصل ہے۔ ایک حدیث " هذا جبل يحب " کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے احد پہاڑ کو جنتی اور عیر پہاڑ کو جہنمی کہنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (۲۸)

آگے لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے جندان پہاڑ جو مکہ میں واقع ہے پر چلتے ہوئے فرمایا۔ " سبق المفردون " ۔ اس پر میں متفکر ہوا کہ ایک بے حس پہاڑ کے پاس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا۔ پھر میں نے سمہودی کی "وفاء

الوفا" میں دیکھا کہ یہاں آپ کا اشارہ کسی شاعر کے اس شعر کی طرف تھا:

ے و قبلنا سبح جودی والجند ـ" (۲۹)

صلصلۃ الجرس: احادیث میں وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے، اس میں وحی کی ایک قسم کو گھنٹی کی آواز کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ یورپ کے محققین نے "صرع" کا افسانہ اسی پر کھڑا کیا۔ علمائے اسلام نے صلصلۃ الجرس کی مختلف شرحیں لکھی ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اسے ٹیلیگراف کی کھڑ کھڑاہٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

" صلصلة الجرس ههنا كنقراط التلغراف لاداء الرسالة " (۳۰)

قوتِ باصرہ کی حقیقت: رسول اکرم ﷺ نے ایک صحابیؓ سے فرمایا کہ میں نماز کی حالت میں ہونے کے باوجود اپنے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں امام احمدؒ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا۔ لیکن علامہ موصوف کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلسفہ جدیدہ میں اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ قوت باصرہ جسم کے تمام اعضاء میں ہے۔ (۳۱)

عمر فروخ لکھتے ہیں کہ

> "متقدمین مسلمان سائنس دانوں میں ابن الہیثم نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ دراصل آنکھ نہیں دیکھتی ہے بلکہ دماغ دیکھتا ہے۔ بصریات میں ابن الہیثم نے جو تحقیقات پیش کی ہیں یورپ کے سائنسدانوں نے عصر حاضر میں اُن کے ساتھ بڑا اعتناء کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی کاوش فکر کو سائنس کا ایک جزو ہی بنادیا۔" (۳۲)

ایتھر (Ether) یا جوہر بسیط: مولانا انور شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ فلاسفۂ جدید کے ہاں مادہ عالم فضا میں پھیلا ہوا ہے جسے ایتھر کہتے ہیں اور فلاسفۂ قدیم کہتے ہیں کہ وہ جوہر بسیط ہے، اس کے اجزاء نہیں ہیں، حالانکہ آج کی تحقیقات نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ شروع میں مادہ کا نام "عماء" ہے جسے ایتھر کہا جاتا ہے۔ شمس تبریز خان آروری نے اپنے مقالہ میں "تجلی" کے قصیدہ سے چند اشعار نقل کئے ہیں جن سے اس تحقیق کی تائید ہوتی ہے:

ے لامکان کردہ مکان ہمچو "عماء" فوق ہوا

نے چوں معہود کہ سازیم بنا لأنہ ما

لا مکان بودہ مکان گفت ''عماء'' غیر ہوا

نسبتے ہست بہ تنزیل نہ چولأ نہ ما(۳۳)

ایتھر کے بارے میں یہ علامہ انور شاہ کا جدید رجحان ہے، اب اسے عرفاء کے مکاشفات کے ساتھ اس طرح ملایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی عماء سے نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر فرمایا۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم کا پہلا شعر ہے ؎

تعالی الذی کان و لم یك ما سویٰ

و اوّل ما جلّی العماء بمصطفیٰ ۔(۳۴)

اس شعر میں صفت ایہام ہے۔

علوم جدیدہ ہی اقرب الی الاسلام ہیں: مولانا جمیل الرحمان سیوہاروی نائب مفتی دار العلوم دیوبند نے ایک مرتبہ کہا کہ میں نے علامہ انور شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ فلسفہ قدیم اور جدید میں سے اسلام سے کون سا قریب ہے؟ اس سوال کا جواب احمد رضا بجنوری نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علامہ موصوف نے کہا کہ'' فلسفہ قدیم ابعد عن الاسلام اور فلسفہ جدید اقرب الی الاسلام ہے'' اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا کہ'' حق تعالیٰ کی مشیت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جن عقلاء زمانہ (اہل یورپ) نے اسلامی چیزوں، معجزات و روحانیات وغیرہ کا انکار کیا تھا، ان کے فلسفہ اور ریسرچ و تحقیقات سے وہ سب چیزیں دنیا والوں کے لیے ثابت و مشاہد ہو جائیں۔ چنانچہ روح اور روحانیت کا اقرار کر چکے، خوارق عادات بھی تسلیم کر چکے جن سے معجزات اسلام کا استبعاد عقلی ختم ہوا۔ قرآن مجید میں ہے کہ اہل جنت و اہل جہنم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے پہچانیں گے اور باتیں کریں گے، حالانکہ ان کے درمیان بہت غیر معمولی فاصلہ ہوگا، تو اب ٹیلیفون، ٹیلیگراف ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات نے اس کو بھی قریب عقل و مشاہدہ کر دیا ہے۔ اصوات و اعمال کا ریکارڈ مستبعد سمجھا جاتا تھا مگر گراموفون، کیسٹ، سی ڈیز، انٹر

نیٹ، موبائل فونز، فیکس اور کمپیوٹر کی ایجاد نے اس سے بھی مانوس کر دیا جس کو ہم یورپ کی ان ایجادات سے پہلے عقل و مشاہدہ کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے تھے۔" (۳۵)

مولانا انور شاہ صاحبؒ کی ان تحقیقات سے ہمیں آج کل کے ماحول میں اسلامیات کے سمجھنے میں بڑی روشنی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا موصوف نے فلسفہ جدید کی طرف توجہ دی، خود اس کو پڑھا، سمجھا اور دوسروں کو پڑھایا، سمجھایا تاکہ جدید ریسرچ کے تمام گوشوں سے باخبر رہ کر علیٰ وجہ البصیرت علمی، دینی و تبلیغی خدمات انجام دیں۔

آپ کا یہ ملفوظ کہ "علوم جدیدہ اقرب الیٰ الاسلام" ہیں شائع ہوا تو بڑے بڑے اصحاب فکر و بصیرت نے آپ کی بصیرت کا اعتراف کیا۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا ابادیؒ لکھتے ہیں:

"صدیوں کے تعصب اور مذاق قدیم کی پاسداری نے پردے بھی ایسے تہ بہ تہ ڈال دیئے کہ اس حقیقت تک رسائی انور شاہؒ جیسے علامۂ وقت کی بصیرت ربانی سے ہوئی۔" (۳۶)

زمان و مکان کا فلسفہ: بیسویں صدی کی ابتداء میں سائنسی دنیا بالخصوص طبیعیات میں کچھ ایسی تحقیقات و انکشافات منظر عام پر آئیں جن سے طبیعیات سے متعلق بہت سے قدیم نظریات میں بھونچال آ گیا۔ ان نظریات میں نظریہ زمان و مکان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

البرٹ آئن سٹائن: آئن سٹائن نے اپنا خصوصی نظریہ اضافیت ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ اس کا خیال ہے کہ زمان و مکان بھی وجدان کی صورتیں ہیں جن کی انسانی شعور سے باہر ایسی ہی ہستی ہے جیسے رنگ اور شکل وصورت۔ تصورات مکان کی کوئی خارجی حقیقت نہیں ماسوا اس کے کہ ہم اس کے ذریعے اشیاء کی ترتیب معین کرتے ہیں۔ اس زمان یعنی وقت کی بھی کوئی آزاد ہستی نہیں ہے بلکہ ہم حوادث و واقعات کی ترتیب سے وقت کو ناپتے ہیں گویا مکان تصورات کی ترتیب معین کرنے کا وسیلہ ہے اور زمان واقعات کی ترتیب کرنے کا۔

یہ دونوں وسیلے ذہنی ہیں مادی نہیں۔ ان کا ادراک ذہن کر سکتا ہے جو حواس نہیں کر

سکتے اور ان کی حقیقت داخلی ہے خارجی نہیں۔

کائنات: نیوٹن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات ایک غیر مرئی واسطے پر ہے۔اس واسطے میں ستارے گردش کرتے ہیں اور روشنی جلی کے پیالے میں ارتعاش کی طرح سفر کرتی ہے۔ طبیعیات فطرت کے ہر معلوم شدہ مظہر کا مشینی نمونہ مہیا کرتی ہے۔ نیوٹن کے تصورات کائنات کو ساکن حوالے کے نظام کی ضرورت تھی وہ اس میں جامد اور ساکن فضا کی شکل میں موجود تھا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے علمائے طبیعیات میں سے ''میکسویل'' نے روشنی کو برقی مقناطیس کی طرح بے جان ثابت کر دیا تو ایتھر کا وجود ثابت ہو گیا۔لیکن آئن سٹائن نے ایتھر کا نظریہ رد کر دیا اور ساتھ ہی اس خیال کو بھی کہ فضا ایک جامد اور مطلقاً ساکن ہے۔

نائیکلسن اور مورلے کے تجربات نے یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی کہ روشنی کی رفتار زمین کی حرکت سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔آئن سٹائن نے اس حقیقت کو ایک عالمی قانون تسلیم کر لیا۔اس نے مطلق فضا کے تصور کو رد کرنے کے بعد مطلق زمان کے تصور کو بھی خیر باد کہہ دیا۔اس کے اپنے الفاظ کا مفہوم اس طرح ہے:

> ''ایک فرد کے تجربات اور واقعات کے سلسلے میں جو علیحدہ علیحدہ واقعات ہمارے حافظہ میں محفوظ ہیں، ما قبل یا ما بعد کے معیار سے مرتب ہوتے ہیں۔اس لیے ہر شخص کا ایک وقت ذاتی اور خارجی ہوتا ہے جس کی پیائش نہیں کی جاسکتی۔''

مختصر یہ کہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی رو سے زمان و مکان کو کوئی مستقل بالذات وجود حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ زمان ومکان کی بحث: آپ نے اس مسئلہ پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بحث کی ہے۔اگرچہ انھوں نے فلاسفہ، متکلمین، اور عرفاء نیز عصر حاضر کے مسلم الثبوت مصنفین کی کتابوں سے جگہ جگہ استفادہ کیا ہے مگر پرستش کسی مکتب فکر یا نظریے کی نہیں کی ہے۔انھوں نے ''معیار'' بالآخر اپنے فہم کو بنایا جو اسلامی روح سے آشنا اور علم نبوت سے مستفید تھا۔اس سلسلہ میں ہم ان کی تحقیقات کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔آپ ''زمان'' کے مسئلہ پر

بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فالزمان انما ھوفی مطمورتنا لیس عند ربك صباح ولا مساء کما روی ذلك عن ابن مسعود ۔" (۳۷)

ترجمہ: زمانہ صرف ہمارے حدود میں واقع ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صبح ہے اور نہ شام، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ایسا ہی نقل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت کو عقیدۃ الاسلام میں نقل کیا گیا ہے:

"ان ربکم لیس عندہ لیل ولانھار نور العرش من نور وجھہ"۔ (۳۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ رات ہے نہ دن، عرش کا نور اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ صدیوں پہلے علامہ ابن قیمؒ نے بھی اپنے مشہور قصیدہ نونیہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ آئن سٹائن کی طرح علامہ انور شاہؒ بھی زمانے کے مستقل وجود کو موہوم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وتوھم امتداد الزمان من جانب الماضی وما بنی علیہ کلہ توھم لا اصل لہ راساً و انما ھو من ایفال الوھم لا غیر فی حقیقۃ باطلۃ۔۔۔۔ووضع وقت للحدوث من الاوقات الموجودۃ قبلہ توھم ایضاً انما الوقت بالحدوث فیعا لمنا ولولم یکن فی عالمنا لم یکن ھو"(۳۹)

''زمانہ کا پھیلاؤ ایک وہم ہے، اسے بنیاد بنا کر کسی چیز کو قائم کرنا، وہ بھی وہم ہوگا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ محض وہم کا دھوکا ہے یہ بھی بالکل وہم ہے کہ موجودہ اوقات میں سے کسی وقت پر اعتبار کر کے عالم کے حدوث کا وقت مقرر کریں۔ بے شک حدوث کا وقت ہمارے عالم ہی میں ہے۔ اگر یہ ہمارے عالم میں نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ "ھو بنا لا نحن بہ'' وقت کا وجود سے قائم ہیں۔''

<u>مختلف اجسام کے لیے مختلف نوعیت کے اوقات اور امکنہ:</u> علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ

مکان وزمان کی نوعیت ایک نہیں ہے۔ بلکہ مختلف ہستیوں کے لیے مختلف ہے۔ مثلاً: ہوا کے وقت کی نوعیت نور کے زمان و مکان کی نوعیت سے مختلف ہے۔ اسی طرح روح کا زمان و مکان بھی دوسری نوعیت کا ہے۔ تمام لطیف ہستیوں کا زمانہ اسی کے مطابق ہوگا اور عالم غیب میں جو چیز سب سے زیادہ مختصر ہوگی وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ لمبی ہوگی۔ الگ جگہ کسی چیز کو خیال میں لانے کے لیے دو سال کی مدت درکار ہوتی ہے اور دوسری جگہ اس چیز کے لیے ایک اشارہ کافی ہوتا ہے اس طرح صرف ایک چیز کے دو مختلف مکان ٹھہرے۔

کہتے ہیں:

۱۔وقیل لجسم او هواء و نورنا
و روح مکان لا یقاس بما سویٰ
۲۔تخیل امر فی سنین هنا لکم
سنون و میض هھنا مو طنان ذا۔ (۴۰)

۱۔یعنی جسم، ہوا، نور، روح وغیرہ کے لیے اپنا مخصوص مکان ہے جس کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔
۲۔ایک طرف کسی چیز کے تصور میں دو سال اور دوسری طرف اسی کے تصور میں ایک اشارہ ہوگا اس طرح ہر چیز کے دو مکان بن جاتے ہیں۔

<u>دہر کی حقیقت:</u> زمان و مکان کی بحث کے وقت اس مشہور حدیث پر نظر پڑتی ہے جس میں دہر بظاہر عین خدا ہونا نظر آتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لا یسب احد کم الدھر، فان اللہ ھو الدھر " (۴۱)

ترجمہ۔ زمانے کو گالی نہ دو بے شک زمانہ خدا تعالیٰ ہی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی ایک نظم "نوائے وقت" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث سے سخت متاثر تھے۔ انھوں نے اس نظم میں زمانے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہی قادر مطلق اور مصرف عالم نظر آتا ہے۔ زمانہ اس نظم میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہتا ہے:

خورشید بدامانم، انجم بگریبانم
درمن نگری ہیچم، درخود نگری جانم
چنگیزی و تیموری مشتے زغبارمن
ہنگامۂ افرنگی، یك جستہ شرار من
پنہاں بہ ضمیر من صد عالم رعنابیں
صد کوکب غلطاں بیں، صد گنبد خضراء بیں

ایک اور نظم میں بھی مذکورہ بالا حدیث قدسی سے استفادہ کر کے کہتے ہیں:

زندگی از دھر، دھر از زندگی
لاتسبوا الدھر فرمان نبی است

ڈاکٹر اقبالؒ کے ہاں وقت، زمانہ، زندگی، عصر، دہر کے مختلف معنی ہیں۔ اس کے علاوہ دہر کے صوفیہ کرام کے ہاں علیحدہ مفاہیم و معانی بھی ہیں۔ وہ اپنے انگریزی خطبے (The conception of God and the meanings of prayer) میں لکھتے ہیں:

"محی الدین ابن عربیؒ کے ہاں دہر اللہ ﷻ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ اسی طرح امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ کسی صوفی نے انھیں "دہر"، "دیہور" اور "دیہار" کی تکرار سکھائی تھی۔" (۴۳)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ہاں بھی "دہر" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے ہاں تمام اجسام چاہے وہ لطیف ہوں یا کثیف زمان و مکان ایک مقام پر دہر میں آ کر مل جاتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں:

"الی یصیر الکل فی الدھر حاضراً
فدھر و دیھور و دیھار ن اعتلیٰ"

یہاں دہر سے مراد وہی ہے جسے بعض اہل علم "سرمد" کہتے ہیں۔ (۴۴)

جہاں تک اس حدیث کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے عقیدے کا تعلق

ہےتو وہ وہی ہے جو متقدمین محدثین کا رہا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس عالم میں جو کچھ ہے یہ صرف صفات رب کے جلوے ہیں۔ یہاں کوئی چیز مستقل بالذات نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

" اعلم ما من شیئ فی العالم بقضه و قضیضه الا ینتهی الی صفة من صفات اللہ تعالیٰ ولیس به شیئ مستقل " (۴۵)

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب بالآخر اللہ ﷻ کی صفات میں سے ایک صفت پر جا کر ختم ہوتی ہے یہاں کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔

زمان اور مکان بھی اسی میں شامل ہیں یہ اللہ ﷻ کی صفات فعلیہ میں سے ایک صفت ہے۔

علامہ انورشاہ کشمیریؒ حافظ ابن حجرؒ کی اس حدیث پاک کے بارے میں رائے کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

" قال الحافظ معنی النهی عن سب الدهر ان من اعتقد انه الفاعل للمکروه فسبه اخطأ فان اللہ هو الفاعل فاذا سببتم من انزل ذلك بکم رجع السب الی اللہ " (۴۶)

حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک سب وشتم سے روکنے کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص نے یہ اعتقاد رکھا کہ یہ دہر ہی مکروہات کا فاعل ہے پھر اسے گالی دی تو اس نے غلطی کی کیونکہ فاعل تو صرف اللہ ﷻ ہے اس لیے جب تم نازل کرنے والے کو گالیاں دو گے تو وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹیں گی۔

وجود باری تعالیٰ اور قیومیت: باری تعالیٰ کا وجود ثابت کرنے کے لیے فلاسفہ نے ایک بڑی دلیل علت اور معلول کی دی ہے وہ اس سلسلہ علت و معلول کو علۃ العلل پر ختم کرتے ہیں اور اسی کو خدا ٹھہراتے ہیں۔

دوسری طرف بعض ایسے صوفیاء کرام ہیں۔ جنھوں نے اپنے مشاہدات اور روحانی

تجربات کی روشنی میں وجود حق کے اثبات میں اپنی دلیلیں دی ہیں مگر دونوں طرف جو افکار ونظریات پیش ہوئے وہ قرآن مجید کے پیش کردہ ''اللہ'' سے پوری طرح میل نہیں کھاتے، کہیں صفات وکمالات میں نقص نظر آتا ہے اور کہیں خالق ومخلوق عین اور متحد دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے دو رسالوں ''مرقاۃ الطارم'' اور ''ضرب الخاتم'' کا مرکزی مضمون یہی اثبات باری تعالیٰ ہے۔ انھوں نے اس بارے میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ جس خدا تعالیٰ کا وجود ثابت کیا جاتا ہے اس میں وہ سارے اوصاف و کمالات نظر آتے ہیں جو اس کے شایان شان ہیں۔ وہ فلاسفہ کے نظریہ کی طرح محض خانہ پری کا خدا نہیں ہے جس نے کائنات تو بنائی مگر اس سے غیر متعلق ہوا اور اب محض تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خالق کے ساتھ ساتھ قیوم بھی ہے، علامہ کشمیریؒ کے نزدیک صوفیہ کبار کا فلسفہ، وحدۃ الوجود دراصل یہی فلسفہ قیومیت ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"ولما كان وجوده منه و متعلقاً به استمسكه و هو قيومه لم يقدح في نعت الاحدية هو الاول و الآخر و الظاهر و الباطن وهو بكل شئ عليم"۔ (۴۷)

''ترجمہ...... جب عالم کا وجود ذات واجب کے وجود سے قائم ہے تو اسی ذات نے اس کو تھام بھی لیا اس طرح وہ عالم کا قیوم بھی ہوا۔ اس کی قیومیت سے اس کی صفت احدیت پر قدح وارد نہیں ہوتی کیونکہ وہ اول و آخر اور ظاہر و باطن بھی خود ہی ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔

اپنی ایک درسی تقریر میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

"كذلك الوجود و نواشيه من الكمالات و الخيرات في اى ممكن وجد في اى مرتبة تحقق هو وجود الباري عزاسمه ------ لانه هى كما لاته ليس للممكن منها نصيب الا القدر الذى للارض من نور الشمس وهذا مسئلة

وحدۃ الوجود و تعدد الموجودات التی ذھب الیھ المحققون"۔ (۴۸)

ترجمہ......اسی طرح وجود اور اس کے خیرات و کمالات کے مظاہر چاہے وہ ممکنات میں سے کسی بھی ممکن میں پائے جائیں اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے (کیونکہ خیر محض ہونے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے) ممکن (مخلوق) کے کمالات اللہ تعالیٰ کے کمالات ہیں۔ ان میں اس کو صرف اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا زمین کو آفتاب کی روشنی سے، وحدۃ الوجود اور تعدد موجودات جیسے مسائل جنھیں بعض محققین نے اختیار کیا ہے کی بنیاد بھی یہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخلوق کا وجود عین وجود خالق ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ایسا دائمی ربط و اتصال ہے جو اس سے کبھی بھی منفصل نہ ہو سکے۔ محیط و قیوم ہونا خدا تعالیٰ کے لیے ضروری ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے جس کو یہاں پیش کرنا مناسب ہوگا:

۱۔ کرہ شمس............ذات حق

۲۔ جرم شمس کا نور............وجود حق

۳۔ شعاع شمس............صفات حق

۴۔ محل شعاع............اعیان ثابتہ یا معلومات حق

جس طرح شعاع شمس عین جرم شمس نہیں ہے اسی طرح یہ معلومات حق بھی عین ذات نہیں ہیں مگر ان میں جو ربط و اتصال ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ علت و معلول کے فلسفے سے خدا ﷻ کا ازلی وجود ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے نت نئی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کے بغیر بھی وجود باری تعالیٰ ثابت ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ولیعلم ان تقدم الباری علی العالم لیس ھو من تلقاً العلیہ فقط کما بنی السید الباقر المسألۃ علیہ فاورد علیہ المناقشون ما اوردوا و انما ھو نعت الھی علی حیالہ من

تلقاء الاحديه و الفردية و الوترية يقتضی تقدم العدم علی العالم مرة و یبقی ذلك النعت مستمرا بعد وجود العالم ایضاً اذ هو موصوف ابدا بانه بعد العدم و لا نظر الی من هو داخل فی مطمورته بل النظر الی المجموع من حیث المجموع استشعریه احد و لم یشعر۔

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد که این کشاکش بادی است" (۴۹)

"ترجمہ...... عالم پر ذات باری کا تقدم فقط علت ومعلول کی بنا پر ہی نہیں ہے جیسا کہ سید باقر نے اس مسئلہ کی عمارت ہی اسی پر کھڑی کی ہے جس پر کرید نے والوں نے وہ اعتراضات کیے جو مخفی نہیں بلکہ یہ تقدم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ونعت ہے۔ یہ صفت باری تعالیٰ میں اس کے احد، فرد اور وتر ہونے کی جانب سے ہے۔ یہی صفت عالم کی ابتداء میں معدوم ہونے کی متقاضی ہے اور عالم کے وجود میں آنے کے بعد باقی رہے گی۔ کیونکہ وہ عالم ہمیشہ اس صفت سے متصف ہے کہ یہ علوم کے بعد وجود میں آیا ہے۔ دیکھنا یہ نہیں ہے کہ اس گنجینۂ عالم میں داخل بلکہ مجموع کو من حیث المجموع دیکھنا ہے۔ کسی نے اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی نہیں سمجھا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:
دریا اپنے وجود سے موجیں مارتا ہے مگر تیرنے والے تنکے کو گمان ہوتا ہے کہ اس کی کشاکش ذاتی ہے"۔

مختصر یہ کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ایک عجیب وغریب خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں ربانی علماء جیسے مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ اکبر محی الدینؒ، ابن عربیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہم کے علوم وافادات کے پہلو بہ پہلو فضلائے یورپ کی جدید تحقیقات بھی نظر آتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے کبار صوفیاء نے جو حقائق بیان کئے ہیں۔ طبعیات کی جدید تحقیقات نے ان میں سے بہت سی باتیں قابل فہم بنا دی ہیں۔ یہ خوبی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے معاصرین میں کسی اور عالم کے ہاں نظر نہیں آتی۔

علامہ شبلیؒ کو دیکھئے ان کی ''الکلام'' صرف فلاسفہ اور متکلمین کے گرد گھومتی نظر آتی ہے، اگر چہ سوانح مولانا رومؒ کے آخری اوراق میں یہ خصوصیت ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں بھی بصیرت سے زیادہ مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر علامہ کشمیریؒ کا یہ عمل اس لحاظ سے اور بھی زیادہ قابل غور بن جاتا ہے کہ ان کا تعلق پرانے طرز کے علماء اور قدیم دینی حلقے سے تھا۔ اس حلقے کو قدیم ذوق کی سخت پاسداری تھی اور اس سے ایک قدم آگے رکھنا سخت مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

مگر مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس حلقہ کے علماء میں پہلے ایسے عالم نکلے جنہوں نے سلف و خلف کا احترام ملحوظ رکھ کر علمی مباحث و مسائل میں جمود و تعطل پر کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے علم کو زمان و مکان کی بندشوں میں مخصوص نہیں سمجھا بلکہ ہر جگہ اور ہر دور کے علم سے بقدر ظرف استفادہ کیا۔

علامہ کشمیریؒ بہت سے مسائل کو عرفاء کے افادات کی روشنی میں اس طرح حل کرتے ہیں کہ جدید تحقیقات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے، یہ کمال ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے خطبات میں بھی ضرور نظر آتا ہے۔ علامہ موصوف کے بعد اس میں ڈاکٹر اقبالؒ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ان کے ہاں ایک طرف برکلے، نطشے، آئن سٹائن اور برگسوں کے افکار و خیالات دیکھتے ہیں تو ان کے دوش بدوش رومیؒ، ابن عربیؒ، عراقیؒ، خواجہ محمد پارساؒ، اور شیخ احمد سرہندیؒ کے تجربات و مشاہدات بھی پاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱	شاہ ولی اللہ کی تعلیم	ص ۳۰۰
۲	فلسفہ اسلام	ص ۱۷۸
۳	تاریخ مسلمانان عالم	ص ۲۹۰
۴	فلسفہ اسلام	ص ۱۸۷
۵	موج کوثر	دیباچہ
۶	روئداد دار العلوم، ۱۳۲۵ھ	
۷	موج کوثر	ص ۲۱۰
۸	حیات انور	ج ۲، ص ۲
۹	نفحۃ العنبر	ص ۹۴
۱۰	حیات انور	ج ۲، ص ۲
۱۱	مقدمہ عقیدۃ الاسلام	ص ۱۴
۱۲	برہان دہلی، مئی ۱۹۸۱ء	
۱۳	حیات انور	ج ۲، ص ۴۳
	و دار العلوم دیوبند ۱۷/ جون ۱۹۵۷ء	
۱۴	حیات انور	ج ۱، ص ۲۲۰

۱۵	برھان دہلی مئی ۱۹۸۱ء	ص ۲۹۰
۱۶	روائع اقبال	ص ۱۲
۱۷	ارمغان حجاز شرح	ص ۱۷۱، ۱۷۲
۱۸	حیات انور	ج ۱، ص ۲۵۱
۱۹	بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب	ص ۴۴
۲۰	برہان دہلی، مئی ۱۹۸۱ء	
۲۱	ماخوذ از فیض الباری	ج ۱، ص ۱۶۶
۲۲	ایضاً	
۲۳	الاخلاق عند الغزالی	ص ۷۵
۲۴	مکتوبات دفتر اول مکتوب نمبر ۲۴۵	
۲۵	ضرب کلیم	ص ۱۴۵
۲۶	برہان، جون ۱۹۸۱ء	
۲۷	فیض الباری	ج ۱، ص ۲۱، ۲۲
۲۸	ماخوذ فیض الباری	ج ۳، ص ۴۲
۲۹	ایضاً	ج ۳، ص ۴۴
۳۰	مشکلات القرآن	ص ۱۲۴
۳۱	برھان دہلی جون ۱۹۸۱ء	ص ۳۵۹
۳۲	العرب	ص ۷۳، ۷۴
۳۳	دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۶۷ء	
۳۴	ضرب الخاتم علی حدوث العالم	ص ۲

۳۵	نطق انور	ص ۶۱، ۶۲
۳۶	صدق جدید، لکھنؤ، ۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء	
۳۷	مرقاۃ الطارم	ص ۴
۳۸	عقیدہ الاسلام	ص ۲۰
۳۹	مرقاۃ الطارم	ص ۴
۴۰	ضرب الخاتم	ص ۱۳
۴۱	صحیح المسلم	ج ۷، ص ۴۶
۴۲	پیام مشرق	ص ۹۰
۴۳	تشکیل الہیات جدیدہ (انگریزی)	ص ۴۷
۴۴	ضرب الخاتم	ص ۴
۴۵	مرقاۃ الطارم	ص ۴
۴۶	انوار المحمود، شرح سنن ابی داؤد	ج ۲، ص ۵۶۸
۴۷	مرقاۃ الطارم	ص ۷
۴۸	انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد	ج ۲، ص ۵۴۹
۴۹	مرقاۃ الطارم	ص ۷

باب: ۷

علامہ کشمیریؒ کا مسلک طریقت اور تصوّف

اسلام سے قبل کشمیر

عام طور پر جن لوگوں کو علمی نسبت زیادہ ہے ان کی روحانی نسبت کا ظہور کم ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے بارے میں بھی عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ وہ بہت بڑے عالم و محدث تھے لیکن تصوف میں ان کو کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا۔ اس باب میں آپ دیکھیں گے کہ مولانا موصوف کو تصوف میں بھی ایک بلند مقام حاصل ہے اور ان کی حیثیت ایک صوفی عالم کی سی ہے۔

تیسری صدی عیسوی کے وسط میں بدھ مت کا کشمیر میں ورود ہوا پھر یہ خطہ برصغیر پاک و ہند میں اس دین کا اہم مرکز بن گیا۔ کشمیر کے راجہ کنشک نے دوسری مشاورتی کونسل یہیں طلب کی تھی اور بدھ مت مہایانا فرقہ کا نقطہ آغاز اسی کونسل سے ہوا۔(۱)

کنشک کے بعد اشوک بدھ مت کا پیرو اور حامی ہوا، اس دور میں سینکڑوں بدھ عالم اور راہب دور دراز کے علاقوں سے آ کر کشمیر میں رہنے لگے۔ کشمیر میں ہندومت اور بدھ مت کی اشاعت کے بعد سب سے بڑا واقعہ ''مانی'' کا اس سرزمین میں آنا ہے۔ سعید نفیسیؒ لکھتے ہیں:

> ''ناچار مانی از ایران بیرون رفت یا آنکه اورا تبعید کردند و بکشمیر رفت و از آنجا ترکستان چین رفت و در راه از تبت گزشت وپس از آن همواره به معتقدین خود در تبت مکتوب می نوشت و روابط خود رابایشان حفظ میکرد۔'' (۲)

اس طرح ہندو و بدھ عقائد و تعلیمات کی طرح مانی کے نظریات بھی کشمیر کے اسلامی تصوف میں راہ پا گئے ہوں گے۔(۳)

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کشمیر کے ہندو علماء نے ایک عظیم فکری تحول پیدا کر کے اپنے عقائد کی اصلاح کی۔ اہل کشمیر نے شیومت کی تثلیث کو توحید میں بدل کر ایک

علیحدہ فرقے ''کشمیر شیومت'' کی بنیاد رکھی۔ اس مکتب فکر کا دوسرا نام ''پراتیا بجنیا'' ہے۔ اس فرقہ کا مشہور مبلغ ناؤ گیت تھا۔ (۴)

ریاست کشمیر پاکستان، بھارت، تبت، چین اور نیپال کی ہمسایہ ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان ممالک کے مذاہب اور ثقافت اہل کشمیر پر اثر انداز ہوئے اور پھر ان علاقوں نے کشمیر کے مذاہب و افکار کو قبول بھی کیا ہے۔ خاص طور پر چین میں مجوس، بت پرست اور آتش پرست پائے جاتے تھے۔ جن کا کشمیری ثقافت پر زیادہ اثر ہوا۔ ایک عرب مؤرخ ابو الفداء اسماعیل بن علی لکھتے ہیں:

"ھم اھل مذاھب المختلفة مجوس واھل اوثان و اھل نیران" (۵)

ظہور اسلام کے بعد بھی مختلف احزاب و اشخاص کی توجہ کشمیر پر رہی۔ کشمیر گوناگوں تحریکات کی منزل تھی۔ ۳۰۹ھ میں حسین بن منصور حلاج ملتان سے ہوتا ہوا کشمیر پہنچا اور پھر چین چلا گیا۔ (۶)

اکا دکا مسلمان تو پہلی صدی ہجری میں کشمیر پہنچ گئے ہوں گے لیکن جس شخصیت نے با قاعدہ تبلیغ سے عوام کے فکر و عمل میں عظیم انقلاب برپا کر دیا وہ ایک صوفی عالم سید شرف الدین بلبل شاہ سہروردی ترکستانی ہیں جو ۷۲۵ھ میں کشمیر آئے اور یہاں کے بدھ راجہ رنچن کو مسلمان کیا اور وہ صدر الدین کے نام سے کشمیر پر حکومت کرنے لگا اور اسی دور میں بلبل شاہ بغداد اور خوارزم سے اپنے ساتھ عربی و فارسی کے علوم بھی لائے۔ اس کے تقریباً پچاس سال بعد ۷۷۴ھ میں سید علی ہمدانی سات سو علماء و صوفیاء کے ساتھ کشمیر آئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سنسکرت کی جگہ عربی و فارسی نے لینا شروع کر دی۔ (۷)

کشمیر میں صوفیاء کے چاروں سلسلے نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ پائے جاتے تھے۔ یہاں کے علماء و عرفاء اور صوفیاء نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ یہ تینوں مراکز علم و تصوف اور زبان کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ صوفیائے کشمیر کی یہ خصوصیت بھی رہی ہے کہ وہ تقریباً سب کے سب مصنف اور شاعر تھے۔ انھوں نے صوفیانہ افکار عربی، فارسی اور کشمیری زبان میں بیان کیے۔

ہم کشمیر کے چند مشہور صوفیاء کا ذکر یہاں کرتے ہیں:

مشہور صوفیاء اور خاندان علامہ کشمیریؒ:

۱) سید شرف الدین عبدالرحمان بلبل شاہؒ (م۔ ۷۲۷ھ): بلبل شاہؒ پہلے صوفی اور مبلغ ہیں جنھوں نے باقاعدہ ۷۲۵ھ میں وادیٔ کشمیر میں قدم رکھا۔ تصوف میں سلسلۂ سہروردیہ اور فقہ میں مذہب حنفی کے پیرو تھے۔ حضرت بلبل شاہ کے علم وفضل، زہد وتقویٰ کو دیکھ کر بڑی تعداد میں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سری نگر میں تصوف کی دنیا کا یہ آفتاب اپنی ضیا پاشیوں سے خطہ کشمیر کو منور کرنے کے بعد ۷۲۷ھ میں افق عدم میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ آپ کا مزار سری نگر میں دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ (۸)

۲) سید جلال الدین البخاریؒ (م۔ ۷۸۵ھ): سید بلبل شاہؒ کی وفات کے تقریباً بائیس سال بعد ۷۴۸ھ میں سید جلال الدین بخاریؒ نے جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے مشہور تھے اس وادی میں قدم رکھا۔ وہ شیخ رکن الدین عالمؒ کے مرید تھے، وہ کشمیر میں بہت کم عرصہ ٹھہرے لیکن اس کے اثرات بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ (۹)

۳) سید تاج الدین سمنانیؒ: مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ کے وادی میں آنے کے بارہ سال بعد ۷۶۰ھ میں آپ سید مسعودؒ اور سید یوسفؒ کے ہمراہ ایران سے کشمیر میں وارد ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے چھوٹے بھائی سید حسین سمنانیؒ ۷۷۳ھ میں یہاں پہنچے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ سادات سمنان سب کے سب صوفی عالم اور سنی مذہب کے حامل تھے۔ (۱۰)

۴) للہ عارفہؒ (م۔ ۷۷۳ھ): آپ ۷۳۵ھ میں کشمیر کے گاؤں سم پور میں پیدا ہوئیں۔ وہ سید حسین سمنانیؒ کی مرید تھیں، وہ ہمیشہ صوفیاء کی محافل میں بیٹھتی اور تصوف اسلامی کے اسرار و رموز سیکھتی تھیں۔ وہ کشمیر میں فلسفہ ہمہ اوست کی زبردست مبلغ تھیں۔

للہ عارفہؒ شاعرہ بھی تھیں وہ مختلف افکار اور نظریات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے تھیں۔

۵) سید علی ہمدانیؒ (م۔ ۷۸۶ھ): آپ سات سو علماء کے ساتھ ۷۷۴ھ میں ہمدان سے کشمیر پہنچے۔ آپ شافعی المسلک تھے لیکن یہاں فقہ حنفی کو مروج کیا۔ آپ کا شمار عظیم علماء،

صوفیاء اور مؤلفین میں ہوتا ہے۔ کشمیر کے دیگر صوفیاء کی طرح سید علی ہمدانیؒ بھی فارسی زبان کے شاعر تھے، ان کی غزلیات خاص جذب و مستی اور کیف و اثر رکھتی ہیں۔

۶) میر محمد ہمدانیؒ (م۔۸۵۴ھ): سید علی ہمدانیؒ کے بعد ان کے بیٹے میر محمد ہمدانی سلطانؒ سکندر کے عہد میں ۷۹۸ھ میں تین سو علماء و صوفیاء کے ساتھ ایران سے کشمیر آئے۔ سری نگر میں دریائے جہلم کے کنارے ایک مسجد تعمیر کروائی جو خانقاہ معلیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ ۸۱۱ھ تک کشمیر میں ٹھہرے اور اسلام کی تعلیم دیتے رہے۔

۷) شیخ نورالدینؒ (م۔۸۴۲ھ): آپ صوفی ہونے کے علاوہ کشمیری شاعری کے بانی بھی سمجھے جاتے ہیں۔ للہ عارفہؒ کی طرح ان کے گیت اور کشمیری ضرب الامثال آج تک کشمیری عوام میں مقبول ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے ہاں شیخ نورالدینؒ قومی صوفی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ۸۴۲ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار چرار شریف میں ہے۔

۸) سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ (م۔۹۸۴ھ): آپ کشمیر کے ممتاز صاحب کشف و کرامت صوفیاء میں تھے۔ تیجر میں ۹۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ملا لطف اللہ اور ملا اللہ جیسے مشہور علماء سے علم حاصل کیا۔ سلطان غازی چک نے آپ کو قصبہ بیرو میں نظر بند کر دیا تو آپ کے مشورہ سے ملا یعقوب صوفیؒ اور بابا داؤد خاکیؒ کو دہلی بھیجا کہ وہ اکبر بادشاہ کو کشمیر فتح کرنے کے لیے درخواست کریں۔ آخر کار انھیں لوگوں کے تعاون سے اس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۹۸۴ھ میں وفات ہوئی۔ مزار سری نگر میں کوہ ماران کے نشیب میں ہے۔ (۱۱)

۹) شیخ العلماء بابا داؤد خاکیؒ (۹۹۴ھ): آپ شیخ حمزہ مخدومؒ کے خلیفہ تھے اور ملا یعقوب صوفیؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ساری زندگی مرشد کے قدموں میں گزار دی۔ خاکی بڑے مبلغ اسلام اور مصلح قوم تھے، نظریہ وحدۃ الوجود اور تمام ملل و ادیان کی وحدت کے قائل تھے۔ ان کے مشہور مریدوں میں خواجہ محمد پارساؒ تھے۔ (۱۲)

۱۰) ملا محمد یعقوب صرفیؒ (م۔۱۰۰۳ھ): آپ بہت بڑے عالم اور صوفی تھے، شیخ کمال الدین حسینی خوارزمیؒ کے خلیفہ تھے۔ سلسلۂ کبرویہ میں بیعت کرتے تھے۔ صرفی کی شخصیت بڑی متنوع تھی، وہ مفسر قرآن، محدث، فقیہ، صوفی، شاعر، نثر نویس، سیاح اور سیاست دان

تھے۔انھوں نے بڑے بڑے سفر کر کے مختلف مما لک کے علماء سے استفادہ کیا۔انھوں نے کابل میں جلال الدین دوانیؒ اور میر عبداللہ ابوالمعالیؒ سے، بدخشان میں محمد علی شمس الدینؒ اور شاہ یوسف مجذوبؒ سے بلخ میں محمد زاہد بلخیؒ سے، سبزوار میں صادق محمدؒ سے، بخارا میں جلال ولیؒ اور شیخ ناصرؒ سے، گجرات میں سید محمد مہدیؒ سے، بلوچستان میں ابراہیم خاموشؒ سے، لاہور میں موسیٰ آہنگرؒ سے، سرہند میں مجدد الف ثانیؒ سے، آگرہ میں جلالؒ سے، فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتیؒ سے ملاقات کی۔آخر یہ نامور صوفی ۷۵ سال کی عمر میں ۱۰۰۳ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔(۱۳)

خاندان انوری کے صوفی بزرگ: شیخ مسعود نروریؒ مولانا انور شاہ صاحبؒ کے مورث اعلیٰ تھے۔دسویں صدی ہجری کے مشائخ کشمیر میں اپنے معاصرین میں مراتب عالیہ پر فائز تھے۔دولت وثروت، علم وعمل اور تقویٰ وطہارت باطنی وظاہری ہر لحاظ سے آپ قابل تکریم سمجھے جاتے تھے۔آپ کے مرشد سید احمد کرمانیؒ تھے اور آپ کے ہم عمر اولیاء حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہؒ (م۔۹۸۴ھ) ملا محمد یعقوب صرفیؒ (م۔۱۰۰۳ھ) مخدوم احمد قاریؒ، مولانا بابا داؤد خاکیؒ (م۔۹۹۴ھ) اور سید محمد مسافرؒ تھے۔ملا بہاء الدین (م۔۱۲۴۸ھ) نے اپنی منظوم تاریخ ''خمسہ'' میں شیخ مسعود کا تذکرہ کیا ہے۔جسے عبدالرحمان کوندو نے اپنی کتاب ''الانور'' میں نقل کیا ہے:

آنکہ بر تخت سروری زیبد شیخ مسعود نروری زیبد (۱۴)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے خاندان میں اکثر صوفیاء گزرے ہیں۔جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں لوگوں کی باطنی اصلاح کی طرف توجہ دی۔اسی طرح آپ کے والد بزرگوار مولانا محمد معظم شاہؒ صاحب طریقت تھے۔انھوں نے آپ کو بھی بیعت کی اجازت دے رکھی تھی۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اصلاح باطنی حاصل کی اور انھوں نے سلسلۂ چشتیہ میں آپ کو بیعت کیا۔اس سب کی تفصیل یہ ہے:

سلسلۂ بیعت

جس زمانے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی اس وقت

دارالعلوم کے سرپرست حضرت رشید احمد گنگوہیؒ تھے جو طریقت وشریعت کے جامع تھے۔ وہ قادری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کے بعد آپ گنگوہ چلے گئے اور مولانا موصوف کی خدمت میں رہ کر باطنی اصلاح حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے آپ کو سند حدیث بھی دی اور سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کر کے رخصت کر دیا۔ سلسلۂ سہروردیہ کرمانیہ کے اذکار واوراد کا ورد زمانہ طفولیت سے ہی اپنے والد بزرگوار سے سیکھ چکے تھے لیکن بیعت کا باقاعدہ سلسلہ آپ نے مولانا گنگوہیؒ ہی سے قائم کیا اور ہمیشہ ان کے تلقین کردہ اشغال پر کاربند رہے۔ دہلی اور کشمیر کے قیام کے دوران آپ نے سلوک میں محنت وریاضت کی بہت سی منازل طے کر لیں۔

کشمیر میں آپ کے قیام (۱۳۲۰ھ تا ۱۳۲۷ھ) کے زمانہ میں اعمال باطنی اور زہد و تقویٰ میں آپ کے قدم راسخ ہو گئے اور کئی مواقع پر آپ سے کرامات کا ظہور بھی ہوتا رہا لیکن آپ نے روایتی پیر بننے کے بجائے اشاعت علم اور تبلیغ دین کو نصب العین بنایا۔ (۱۵)

عبدالرحمان کوندو لکھتے ہیں:

> ”حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی مرشدانہ صلاحیت کو دیکھ کر آپ کو دوسروں کے بیعت کرنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ مولانا محمود حسنؒ نے بھی جس وقت آپ کو اپنا جانشین مقرر کر کے سفر حجاز کا عزم کیا تو اپنے چند مسترشد علماء کو تربیت وسلوک کے لیے آپ کے سپرد کیا تھا۔“ (۱۶)

علامہ کشمیریؒ کے ہاں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ارشاد وتلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بیعت کر لیتے تھے، مولانا گنگوہیؒ کی طرف سے مجاز بیعت تھے۔ دیوبند کے بعض لوگ آپ سے بیعت تھے ان میں الہ دین دیوبندیؒ، قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم اور مفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان قابل ذکر ہیں۔ آپ نے مریدوں کو چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین کیے۔ ان میں واضح تاثیر وتصرف محسوس ہوتا تھا۔ (۱۷) مولانا محمد انوری بیان کرتے ہیں کہ ”مولانا انور شاہ کشمیریؒ جب بیعت کرتے تو بعد میں کہتے کہ نماز کی پابندی کرو۔ حلال وحرام میں تمیز کرو نیز بیعت کرتے وقت لا الہ الا اللہ کو اس زور سے کہتے

تھے کہ سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب طبق کھل گئے۔ خود جہر کی کیفیت بیان کرتے تھے"۔(۱۸)

مولانا عبداللہ ملتانیؒ بیان کرتے ہیں :

"میں بھی ان (شاہ صاحب) سے بیعت ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارا طریقہ سہروردیہ ہے اور اس کا پہلا وظیفہ یہ ہے کہ سانس لے تو "اللہ" کہے اور باہر نکالے تو "ہو" کہے، اپنے سانس کو اللہ کے ذکر سے کسی حالت میں بھی فارغ نہ رکھے۔"(۱۹)

مولانا محمد انوری علامہ شاہ صاحبؒ سے نقل کرتے ہیں :

" آپ کہا کرتے تھے کہ ہمارا خاندان دس پشت سے سہروردی ہے، میرے والد صاحب مولانا معظم شاہؒ کی طرف سے بھی مجھے اجازت ہے اور حضرت گنگوہیؒ نے بھی اجازت دی ہے، انھوں نے تو یہ اجازت نامہ لکھ کر دیا تھا۔"(۲۰)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اپنے مقالہ "مولانا انور شاہ کا مسلک طریقت" میں لکھتے ہیں:

" حضرت الامام المحدث انور شاہ کشمیری علیہ الرحمتہ جامع کمالات اور یگانہ روزگار بزرگ تھے۔ ان میں فقہ وحدیث کا وہ غیر معمولی ملکہ ودیعت ہوا تھا جو کچھ منتخبان روزگار ہی کے حصے میں آتا ہے۔ اس لیے انہیں فقیہ محدث کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کی ایک انفرادی حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ فقیہ صوفی تھے کیونکہ جوان صالح اور فقیہ صوفی شاذ کالمعدوم ہوتے ہیں۔" (۲۲)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا قلب اسرار الٰہی کا گنجینہ اور انوار حقائق کا ایسا منبع تھا جس پر انھوں نے علم ظاہر کے پردے ڈال رکھے تھے۔ آپ کا روحانی سلسلہ شیخ مسعود نروریؒ کے ذریعے سے سہروردی کرمانیؒ تک پہنچتا ہے۔ ابتداء میں میاں نظام الدین نقشبندی مجددیؒ کی صحبت اختیار کی اور بعد میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت کی، ممکن ہے خلافت بھی ملی ہو مگر مفتی عزیز الرحمانؒ نے اپنی کتاب "تذکرہ مشائخ دیوبند" کے صفحہ نمبر ۱۳۱،۱۳۲،۱۳۳ پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلفاء کے نام لکھے ہیں ان میں علامہ

انور شاہ صاحبؒ کا نام نہیں ہے اسی طرح تذکرہ الرشید میں بھی آپ کے خلفاء کے ناموں میں علامہ موصوف کا نام نہیں ہے۔

مولانا محمد اقبال قریشی لکھتے ہیں :

''مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جب دورہ حدیث پڑھایا تو آخر میں کہا: لاکھ دفعہ بخاری پڑھو جب تک کسی اللہ والے کے جوتے سیدھے نہ کرو گے کچھ نہیں بنے گا۔''(۲۳)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ صرف خشک صوفی ہی نہ تھے بلکہ باعمل عالم اور حامل قرآن بھی تھے۔ اپنی زندگی میں شریعت وطریقت دونوں کو سمورکھا تھا۔ ایک طرف حافظ ابن تیمیہؒ جیسے فقیہ کے معترف تھے تو دوسری طرف شیخ اکبرؒ جیسے صوفی کے بھی مدح خواں تھے۔

محمد کرم بخش مولانا موصوف کی جامع صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عارف کامل ہونے کی وجہ سے فن تصوف میں کمال مہارت رکھتے تھے اور اس فن کی تمام کتب قدیم وجدید پر حاوی تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے بالخصوص محبت تھی اور ان کی تمام تصانیف بالخصوص ''فتوحات مکیہ'' کے نہایت ضبط کرنے والے تھے اور ان کے کلام کے حقائق ومعارف کو ظاہر شریعت پر خوب منطبق کر سکتے تھے اور یہ بات اوروں میں بہت حد تک مفقود ہے۔''(۲۴)

محمد کرم بخش علامہ انور شاہ صاحبؒ کے قول کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ خود کہا کرتے تھے :

''ہمارا اور ہمارے علمائے دیوبند کا یہ مسلک ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں حافظ ابن تیمیہؒ کی کتابیں ہیں تو دوسرے ہاتھ میں شیخ اکبرؒ کی۔ حافظؒ کی تصانیف سے جلال وجبروت الٰہی ظاہر ہوتا ہے اور شیخ اکبرؒ کی کتب سے زیادہ تر رجاء، انبساط اور انس وغیرہ جیسے امور ٹپکتے ہیں۔''(۲۵)

یہی مصنف اپنی کتاب ''جزاء الاحسان'' میں آپ کے بارے میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ صاحبؒ پر روحانیت ونورانیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ بیان سے

باہر ہے۔ ایک دفعہ مجھے حضرت اقدس کی معیت میں سہارنپور اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھنا پڑا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بعض کفار ہنود جو آپ کے چہرہ انور پر نگاہ ڈالتے تو اس قدر متاثر ہوتے کہ متعجبانہ کھڑے ہو کر دیکھتے رہتے اور مجھ سے دریافت کرتے کہ یہ کون بزرگ ہیں۔" (۲۶)

عام طور پر جن لوگوں کو علمی نسبت زیادہ ہوتی ہے ان کی روحانی نسبت کا ظہور کم ہوتا ہے مگر انور شاہ کشمیریؒ میں علمی و روحانی نسبتیں ہر دو جلوہ گر تھیں، ان کی تقریر سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ الہامات وواردات کا ایک سلسلہ جاری ہو رہا ہے۔

بزرگان دین میں جو بیعت وارشاد کا اہم مستحب سلسلہ چلا آتا ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اس کو استعمال کیا مگر بہت کم مواقع میں۔ جزاء الاحسان کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"گو حضرت شاہ صاحبؒ اکثر دفعہ اس سے گریز فرماتے مگر بایں ہمہ میں نے ان کو بعض لوگوں کو بیعت کرتے بھی دیکھا ہے۔ طریق ارشاد بہت سادہ تھا۔" آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ میرے سامنے ایک صاحب ارادت کو فرمایا اعلیٰ قسم کا درود شریف پڑھا کرو۔ اور وہ ہے جو التحیات میں نماز کے اختتام پر پڑھا جاتا ہے۔" (۲۷)

کسی کو نائب یا خلیفہ مقرر نہیں کیا: سلسلۂ بیعت وارشاد میں آپ نے کسی کو اپنا خلیفہ و نائب مقرر نہ کیا لیکن آپ کی علمی یادگاریں اس قدر ہیں کہ ہمیشہ آپ کے نام کو تازہ رکھیں گی۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کا بیان: مولانا محمد انوریؒ مولانا موصوفؒ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

"ایک دفعہ سنہری مسجد دہلی میں انھوں نے دیکھا کہ شاہ صاحبؒ اسم ذات اللہ اللہ کا ذکر درمیانہ جہر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ حجرے کے اندر بیٹھے تھے اور دروازہ پر پردہ لٹک رہا تھا اس وقت وہ سمجھے کہ شاہ صاحبؒ صوفی بھی ہیں۔" (۲۸)

مولانا کشمیریؒ کے یہی شاگرد اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

" بہاول پور میں قادیانیوں کے خلاف مقدمہ کے لئے جاتے ہوئے ریل

گاڑی میں میں نے سوال کیا کہ آپ کو اجازت کن بزرگوں سے ہے تو فرمایا۔ حضرت گنگوہیؒ سے، ۱۳۱۹ھ میں حضرت نے مجھے حدیث کی سند بھی دی اور بیعت کرنے کی اجازت بھی دی۔" (۲۹)

حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کا اظہار عقیدت: صوفی محمد ابراہیم قصوریؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شرق پور میں آنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا مولوی انور شاہؒ صدر مدرسہ دیوبند ہمراہ مولوی احمد علی صاحب مہاجر لاہوریؒ شرقپور شریف حاضر ہوئے اور حضرت میاں صاحب علیہ الرحمتہ کو بڑی عقیدت سے ملے۔ آپ ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور شاہ صاحب خاموش رہے۔ پھر آپ نے مولانا انور شاہ صاحبؒ کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔ شاہ صاحبؒ نے میاں صاحب علیہ الرحمتہ سے کہا" آپ میری کمر پر ہاتھ پھیر دیں"۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں آپ نے بندہ (صوفی محمد ابراہیم) سے فرمایا شاہ صاحب بڑے عالم ہوکر میرے جیسے خاکسار سے فرما رہے تھے کہ میری کمر پر ہاتھ پھیریں اور میاں صاحب نے فرمایا کہ دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ان میں ایک شاہ صاحبؒ ہیں۔" (۳۰)

حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ کا اعتراف کمال: جناب سید نفیس الحسینیؒ مرولہ شریف کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ چند سال بیشتر ۱۰/ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ/ستمبر ۱۹۶۸ء کو وہاں حاضری ہوئی تو حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ بھی ایک خاص جماعت کے ساتھ وہاں تشریف لائے ہوئے تھے جن میں علماء بھی تھے۔ صبح ناشتہ کے بعد مجلس ہوئی اس میں اکابر علماء دیوبند کا تذکرہ ہوا، حضرت خواجہ قمر الدین صاحبؒ، شیخ الاسلام حضرت انور شاہ کشمیریؒ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ "نور الایضاح" کا پورا واقعہ بیان فرمایا کہ کس طرح حضرت شاہ صاحبؒ مصر گئے اور ایک کتب خانے میں "نور الایضاح" کا قلمی نسخہ دیکھا اور پھر یہاں ہندوستان آکر اپنے حافظہ سے اس کو من وعن نقل کر کے شائع کرا دیا۔

حضرت خواجہؒ نے فرمایا:

''مولانا انور شاہؒ کا حافظہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔'' (۳۱)

مسائل تصوف میں علامہ کشمیریؒ کا تبحر

۱۔ امورِ تکوینیہ: محمد اقبال قریشی نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے قول کو اس مفہوم میں نقل کیا ہے:

''جب کسی مسئلہ میں علمائے شریعت اور اولیائے طریقت کا اختلاف پاؤ تو یہ دیکھو کہ وہ مسئلہ امور تشریعیہ یعنی احکام شریعت کے متعلق ہے یا امورِ تکوینیہ یا اسرار کونیہ کے باب سے ہے۔ پس اگر وہ مسئلہ امور تشریعیہ یعنی حلال وحرام، یجوز لا یجوز سے متعلق ہو تو اس وقت علمائے شریعت کے قول اور فتویٰ کو ترجیح دینا۔ اور اگر وہ مسئلہ امور تکوینیہ اور اسرارِ کونیہ سے متعلق ہو تو اولیائے طریقت اہل معرفت اور ارباب بصیرت کے قول کو ترجیح دینا۔ یہ گروہ اہل کشف اور اہل الہام کا گروہ ہے۔ یہ جب کوئی اپنا مشاہدہ یا مکاشفہ بیان کرے تو عقلاً اور نقلاً اس کو قبول کرنا ضروری ہے۔'' (۲۲)

۴) مسئلہ وحدۃ الوجود: شمس تبریز خان آروریؒ بیان کرتے ہیں کہ آپ وحدۃ الوجود کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ اس میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے لیکن اس پر مدار ایمان نہیں، نہ یہ عقائد کی چیز ہے بلکہ صرف کیفی اور وجدانی چیز ہے یعنی کسی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''اللہ'' ہر شے میں سمایا ہوا اور سب پر چھایا ہوا ہے۔ یہ ہے وحدۃ الوجود جس کا مدار صوفیہ کے مکاشفات ومراقبات پر ہے اور وہ حجت شرعی نہیں اس کے خلاف بھی کشف ہوسکتا ہے مگر اس میں شیخ منصورؒ کی طرح کا عمل ٹھیک نہیں ہے، اس لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اس سے انکار کیا ہے، مگر شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ''عبقات'' میں لکھا ہے کہ مجدد صاحبؒ کے مرنے کے بعد ان کے تکیے کے نیچے ان کی تحریروں میں لکھا ہوا تھا کہ بالآخر مجھ پر کشف ہوا ہے کہ وحدۃ الوجود حق ہے۔

حدیث میں بھی وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ ملتا ہے اور ہمارے مشائخ شاہ عبدالعزیزؒ تک اس مسئلہ سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، لیکن میں اس مسئلہ میں متشدد نہیں

ہوں پھر یہ شعر کہے۔

و مـــن عــجــب انــی اعــن الیھــم

و اسـأل عـنھـم دائـمـاً و ھـم مـعـی

و تبـکیھـم عیـنـی و ھـم فی سواد ھـا

و تشتاقھم روحی، وھم بین اھلعی (۳۳)

اردو کا ایک شعر اسی مفہوم کو واضح کرتا ہے:

چمن میں موجۂ صرصر تو گلستان گلاب

وہ جس جگہ ہیں وہاں ایک عجیب عالم ہے

آروری صاحبؒ نے اس معاملہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ہم عصر سید سلیمان ندویؒ کی رائے کو بھی نقل کیا ہے کہ ہمارے حضرات کے ہاں وحدۃ الوجود کا تصور ایک حالی کیفیت ہے جس کی نظر میں ''اللہ'' کی محبت وعظمت وجلالت اتنی چھا جائے کہ ساری مخلوقات اس کی نگاہوں سے چھپ جائے جیسے آفتاب کے طلوع ہونے سے سارے ستارے چھپ جاتے ہیں۔ (۳۴)

۳) طیٔ زمان ومکان: مولانا شمس تبریز خان آرویؒ اپنے مقالہ ''مولانا انور شاہ کشمیریؒ'' میں رقمطراز ہیں:

'' مولانا انور شاہ کشمیریؒ ''طیٔ زمان ومکان'' کے بھی قائل تھے اور اس کی مثالیں پیش کرتے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام رکاب میں قدم رکھتے اور زبور ختم کر لیتے اور علامہ سیوطیؒ نے بعض افراد کا حال لکھا ہے کہ وہ روزانہ نو (۹) قرآن پاک ختم کرتے۔ شیخ سہروردیؒ ۶۰ مرتبہ ختم کرتے اور شاہ اسماعیلؒ نے لوگوں کے سامنے عصر ومغرب کے درمیان ایک ختم کیا اور وہ بھی مع ترتیل وترسیل۔ ترمذی ''کتاب الدعوات'' میں ہے کہ عمر بن ہانی ایک ہزار آیت سجدہ میں اور ایک لاکھ تسبیح روزانہ پڑھتے تھے اور ابن کثیرؒ نے ''متعلقات القرآن'' کے ایک رسالہ میں روزانہ ختم کرنے والوں کے نام لکھے ہیں اور طیٔ مکان کو بلانکیر مسلّم مانا ہے جس سے شیخ مجددؒ نے انکار کیا ہے تو وہ طیٔ زمان

ہی ہوگا۔''(۳۵)

۴) <u>توکل</u>: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے توکل کا ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ ترک اسباب بھی توکل ہے مگر اخص خواص کا ...... جو فنا فی اللہ اور منقطع عن ما سوی اللہ ہوں نہ کہ عام مسلمان۔

<u>۵۔دعا</u>: مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کی دعائیں احادیث کی روح اور لب لباب ہیں جو لطف ولذت اور رجوع وانابت ان دعاؤں میں ہے وہ کسی اور دعا میں کہاں سے آسکتی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعاوں میں فرماتے تھے: "اللهم اغسل خطاياى بماء الثلج و البرد" ۔آپ اس کی توجیہہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اے اللہ! میرے گناہوں کو برف اور اولے کے کثیر المقدار پانی سے دھو دیجئے جسے لوگ بیکار سمجھتے ہیں۔''(۳۶)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے کہا:

''اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے ''اللہ اللہ'' کی آواز سنائی دینے لگے لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت وسنت پر استقامت ہے۔''(۳۷)

ڈاکٹر موصوف مزید لکھتے ہیں :

''بزرگان طریقت کی طرح مولانا انور شاہ کشمیریؒ عند الضرورت وظیفہ یا دعا بھی پڑھنے کے لیے تجویز کرتے تھے۔ جرجان میں ہزار ہا گھر آگ لگنے سے جل گئے اور قرآن بھی جلے مگر ان میں بعض آیات نہیں جلیں۔ ان آیتوں کے بارے میں کہا ''اگر انھیں لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دکان یا گھر یا سامان میں رکھیں تو حفاظت کے لیے مجرب ہیں۔''(۳۸)

محمد طفیل اپنے مجلّہ ''نقوش'' میں لکھتے ہیں :

''حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجلاس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا لقب دیا۔ خود بیعت فرمائی ان کے علاوہ پانچ سو (۵۰۰) علماء نے بھی بیعت کی جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر

''زمیندار'' بھی شامل تھے۔''(۳۹)

مولانا محمد انوریؒ بیان کرتے ہیں :

'' بہاول پور میں جامع مسجد اور دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے علماء کو بھیجتے رہتے تھے، ان ایام میں اس قدر حضرتؒ کے چہرہ مبارکہ پر انوار کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرمارہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں۔''(۴۰)

مولانا موصوف مزید بیان کرتے ہیں :

'' جامع مسجد بہاولپور میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جمعہ کے روز کہا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ ہم سے تو گلی کا کتا بھی اچھا ہے، شاید یہ بات مغفرت کا سبب بن جائے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا جانبدار ہو کر بہاولپور آیا تھا۔ یہ سن کر تمام مجمع چیخیں مار اٹھا۔''(۴۱)

خلاصۂ کلام

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی خصوصیات کو اگر ایجاز کے ساتھ بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انھیں عجیب جامعیت عطا فرمائی تھے۔ ان کی سیرت اور شخصیت بوقلموں ہے جس میں صد ہا رنگ ہیں۔

۱- پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ جامع شریعت وطریقت یعنی فقیہ صوفی تھے۔

۲- دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان کے صدق واخلاص کی وجہ سے اللہ نے ان کے علم میں بڑی خیر و برکت عطا فرمائی تھی۔ انھیں قاری محمد طیبؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد انوریؒ، مولانا محمد شفیعؒ، مولانا محمد ادریسؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد ذاکرؒ بانی جامعہ محمدی جھنگ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا حبیب الرحمانؒ اور مولانا محمد چراغؒ جیسے چراغ ملے جو بجائے خود ایک ایک محفل ہیں۔

۳- تیسرا امتیاز شاہ صاحب کا حسن قبول ہے کہ زندگی میں بھی وہ محبوب ومحترم رہے۔

۴- چوتھی بات یہ کہ آپ نے قادیانی فتنہ کے خلاف بھرپور جہاد بالعلم کیا۔

۵- پانچویں یہ کہ وہ خود بھی حامئ شریعت اور متبع سنت تھے اور تلامذہ کی اخلاقی اور روحانی تربیت اور تزکیہ نفس پر ہر وقت نظر رکھتے تھے۔

۶- چھٹی یہ کہ اعلیٰ درجے کے صوفیانہ اخلاق یعنی تعلیم وتوکل، صبر ورضاء استغناء، تواضع حلم، سادگی، حسن صورت وحسن سیرت اور نور تقویٰ وغیرہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی یہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے انھیں لازوال بنا دیا ہے اور تصوف کی کائنات میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گا۔

حوالہ جات

۱	اسلام ہندوستان میں	ص۴۳
۲	تاریخ تمدن ساسانی	ج۱، ص۶۲
۳	جلوہ کشمیر	ص۹
۴	ایضاً	
۵	تاریخ ابی الفداء	ج۱، ص۱۰۲
۶	جلوہ کشمیر	ص۱۱
۷	ایضاً	ص۱۲
۸	ایضاً	ص۱۳
۹	جلوہ کشمیر	ص۱۴
۱۰	ایضاً	ص۱۵
۱۱	ایضاً	ص۲۴
۱۲	ایضاً	ص۲۵
۱۳	ایضاً	ص۲۷
۱۴	الانور	ص۳۸
۱۵	ایضاً	ص۱۰۲
۱۶	ایضاً	ص۱۰۳

۱۷	ایضاً	ص ۱۰۳
۱۸	الحق، رجب ۱۳۹۷ھ	ص ۴۰
۱۹	انٹرویو از مولانا عبداللہ ملتانی	
۲۰	ماہنامہ الحق، رجب ۱۳۹۷ھ	ص ۴۲
۲۱	ایضاً	
۲۲	تجلیات انور	ص ۱۶۳
۲۳	مولانا انور شاہ کے علوم و معارف	ص ۵۶
۲۴	جزاء الاحسان	ص ۱۵
۲۵	ایضاً	
۲۶	ایضاً	ص ۲۲
۲۷	ایضاً	ص ۲۳
۲۸	ملفوظات حضرت رائے پوری	ص ۴
۲۹	انوار انوری	ص ۱۵
۳۰	خزینہ معرفت	ص ۲۸۴
۳۱	حکایت مہر و وفا	ص ۲۳
۳۲	مولانا انور شاہ کشمیر کے علوم و معارف	ص ۴۵
۳۳	ملخصاً از دارالعلوم اگست ۱۹۶۷ء	
۳۴	دارالعلوم، ستمبر ۱۹۶۷ء	

۳۵	دارالعلوم ستمبر ۱۹۶۷ء	
۳۶	ایضاً	
۳۷	تجلیات انور	ص ۱۶۶
۳۸	ایضاً	ص ۱۷۲
۳۹	نقوش نمبر ۲	ص ۱۲۱۴
۴۰	حیات انور	ص ۳۲۸
۴۱	ملفوظات حضرت رائے پوری	ص ۳

باب: ۸

مولانا کشمیریؒ کا ذوق سخن گوئی

مولانا انور شاہ کشمیریؒ درحقیقت کسی ذات کا نام نہیں ہے بلکہ ایک تحریک اور ادارے کا نام ہے۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک عملی آدمی تھے، انھوں نے اپنی تجدید تحریکات کو بروئے کار لانے کے لیے افراد پیدا کئے اور ایک مکتب فکر کے بانی قرار پائے۔ خاص طور پر برصغیر کے عربی ادب میں جدت پسندی، خلوص، صداقت اور بے ساختہ پن مولانا انور شاہ صاحبؒ کا پیدا کردہ ہے۔ پاک و ہند میں عربی ادب کی تاریخ میں انہوں نے متقدمین کی روش سے انحراف کیا۔ پُر تکلف عبارتوں، دشوار استعارات، پر پیچ تشبیہات دور از کار افکار، مشکل الفہم اسلوب بیان اور مذہبی تعصب سے گریز کر کے حقیقت پسندی، پرکاری اور صداقت پسندی کو عربی ادب میں رواج دیا۔ انھوں نے اہل قلم کی ایک کھیپ تیار کی جس نے ان کے محققانہ اور مجددانہ افکار کی اشاعت کی اور نئے ڈھنگ پر لٹریچر تیار کیا۔

مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے "فیض الباری علی صحیح البخاری" چار ضخیم جلدوں میں لکھ کر عربی ادب پر جو احسان کیا ہے اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا میرٹھیؒ نے اپنی تحریروں میں ان تمام اصولوں کو برتنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے جن کے مبلغ مولانا انور شاہؒ تھے۔ ان کا انداز بیان نہایت سہل، سادہ، شگفتہ، دلنشیں، سلیس اور کافی حد تک مؤثر ہے، ان کی تحریروں میں سوز و گداز، مذہبی ہمدردی، ملی جذبات اور خلوص پایا جاتا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے سوانح نگاری کو جس بلند معیار پر پہنچایا ہے، یہ انھی کا حصہ ہے۔ آپ نے "نفحة العنبر فی حیاة امام العصر الشیخ انور" لکھ کر عربی ادب میں مفید اضافہ کیا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اگر مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ کے شاگردوں میں نہ آتے تو شاید اس تحریک کی کوکھ بانجھ ہو جاتی۔ مولانا گیلانیؒ نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ یہ آپ ہی کا فیضان تھا کہ انہوں نے آپ کی درسی تقریروں کو ضبط کیا جو" مسلم شریف" پر آپ نے کی تھیں۔

آیئے اب ہم مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے آبائی وطن کشمیر چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس سرزمین نے عربی کے کن علماء وفضلاء کو جنم دیا، جنھوں نے عربی زبان وادب کو بام عروج تک پہنچایا۔

جب اس خطہ میں اسلام کا ورود ہوا تو کشمیریوں نے عربی وفارسی کو اپنایا اور ایسا اپنایا کہ پانچ سو سال تک اس ریاست کی سرکاری زبان بنی رہی۔ کشمیر کے متعدد فارسی گو شاعروں کا سکہ آج تک خود فارسی کے وطن ایران میں چلتا ہے۔ کشمیر کے علماء تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ تالیف کے کام میں بھی مصروف رہے۔ مختلف علوم وفنون پر فارسی وعربی میں ان کی تصانیف بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ کشمیر میں عربی زبان کو برصغیر پاک و ہند کی طرح ثانوی حیثیت ہی رہی ہے اور پاک و ہند کے علماء کی طرح یہاں کے علماء کی توجہ تالیفات وتصنیفات سے زیادہ حواشی وشروح پر ہی رہی، مگر اس سے ان کے علمی مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پاک وہند میں فن بلاغت کی مشہور کتاب ''مطول'' پر آٹھ شرحیں لکھی گئی ہیں تو ان میں سے دو شرحیں کشمیر کے علماء محمد محسن کشمیریؒ اور نور محمد کشمیریؒ کی ہیں۔

کشمیر میں علماء کی کمی نہیں رہی، مدارس اور دار الکتب بھی بکثرت رہے ہیں۔ اس سر زمین نے عربی کے ماہرین بھی پیدا کئے جن میں سید علی ہمدانیؒ، شیخ یعقوب صرفیؒ، اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ سر آمد روزگار شخصیتیں ہیں۔

وادئ کشمیر میں عربی زبان

وادئ کشمیر میں اسلامی علوم اور عربی زبان وادب کو سلطان شہاب الدین (۷۵۵۔ ۷۷۵ھ) سلطان قطب الدین (۷۷۵۔ ۷۹۶ھ) اور خاص طور پر سلطان زین الدین (۸۲۶۔ ۸۷۹ھ) کے عہد میں فروغ حاصل ہوا۔ سلطان موصوف نے ایک عظیم الشان دانش گاہ، کتب خانہ، دار الترجمہ اور دار التصنیف کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ خود چھ زبانیں بلتی، تبتی، کشمیری، عربی، فارسی اور سنسکرت جانتا تھا۔ اس سلطان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نزھة الخواطر کا مؤلف لکھتا ہے:

''انہ یکرم ارباب الفضل و الکمال حتی اجتمع لدیہ خلق

كثيـر من العلماء المسلمين و ــــــــ فنقلوا كتباً كثيرةً
مـن الـعـربيه و الفارسيه الى الهنديه و من الهنديه الى العربيه
و الفارسيه في كثير من الفنون " (۱)

ڈاکٹر صابر آفاقی نے لکھا ہے :

'' جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو اس کا ایک شامی سپہ سالار حمیم بن اسامہ کشمیر چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ اس نے یہاں ایک مسجد بنوائی اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔'' (۲)

'' حمیم نے کلر کہار مضافات کھیوڑہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہ اس زمانے میں کشمیر کا حصہ تھا۔'' (۳)

۷۲۰ھ میں ترکستان کے ایک سہروردی صوفی و عالم سید شرف الدین عبدالرحمان بلبل شاہؒ چند اصحاب کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوئے۔ ان کی تبلیغ سے کشمیر کا راجہ رنچن (م۔ ۷۲۸ھ) مسلمان ہو گیا اور سلطان صدر الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ سر زمین کشمیر میں عربی و فارسی زبانیں اور علوم اسلامیہ اسی مبلغ کے ذریعے پہنچے مگر وادئ کشمیر میں اسلام کی با قاعدہ اشاعت سید علی ہمدانی (م۔۷۸۶ھ) کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ تقریباً سات سو علماء، صوفیاء اور مجاہدین کے ساتھ ۷۷۴ھ میں ایران سے کشمیر پہنچے اور تبلیغ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ سید صاحب کا سری نگر میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں عربی زبان کا رواج ہوا۔ سید صاحب ایک عظیم عالم و صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست مؤلف بھی تھے۔ ان کی تالیفات میں سے بیس (۲۰) عربی میں ہیں۔ ان کے قلمی نسخے یورپ و ایشیا کے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ (۴)

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف کشمیر میں بلکہ پورے پاک و ہند میں بھی سید علی ہمدانیؒ جیسا عظیم مؤلف نہیں گزرا۔ آپ کے فرزند سید محمد ہمدانیؒ (م۔۸۵۴ھ) بھی اپنے وقت کے جید عالم اور پر جوش مبلغ تھے۔ انھوں نے تصوف پر نجم الدین عمر قزوینیؒ معروف بہ کاتبی (م۔ ۶۱۳ھ) کی تالیف الشمسیہ کی عربی میں شرح لکھی تھی۔ (۵)

نور بخشیہ فرقہ کے بانی سید محمد نور بخش نے فقہی احکام پر عربی میں ایک کتاب ''فقہ

احوط'' تالیف کی۔ دسویں صدی ہجری کے کشمیری علماء میں رضی الدین (م۔۹۶۰ھ) اور ملا فیروز (م۔۹۷۳ھ) کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے عربی میں بے شمار تالیفات چھوڑی ہیں۔(۶)

حاجی محمد کشمیریؒ (م۔۱۰۰۶ھ) نے شمائل النبیؐ کی شرح ۹۹۴ھ میں تحریر کی تھی اور ۱۳۴۹ھ میں مصر سے شائع ہوئی، فضائل القرآن اور شرح حصن حصین کے علاوہ حسن صغانی لاہوریؒ (م۔۶۶۰ھ) کی تالیف ''مشارق الانوار'' کی شرح بھی تحریر کی تھی۔(۷)

شیخ محمد یعقوب صرفیؒ (م۔۱۰۰۳ھ) جیسا عالم، مؤلف، شاعر، صوفی اور سیاح کشمیر نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ آپ حدیث میں مجدد الف ثانیؒ کے استاد، اکبر اعظمؒ کے مصاحب اور فیضیؒ و ملا عبدالقادر بدایونیؒ کے دوست تھے۔ فیضیؒ (م۔۱۰۰۴ھ) نے جب قرآن مجید کی بے نقط تفسیر لکھی تو شیخ صرفیؒ نے اس تفسیر ''سواطع الہام'' پر بے نقط مفصل تقریظ لکھ کر خود مفسر کو محو حیرت کر دیا تھا۔ آپ کے فرزند ملا کبیر حسینؒ نے شمائل ترمذی پر عربی میں حواشی لکھے تھے۔ ۱۰۵۵ھ کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔(۸)

صرفیؒ کے بعد تک بھی کشمیر میں عربی زبان کا بڑا رواج رہا، کئی علماء نے تالیف و تصنیف میں حصہ لیا۔ مساجد و مقابر پر عربی اشعار تحریر کئے گئے۔ سری نگر کی ''خانقاہ فیض پناہ'' کی تاریخ تجدید غلام احمد جید نے لکھی تھی۔

جسے غلام حسن کھویہامی نے اپنی کتاب ''تاریخ حسن'' میں نقل کیا ہے۔

"یا اخی اقبل ھذا المسجد
طاعةً باللہ و اسجد واقترب
من بھا الحق والدین دائماً
فیہ فیضان علی من یطلب
بانی الثانی ثناء اللہ بہ
صار ایقاناً باجریر تقب
اوارد ت عام تعمیر الجدید

خانقاہ نقشبندی احتسب(۹)

۱۳۰۴ھ--- ۱۸۸۶ء

کشمیر کے عہد اسلامی میں جو علمی اور ادبی لٹریچر پیدا ہوا اس میں ان تصانیف کا بھی ذخیرہ موجود ہے جو کشمیری علماء اور فضلاء نے عربی ادب میں یادگار چھوڑا ہے۔ یہ ذخیرہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ ان کے مطالعہ سے ہم کشمیر کے عہد اسلامی کی تہذیب و ادب اور ان کے مذہبی مسائل سے آگاہ ہو جاتے ہیں جو اس عہد میں عوام اور علماء کو درپیش تھے یا جن میں وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

<u>مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی نثر نگاری:</u> شیخ محمد یعقوب صرفیؒ کے بعد خاک کشمیر نے جو جامع علوم اور نابغۂ روزگار فرزند تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں پیدا کیا وہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہیں۔ ان کی ذات محتاج بیان نہیں۔ سچ پوچھئے تو مولانا موصوف نے عربی ادب کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ آپ سے پہلے ادب کا کمال اسی میں سمجھا جاتا تھا کہ جن تصانیف و تالیفات کو متقدمین نے پیش کیا ہے انھی پر حاشیہ اور تخریج کی جائے اور ان کی روش سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی ادب اور عربی میں ایک قسم کا جمود و تعطل پیدا ہو گیا۔ انور شاہ کشمیریؒ وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی نادر اور انوکھے خیالات جدید اسلوب میں پیش کر کے اہل ذوق کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

آپ کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے، فلسفی، عالم دین، صوفی شاعر و ادیب کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ذہانت و فطانت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ۱۳۴۸ھ میں علامہ اقبالؒ سے لاہور میں ملاقات ہوئی، انھوں نے آپ سے فلسفہ کے کئی مباحث میں استفادہ کیا تھا۔ (۱۰)

آپ نے فارسی، و عربی میں کئی تصانیف و تالیفات کے نادر نمونے چھوڑے ہیں۔ ان کا تفصیل سے تذکرہ ''تصنیفات و تالیفات'' کے عنوان کے تحت آئے گا۔

حالات کی تبدیلی، اقتصادی مجبوریوں اور انگریزی زبان کے رواج نے کشمیر میں

عربی زبان وادب کونقصان پہنچایا ہے لیکن عربی زبان مسلمانان ہند کی مذہبی وروحانی زبان ہے اس لیے آج بھی کشمیر اور پورے برصغیر پاک وہند میں ہزاروں عربی مدارس قائم ہیں اوراب بھی یہاں علماء کی کمی نہیں ہے۔

علامہ کشمیریؒ اور شعر گوئی: مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اپنے وقت کے جلیل القدر علماء اور مسلم الثبوت شعراء اور صوفیاء میں سے تھے جنھوں نے اپنی شعر گوئی کا سکہ غیر کشمیری شعراء کے دلوں پر بٹھایا ہے۔ یہاں کی عربی شاعری کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان میں تصوف، اخلاق، مرثیہ، نعت، تقریظ اور حکمت قابل ذکر ہیں۔ فلسفیانہ شاعری میں آپ کا مقام نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں عربی شعراء میں ممتاز ہے۔ کشمیر کی سرزمین اگرچہ مناظر فطرت سے بھری ہوئی ہے مگر یہاں عربی شاعری میں اس کا اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

جس طرح آپ کو ہندستان کے مشہور ومعروف فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین میں ممتاز مقام حاصل ہے اسی طرح عربی شعر گوئی میں بھی آپ اس فن کے گنے چنے فضلاء میں سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد فاروق کہتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم۔ اے کے نصاب میں آپ کا ایک مشہور عربی قصیدہ بھی شامل تھا۔ (۱۱)

علامہ کشمیریؒ فطرۃً ادیب واقع ہوئے تھے، ان کے والد کے علاوہ ان کے اسلاف میں بھی کچھ حضرات فارسی میں شعر کہتے تھے گویا آپ کو شعر گوئی کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ پھر ابتدائی زمانۂ طالب علمی میں انھیں جس استاد کے سامنے بیٹھنا پڑا وہ کشمیر کے نہ صرف نامی گرامی شاعر تھے بلکہ فن شعر کے ماہر نقاد اور نکتہ دان سمجھے جاتے تھے۔ ہماری مراد محمد جو جندل ہے جس نے آپ کو فارسی میں انوریؔ کا ثانی بنا دیا۔ (۱۲)

جب آپ دیوبند پہنچے تو وہاں آپ کی توجہ فارسی واردو سے زیادہ عربی ہی کی طرف رہی اور آپ کے ذوق شعر گوئی میں پختگی آئی یہاں تک کہ زندگی کے آخری دور تک ان کی شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ کی صدر مدرسی کے زمانہ میں مولانا اعزاز علیؒ کی نگرانی میں ایک مجلس شعر " نادیۃ الادب " کے نام سے قائم تھی۔ اس کے اجلاس ہر جمعہ کو نودرہ کی

عمارت میں ہوتے۔ آپ اس کے مشاعروں میں حصہ لیتے اور اپنا کلام ترنم کے ساتھ سناتے تھے۔ (۱۳)

اس زمانے میں آپ نے جو اشعار کہے ہیں وہ اپنی ادبی لطافت اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے قبل عہد اسلام کے شعراء کے کلام سے ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ مصر کے ایک عالم شیخ علی دارالعلوم دیوبند آئے، ایک طالب علم مولوی محمد یحییٰ یمنی نے ایک دن ان سے کہا کہ یہ لوگ علوم وفنون میں فائق الاقران ہیں۔ شیخ علی حنبلی نے کہا: یہ بات میں ماننے کے لیے تیار نہیں ''ہم اعجام'' بھلا یہ لوگ اہل عرب کی طرح کیسے فصیح ہو سکتے ہیں، یہ بے چارے تو عجمی ہیں۔ اس کے بعد ان کو مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک عربی قصیدے کو پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی وفات پر لکھا تھا۔

یہ چالیس ابیات پر مشتمل ہے (۱۴) مصری عالم نے اس مرثیہ کو پڑھنے کے بعد کہا " انی تبت من اعتقادی" میں اپنے نظریے سے توبہ کرتا ہوں، اس مرثیے میں تو جاہلیت کی شاعری کی مہک آرہی ہے۔ (۱۵)

مولانا انوریؒ نے اس مرثیہ کے ابیات کی تعداد چالیس لکھی ہے جو صحیح نہیں۔ یہ ۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔

روزنامہ ''الجمعیۃ'' آپ کے متعلق لکھتا ہے:

> ''مولانا انور شاہ کشمیریؒ عربی شاعری کا ملکہ رکھتے تھے اگرچہ صاحب دیوان شاعر تو نہیں ہیں تاہم کافی منظوم کلام مختلف جریدوں میں محفوظ ہے۔'' (۱۶)

آپ کو عربی زبان اور شعر و ادب پر اس قدر عبور تھا کہ کئی بار فی البدیہہ علمی تقریریں کیں اور قصائد لکھے۔ نظام حیدر آباد ۱۹۲۷ء میں دہلی آئے تو اخبار ''مہاجر'' کی فرمائش پر ایک طویل قصیدہ ارتجالاً کہا جو ''مہاجر'' کی اشاعت ۲۱/ دسمبر ۱۹۲۷ء میں موجود ہے۔

بہار میں ''گیا'' کے مقام پر ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ ہوا۔ علامہ انور شاہ صاحبؒ نے بھی شرکت کی، انھوں نے ایک دوست کی درخواست پر بیٹھے بیٹھے ایک طویل عربی قصیدہ تیار کیا اور اسے جلسہ میں پڑھ کر سنایا۔ یہی قصیدہ ماضی قریب میں مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم۔اے عربی کے نصاب میں شامل تھا۔نظم کی ابتداء میں ایک خطبہ ہےاور خطبہ بھی منظوم عربی میں ہے جس کے بارہ اشعار ہیں ان میں پہلا شعر یہ ہے ؎

الـمـلك لـلـه رفيـع الشـأن
ذی الـطـول و التـصـريف فـی الأزمـان (۱۷)

اس کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے جو اڑتالیس اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں اہل فرنگ اوران کی اسلام دشمنی پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔علاوہ ازیں اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کی تعریف بھی ہے اس وقت تک موصوف نے بھی الحاد اور وطن پرستی کو گلے نہیں لگایا تھا۔عالم اسلام اور بالخصوص ہندوستان کے مسلمان خلافت کے قیام و بقاء کے لیے کمال پاشا کی سخت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ابتدائی اشعار یہ ہیں ؎

او مـا تـریٰ لـمـا عـدت عـن طـور هـا
غـدارة اليـو نـان و البـريـطـان
حتـی غـدوا لایـؤمـنـون لـربـهـم
و تـنـصـلـوا مـن خـلـقـة الانـسـان
فـاز داد شـرفـی البسيـط منـهـم
مـا كـان يحكی منذ جنكر خان (۱۸)

<u>شعر گوئی کے ساتھ مناسبت</u>: شعر گوئی کے ساتھ ان کی طبعی مناسبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں شعرائے متقدمین کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے،ان کی عادت تھی کہ عربی زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے عربی شعر کو پیش کرتے تو بیس بیس پچیس پچیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار والی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے۔(۱۹)

مولانا گیلانی اپنے مقالہ ''شاہ صاحبؒ کی درسی خصوصیات'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی۔''

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ نے اپنی کتاب ''مولانا انور شاہؒ کی حیات اور علمی کارنامے'' کے صفحہ ۸۵ پر ان کے اشعار کی تعداد پندرہ ہزار سے زائد لکھی ہے جو درست نہیں۔

کلام میں غیر مانوس اور رکیک الفاظ کا استعمال نہیں ہے، حسن ادا، سلاست، انسجام اور الفاظ کی بندش ان کے اشعار کی خاص خصوصیت ہے۔ ''فصل الخطاب'' میں محمد بن اسحاق کی ایک حدیث پر بحث کرنا شروع کرتے ہیں تو پہلے فخر کے ساتھ ایک جاہلی شاعر کا یہ شعر لکھتے ہیں:

هل غادر الشعراء من متردم
ام هل عرضت الدار بعد توهم

پھر اس پر اپنا یہ شعر ملاتے ہیں۔

اعياك رسم الدار لم يتكلم
حتی تکلم فاسمعن و تفهم (۲۰)

مدرسہ امینیہ کی صدر مدرسی کے زمانے میں ان کی عمر ۲۲، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی مگر انھی ایام میں ان کا ذوق شعر اتنا پختہ اور بلند ہوتا تھا کہ مولانا ظہیر احسن صاحب شوق نیمویؒ کی کتاب ''آثار السنن'' کی مدح میں عربی زبان میں دو طویل قصیدے لکھے جو ہندوستانی عربی شاعری میں عمدہ نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مولانا نیمویؒ نے ان قصائد کو اس سرخی کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے "هذه قصيده فی مدح المؤلف للعلامه الاديب و الفاضل اللبيب، مولانا محمد انور شاه الكشميریؒ۔" (۲۱)

پہلا قصیدہ پچیس اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

رويت طبت نفساً فی ارتوائی
وعدت فاز دری ماء السماء
يحيی ذا المناقب و المعالی
شريف المجد غطريف العلاء
سنا علم الحديث كثير حفظ

و راویۃ الزمان بلا امتراء

فذا هو رحلۃ الآفاق طراً

و حافظ عصرہ اهل اقتداء

و عمدۃ قاری و ارشاد سار

و فتح المغلقات علی وفاء

ظهیر الحق مولانا ظهیر

اضاء الارض فی نور اهتداء

دوسرا قصیدہ اکتیس اشعار پر مشتمل ہے اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آلا عم صبا حا ایها العصر الخالی

تنورت فیك النور من جبل عال

حدیث حیوۃ بعد ما کنت ما فیا

وجذوت تجدیداً علی عمر بال

وهما اقلب عینی تبست

تبا ثیر تبشیر علی الحزن البال

آثار السنن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قد جاء بالآثار للناس روایا

عن النور عن فیض عن القال عن حال

فدونك سفراً مسافراً بالشوارق

ونوراً علی نور باطول اذیال

سداہ حدیث و الفقاهة لحمه

نسیج علی وجد بابدع منوال

وتعلیقه مثل المطر ذالمذهب

معانیه اعلام باتقان اعمال (۲۳)

کلام میں فقہ حنفی کے بعض ضوابط و معارف، حدیث، مدح و ہجو، باکار ادب، حکمت اور امثال کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ نظم، قصیدہ، نعت، مرثیہ، قطعہ وغیرہ ان کی شاعری کی خاص اصناف ہیں۔

کمیت کے لحاظ سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی شاعری: آپ کی شاعری عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہے اردو میں ان کی نظمیں "صاحب نگارستان" نے جمع کی ہیں۔ فارسی میں نعت اور مرثیہ سے متعلق کئی دلآویز قصائد ہیں تاہم مقدار کے لحاظ سے یہ کم ہیں، عربی زبان میں کافی شعر کہے ہیں اور وہ مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری اپنے مضمون "کشمیر میں عربی شاعری" میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر حامد علی خان کو علامہ کشمیریؒ کے ۷۴۶ اشعار ملے ہیں مگر ان کو سارے اشعار حاصل نہیں ہوئے ہیں، ان کا شعری سرمایہ مخفی اور منتشر ہے تاہم جو کچھ ملتا ہے وہ ہزار اشعار سے کم نہیں ہے۔" (۲۴)

ڈاکٹر رضوان اللہ اور مولانا انظر شاہ مسعودیؒ نے آپ کے عربی اشعار کی تعداد گیارہ سو پچپن بتائی ہے جن میں بارہ نظمیں، بارہ قصائد، تین نعت، مرثیے و قطعات وغیرہ شامل ہیں۔

۱۔ "فصل الخطاب" کے آخر میں تین صفحات پر مشتمل مرثیہ شیخ الہند ہے۔ اسی طرح درمیان میں بھی دو، دو، چار، چار اشعار کی صورت میں مختصر نظمیں ہیں۔

۲۔ "اکفار الملحدین" میں ایک طویل اصلاحی نظم ہے جو صفحہ ۱۰۸ سے لے کر صفحہ ۱۱۲ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ نظم ۷۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ نے اس نظم کے اشعار کی تعداد ۷۰ لکھی ہے جو درست نہیں ہے۔ اس کی اردو شرح مولانا محمد ادریس سکروڈویؒ نے آج سے کافی مدت قبل ایک رسالہ کی شکل میں لکھی تھی جو "صدع النقاب عن جساسة الفنجاب" کے نام سے ۱۳۴۲ھ میں مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوئی تھی۔

اس رسالہ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"اس رسالہ میں حضرت ممدوح نے ایک قطعہ انجازیہ نظم فرمایا ہے...... احقر نے اس قطعہ کو باضافہ چند اشعار اور بہ تکمیل حوالہ جات...... مع ترجمہ

......اشعار کے علیحدہ کر کے چھپوایا۔‘‘(۲۵)

۳۔’’رسالہ کشف الستر‘‘ کے آخر میں گیارہ اشعار کی نظم ہے جس میں جاہلی شاعری کی فصاحت و بلاغت کی بُو آتی ہے۔ کتاب عقیدۃ الاسلام میں بھی ان کی عربی و فارسی نظمیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک عربی نعت بھی ہے جو ۲۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نعت ۲۷/رجب المرجب ۱۳۴۳ھ/۲۲/فروری ۱۹۲۵ء میں روزنامہ ’’سیاست‘‘ میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ؎

تبارك من اسریٰ و اعلیٰ بعبده
الی المسجد الاقصی الی الافق الاعلیٰ
الی سبع طواق الی سدره كذا
الی رفرف ابهیٰ الی منزلة اخریٰ (۲۶)

۴۔’’مشکلات القرآن‘‘ میں آیت مبارکہ ”انك لا تسمع الموتی“(۲۷) کی شرح گیارہ عربی اشعار میں بیان کی ہیں جو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔

۵۔’’رسالہ ضرب الخاتم علی حدوث العالم‘‘ از اول تا آخر عربی اشعار میں لکھا ہوا ہے۔ اشعار کی تعداد ۲۴۶ ہے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ نے اس رسالہ کے اشعار کی تعداد چار سو (۴۰۰) لکھی ہے، جو غلط ہے۔

۶۔ فیض الباری میں بھی مولانا انور شاہ کے بہت سے اشعار موجود ہیں۔

مضامینِ اشعار

عنوان اور اصناف کے لحاظ سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی شاعری میں اتنا تنوع ہے کہ ممدوح ایک مشاق اور ماہر فن شاعر کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان مضامین میں مرثیہ، قصیدہ، نعت، مناجات، فلسفہ و کلام، تصوف، فقہ، تقریظ اور تبلیغ و اصلاح وغیرہ سب شامل ہے۔ ہم چند ایک مضامین پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

ا۔ فلسفہ و کلام

پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں لکھا ہے :

''اردو میں تنقید کا وجود اقلیدس کے نقطۂ موہوم یا شاعر کے محبوب کی کمر کی طرح ناپید ہے اگر یہی بات برصغیر پاک و ہند میں فلسفہ و کلام کے عربی منظوم کلام کے بارے میں کہی جائے تو شاید بے جا نہ ہوگی''۔

برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے جس شخص نے منظوم کلام اس موضوع پر عربی میں پیش کیا ہماری تحقیق کے مطابق وہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ہیں۔ آپ نے جدید و قدیم فلسفہ و علم الکلام کا مطالعہ کیا اس کو ایک چابک دست معمار کی طرح اپنی عربی شعر گوئی کی عمارت میں بطور مسالہ کے بخوبی استعمال کیا ہے۔ کم از کم برصغیر میں انور شاہؒ پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے اپنے منظوم رسالہ میں فلسفہ اور علم الکلام پر بحث کی ہے۔ فلسفہ و کلام کی افادیت، عدم افادیت، اس کا قومی و مذہبی اخلاق سے تعلق، فلسفہ و کلام کے حسن و قبح کے اسباب، قدیم فلسفہ و کلام پر تنقید، جدید فلسفہ و کلام کی ضرورت، اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے جدید سائنسی اکتشافات و جدید فلسفہ و کلام کی اہمیت بعض مسلمان فلاسفہ کی غلطیوں پر زبردست تنبیہ وغیرہ وہ بحثیں ہیں جنھیں عربی نظم میں سب سے پہلے مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے رسالہ " ضرب الخاتم علی حدوث العالم " میں چھیڑا ہے۔ ان خصوصیات نے فلسفہ و کلام پر منظوم عربی لٹریچر میں مولانا موصوف کو تقدم کے ساتھ ساتھ مجتہدانہ حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کے شیخ الاسلام مصطفی صبری نے اس رسالہ کو دیکھ کر جو تاثرات بیان کئے انھیں مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے لکھا ہے کہ شیخ موصوف نے کہا:

" انی أفضل هذه الوريقات على هذا الكتاب الأسفار الاربعة "۔ (۲۸)

اس رسالہ کے پہلے دو اشعار یہ ہیں ۔

تعالى الذى كان ولم يك ما سوى
واول جلّى العماء بمصطفىٰ

و سلسلة الاسباب سلسله هوت

بها ربطوا شيئاً فشيئاً الى المدىٰ (۲۹)

اس رسالہ میں تقریباً ہر شعر کے ساتھ ان کتابوں اور ان کے صفحات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جن سے شعر کا مواد اخذ کیا ہوا ہے ان حوالہ جات سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی بے مثال قوت حافظہ اور استحضار کے علاوہ کئی صفحات کا نچوڑ ایک عربی شعر میں ادا کرنے کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً

فایجاده فعلٌ وجوبیٌّ استين

وتعليقه بالشرط امكانه اتىٰ (۳۰)

اس شعر میں صدر شیرازیؒ کی ''اسفار الاربعہ'' کے پندرہ صفحات [۴/۸۹ ۳/۲۶، ۲۷، ۳/۱۵۳، ۱/۳۰۰، ۱/۱۴۴، ۱/۱۵۴، ۱/۲۶۸، ۴/۱۱۵، ۴/۲۸ ۱/۱۹۷، ۱/۲۸، ۱/۳۱۸، ۱/۲۲، ۱/۵۶] کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ایک فلسفیانہ نظم وہ بھی ہے جو انھوں نے حافظ ابن قیمؒ کے مشہور قصیدہ نونیہ کے ضمیمہ کے طور پر لکھی ہے اور قافیہ انھی کا اختیار کیا ہے۔ اسی طرح رسالہ ''مرقاۃ الطارم'' گو عربی نثر میں ہے مگر اس میں بھی انھوں نے عربی اور فارسی میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک نظم وہ بھی ہے جو ''ضرب الخاتم'' کی زمین میں لکھی گئی ہے اور اس کا موضوع بھی ''حدوث عالم'' اور ''قدوم'' ہے۔ اس نظم کو اگر ''ضرب الخاتم'' کا ضمیمہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

ایک دوسری صرف چار اشعار والی نظم یہ ہے ؎

سبحان من كل الورىٰ برهانه

ان ليس شان ليس فيه شانه

والكون طرا من تجلى فعله

خلقاً و امراً ثم ما عنوانه

فوجوده هو واقع اذغيره

القاه فى عدم الورىٰ امكانه

فـمـــا لـــه طرف و سـائر خـلـقـه

فـى ظـرفـه الـعـدم اقتضى فقدانه (۳۱)

اس رسالہ میں آپ کی دو فارسی نظمیں بھی ہیں۔ پہلی نظم آٹھ اشعار کی ہے، اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ۔

آں چیـز کـه از حـضـرت تـقـدیس نشاید

از واسـطـهـا آمده ایں چیست چناں است

ایـجـــاب واراده قـدم و نیـز حـدوثے

مـادیـت و تـجـرید که تقسیم چناں است

دوسری نظم ۳۷ اشعار کی ہے اس کا عنوان ''اشعار فارسی متعلق بہ حدوث عالم'' ہے۔ اس نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ۔

ازجـهـات پـا نشرده گـانـه زعـالـم دیده باش

بـارگـاه حـضـرت حق رے ہمام مستهام

از حـدوث امـکـان افول و قوت و حرکت نگر

تا کمال و حکمت و تخصیص و توحید و نظام (۳۲)

۲) نعت: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو جو فریفتگی و شیفتگی تھی اس کا اندازہ ان کو ہوگا جنھوں نے فتنۂ قادیانیت کے خاتمے اور ختم نبوت کے تحفظ کے لیے ان کا اضطراب دیکھا ہوگا۔ آپ وقتاً فوقتاً عربی اور فارسی میں بارگاہ رسالت میں نعت کی صورت میں ہدیہ پیش کرتے تھے۔ فارسی نعت میں آپ کی ایک مشہور نظم ''عقیدۃ الاسلام'' میں ہے۔ یہ نظم سولہ اشعار کی ہے جس میں حدود شریعت کے ساتھ عشق کی سرمستی اور پاس ادب کے دوش بدوش فرط اشتیاق کا حسین منظر اپنی بہار دکھاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنا ہدیہ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں ۔

اے آنـکـــه ہـمـــه رحـمـت مـهـداۃ قـدیـری

بـاراں صـفـت و بـحـر سمت ابر مطیری

معراج تو کرسی شده و سبع سماوات
فرش قدمت عرش برین سدره سریری
بر فرق جہاں پایۂ پائے تو شده ثبت
ہم صدر کبیری وہمہ بدر منیری
ختم رسل ونجم سبل صبح ہدایت
حقا کہ نذیرے تو والحق کہ بشیری (۳۳)

عربی قصائد میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ایک طویل نعت اپنی ادبی لطافت، متین خیالات اور عمیق جذبات کے لحاظ سے عربی نعتیہ شاعری میں ذروۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ اس نعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ولم یکن للشیخ قدس سرہ غیر ھذہ الیتیمة الحسناً لکفی دلیلاً علی أنه وصل الی قصاری منازل الشعر" (۳۴)

ترجمہ..... ''اگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقط یہی ایک دُرّ بے بہا نعت کہی ہوتی تو بھی یہ اس بات کے لیے کافی وافی ثبوت ہے کہ حضرت ممدوحؒ شعر گوئی میں کمال کی آخری حد پر پہنچے ہوئے تھے''۔

یہ نعت اشعار پر مشتمل ہے۔ ہم چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں۔

برق تألق موھناً بالوادی
فاعتاد قلبی طائف الأنجاد
أسفاً علی عھد الحمی و عھادہ
تولی علی الابراق والارعاد
رھم تناوح تارةً دیم لھا
حتی غدا الایام کالأعیار
ھب النسیم علی الربا متضا حکت
بشری العمید عرارھا و الجادی
لعبت صباھا الشمال و تارةً

لعب الغصون بعطفها المیّاد (۳۵)

آگے کہتے ہیں :

أنا فی امان من دآدی حیرة

ولی اهتداء بالنبی الهادی

شمس الضحیٰ بدر الدجی صدر العلی

علم الهدی هو قدوة للقادی

سهل العریکة أکرم العرب الألی

خیر العباد و خیرة العباد (۳۶)

نعت کا اختتام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلواۃ وسلام سے کرتے ہیں۔

ثم الصلواۃ مع السلام علی النبیب

ی و آله مع صحبه الأمجاد

ایک دوسری نعت میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے شیخ سعدیؒ کا تتبع کیا ہے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ نے اس کا ماخذ مولانا موصوف کا رسالہ ''ضرب الخاتم'' ص ۱۶ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، وہاں اس نعت کا نام بھی نہیں ہے، ہم اس کے یہ اشعار بحوالہ برھان سے نقل کررہے ہیں۔ اس نعت کے دو شعر یہ ہیں۔

شفیع مطاع نبی کریم

قسیم جسیم نسیم وسیم

غیاث الوری رستغاث الهضیم

احید وحید مجید حمید (۳۷)

روضۂ اقدس کے سامنے اشکباری: مولانا انور شاہ صاحبؒ جب حج کرنے گئے تو روضۂ انور کے سامنے کھڑے ہوکر ایک سادہ مگر اخلاص سے بھرپور نعت پڑھی۔ اس نعت کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا مصرع عربی میں ہے اور اس کے گیارہ اشعار ہیں۔ یہ نعت ماہنامہ دارالعلوم میں چھپی ہے وہاں سے پوری نظم نقل کررہے ہیں۔

اے صبا حالم رساں نزد رسول
از مآلی نحو موتی قد یأول
اگرچہ از تر دامنی ختم ولے
علی ان اردی اذا ھبت قبول
چوگدا ھستم نراند از درھم
انہ لا ینھر الوجہ السئول
نیست غیر از او پناہ این تباہ
ہل سواہ الکھف للعامن لجھول
ذیل فضلش سائر عاصی شود
قد نجا من نال اطراف الذیول
چوں ز دامنش نہ بردرم و دوست
لیس اذ ذاتار کالی فی الیسول
کہ کند نومید آخر ھسبت او
رحمۃ للعالمین بالشمول
گرچہ شنایان کرامت نیستم
ان ویل الفضل قدیسفی التلول
گرچہ بد بختم ولے باشد کہ گاہ
دولۃ العاصی باسعاد تبدول
چوں رسیدی انور ابر کوئے او
انك الأتی بخیر فی القفول

رسالہ خاتم النبیین میں بھی فارسی زبان میں ایک طویل نظم ہے جس کے ۷۱ اشعار ہیں۔ اس کے پہلے دو شعر درج ذیل ہیں ۔

گفتمت حرف راستی و دوسنت
ہاں کہ در رھروی نمانی سست

نگذاری مرا بہ در دم فرد
زانکه این دین واحد من تست (۳۹)

ایک اور نعت ''مربعہ نعتیہ فارسی'' کے عنوان سے رسالہ انوار العلوم میں شائع ہوئی ہے، اس کے ۱۳۸ اشعار ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں نذرانہ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں ۔

دوش چوں از بے نوائی ہم نوائے دل شدم
عہد ماضی یاد کردہ سوئے مستقبل شدم
از سفر دامانده آخر طالب منزل شدم
کزتگاپو سو بسو شام غریباں در رسید

آگے عرض کرتے ہیں ۔

سید عالم رسول و عبد رب عالمین
آں زماں بودہ نبی کآدم بداند ز ماء وطین
صادق و مصدوق وحی غیب وما مون و امین
در ہر آں چیزے کہ آورد ست از وعد و عید (۴۰)

۳) تصوف یا روحانی مسائل: مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جس طرح فلسفہ کے کچھ مہمات مسائل عربی اور فارسی اشعار میں بیان کئے ہیں اسی طرح تصوف اور احسان نیز فوق العقل مباحث سے متعلق چند مسائل کو بھی منظوم عربی و فارسی زبان میں پیش کیا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ قضاء وقدر کا بھی ہے۔ اس پر آپ نے ایک نظم لکھی ہے جو ۱۹ اشعار کی ہے یہ نظم مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے اپنی کتاب ''ترجمان السنۃ'' میں نقل کی ہے، اس کے دو شعر یہ ہیں ۔

ایا صاحبی ان اکلام بقدر تك
طویل و تحریر الخلاف یطول
ولا یستوی المیزان الأ بحقلة
تفوت بادنی میله فیعول (٤١)

اسی طرح ایک فصیح و بلیغ نظم ''سماع موتی'' سے متعلق ہے۔ سماع سے مراد سماع ارواح ہے۔ انبیاء کا قبروں میں نماز، روزہ کا پابند رہنا بھی ارواح کے اعمال سے متعلق ہے۔ ہم ۱۳ اشعار پر مشتمل نظم کو من و عن نقل کرتے ہیں ۔

سماع موتی کلام الخلق قاطبة
قد صح فیه لنا الآثار فی الکتب
وایته النفی فی نفی انتفاعهم
لا یسمعون ولا یصفون للادب
فوضح الأمر بالمعروف مند هم
کما تقرر فی الاذهان من عطب
وانه لیس رکن ثم عند هم
کم قد فیه تشبیه لمطلب
فذلك الامر نفس الامر فی نظر
به یشبه للتقریر فی نوب
ولما لذاك کلام مفرد نسفا
نعم! باطرافه یبدو لمقتضب
و قد یقال حیاة الخلق فی شغل
صلاتهم و کذکر الرب من رعب
و تلك بعد حیاة الاصل اتة
فوجه السمع الافعال من ارب
و کل عرف اتا ما کان من لطف
ولو یکون انتزاعیاً فمن عجب
و جریها مثل جری الماء من شبه
کعین حامیة للناظر الارب
و لیس بحزق عند الغیر ظاهرة

اذا هــدیٰ السـمـع او عـقـل لـمـطـلـب

واهــل عــرف اذا لـلهيـاة اصـطـلـحـوا

فتـلـك جــری طــلـوع نـحـوه اجــب

كـضـحــرة رفعت فـی هـجـره سـردت

والشـمس قد طلعت من بين ما سجب (۴۲)

۴) مراثی: علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے اساتذہ اور شیوخ پر دل کھول کر مرثیے لکھے ہیں جو جذبات وعواطف سے بلند پایہ لبریز ہیں اور فنی اعتبار سے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص جو رثائی قصائد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور مولانا محمود حسنؒ کی یاد میں کہے ہیں وہ فصحائے عرب کے مراثی کے ہم پایہ ہیں۔ انھوں نے ان میں اپنے ممدوحین کے فضائل وکمالات اور ان کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ مادح اور ممدوح کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

ا۔ حضرت رشید احمد گنگوہیؒ (م۔۱۳۲۳ھ) کے مرثیہ کا مطلع یہ ہے ؎

قفايا صاحبی عن السفار　　　بمرأی من عرار أو بهار

آگے لکھتے ہیں ؎

أتـــا بـعـهـم و يـمـلينـی دموعـی

حـديثـی مـن شيـوخـی لادكــار

أجــلـهــم و أبــجــلـهـم مـقــامـاً

أبـــو مسـعــود هــم جبـل الــوقــار

امـــــام قـــدوة عـــدل أمـيـــن

و نـــور مستبيـــن كـــالـــمــدار

اليـــه الـمـــنتهـی حـفـظـاً و فـقـهـاً

و أضـحــی فـی الـروايـة كـالـنـهـار

فـفـي التـحـديـث رحـلة كـل راوِ
و فـي الأخبـار عـمـدة كـل قـاري
فـقيـه الـنـفـس مـجتهـد مطـاع
و كـوثـر عـلـمـه بالخير جاري (۴۳)

۲۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م۔۱۲۹۷ھ) کے مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

قـفـا يـا صـاحبـي عـلـى الـديـار
فـمـن دأب الشـجـي هـو از ديـار
و عـدجـا بـالـربـاع أنـس
فـفـي الـمـرأى لشيء كـاصـطبـار
وان عـادت دوارس بـعـد هـجـر
فـقـد كـانـت معـاهـد لـلـمـزار
و ذلك قـاسـم البـركـات طـراً
يسيـر بـذكـره تـال و قـاري
متـى مـا جـنـت تستسقيـه قطـراً
تـجـد بـحـراً يـطـم على البحار (۴۴)

۳۔الشیخ محمود حسنؒ (م۔۱۳۳۹ھ) کی وفات پر لکھے گئے مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

قـفـا نبك مـن ذكـرى مـزار فـنـد معـا
مـصيـفـاً و مشتى ثـم مرآى و مسمعـا
نهـضـت لأرثـي عـالـمـاً ثم عـالمـاً
حـديثـاً فـقـهـاً ثـم مـاشـئـت أجمعـا
وهـديـاً و سـمـتـا سنة و جـمـاعة
وخـلـقـا و خـلـقا مـا أنـاف و أوسعـا
وعـزمـاً و حـزمـاً حـكـمـةً و اصـابة
وزهـداً و تـقـوى كـان أروع أورعـا

كبيراً ينادى فى السماوات أمةً
امام الهدى شيخاً أجل و أرفعا
تصدّى لظل العرش فى عدن ربه
و مقعد صدق قد دعاه فأسرعا (۴۵)

مولانا انور شاہ صاحبؒ نے اپنے ممدوح کے لیے فارسی میں بھی ایک مرثیہ لکھا ہے یہ مرثیہ قریشی محمد اقبال نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

دیدہ دیدہ خیرہ ماند دیدہ فکر و قیاس
حلقہ درسش نما ند حلقہ ارشاد نیست
خواندہ باشی آں عزیزاں را نشان دیگراست
ہر کس آخر چوں رشید و قاسم و امداد نیست
کم کسے باشد کہ باشد مثل معروف جنید
ہر اسمے حاتم و ہر شاد چوں ممشاد نیست
کہ بگو " استاد مابا رحمت اللہ علیہ "
زاد ماباد اد راں روزے کہ ماراز اد نیست (۴۶)

۴۔ مرثیہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ: یہ مرثیہ ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوا تھا۔ مطلع یہ ہے:

امما دهاك الامر تذرى و تدمع
فهل فى بكى من مفزع لك مفزع

ترجمہ: کیا اس حادثہ جان کاہ کے پیش آجانے کی وجہ سے تیرے آنسو بہ رہے ہیں کیا ملجا و ماویٰ کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے کوئی ٹھکانہ مل سکتا ہے۔
پھر فرماتے ہیں ۔

ومن ثم مثل الشيخ يهدىٰ و يهتدى
مولى الورى عبدالرحيم فاقنع

ولـــی رضـــی سیـــرۃً و ســـریـــرۃً
صـــفـــی و فـــی ثـــم ارضـــی و اطـــوع

آخری شعر ہے۔

ســقـــی الـلـــه مثـواه بـــارعـــی کـــرامۃٍ
و سـقـــی و رعـی منه اولـی و انفـع (۴۷)

۵) تجدید واصلاح: علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے زمانے میں اصلاح وتجدید کے نام سے بہت سی گمراہ کن تحریکیں وجود میں آئیں۔سیاست وقت بھی سخت اضطراب اور ہیجان کا شکار تھی۔قادیانی فتنے نے مولانا ممدوحؒ کو خاص طور پر پریشان کر رکھا تھا۔وہ تقریر وتحریر میں مسلمانوں کو اپنے دین کی حفاظت و دشمنان دین کی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے۔جب جذبات غالب تھے تو شعر کے ذریعے سے سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگاتے تھے۔اس سلسلہ میں ان کی ایک نظم ''اکفار الملحدین'' میں موجود ہے۔اس نظم کو ان کی چند معرکۃ الآراء طویل نظموں میں شمار کیا جاتا ہے،انھوں نے اپنے ہی وطن میں برطانوی استعمار کی گود میں مرزا غلام احمد قادیانی جیسے جھوٹے مدعی نبوت کے ہاتھوں قبائے ختم نبوت کو تار تار ہوتے دیکھا اور اس پر عام مسلمانوں کی بے حسی اور بے اعتنائی کو بھی ملاحظہ کیا تو مولانا انور شاہؒ جیسا حساس اور باغیرت دل رکھنے والا انسان تڑپ اٹھا۔اور قوم کے سامنے اپنا دردمندانہ پیغام پیش کیا اور اس جھوٹی نبوت کے دجل وفریب سے مسلمانوں کو آگاہ کیا،ان کی غیرت ایمانی کو بیدار کیا اور انھیں اس فتنہ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے میدان عمل میں لائے۔اس نظم نے پوری مسلم سوسائٹی کو متاثر کیا ہے۔انھیں بیدار کیا اور اپنے آقائے نامدار نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کی حفاظت کے لیے ایک مرکز پر جمع کرنے کا کام انجام دیا ہے۔یہ نظم مرزا قادیانی کے جھوٹے اور بے بنیاد دعووں کی کھلی تصویر بھی ہے اور اس کے خلاف مسلمانوں کے لیے دعوت عمل بھی۔شاعر اپنی قوم سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

الا یـــا عبـــاد الـلـــه قـومـوا و قـوّمُـوا
خـــطـــوبـــاً ألـــمّـــت مـــا لهـنّ یـدان

و قد كاد ينقض الهدىٰ و مناره

و زحرح خيرٌ ما لذاك تدان

اس نظم میں شاعر کا خلوص اس کی روح کا سوز دروں اور اس کے قلب کا گداز جھلک رہا ہے۔فرماتے ہیں ؎

يسبُّ رسول من اولى العزم فيكم

تكاد السماء و الارض تنفطران

مندرجہ ذیل اشعار پر غور فرمائیں گے تو یہ محسوس ہوگا کہ ان اشعار کے ایک ایک لفظ میں غیرت دینی ،حمایت اسلام کے لیے جوش و جذبہ اور سرور کائنات کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبات کارفرما ہیں ؎

وحارب قوم ربهم و نبيه

فقوموا لنصر الله اذ هو دان

وقد عيل صبرى فى انتهاك حدوده

فهل ثم داع او مجيب اذان

لعمرى لقد نبهت من كان نائماً

وأسمعت من كانت له أذنان

و ناديت قوماً فى فريضة ربهم

فهل من نصير لى من أهل زمان

دعوا كل امر و استقيموا لما دهىٰ

و قد عاد فرض العين عند عيان (۴۸)

ایک دوسری نظم میں بھی قادیانی دجال اور فتنہ قادیانیت سے باخبر رہنے کی تلقین کی ہے،اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ؎

صدع الصديع و صيحة بالوادى

لمن اهتدى من حاضر أو باد

بـالـقـاديـانـي ذلك الاخـر الـذي
أمسـى زعيـم الـكـفـر والا لحاد (۴۹)

معراج سے متعلق ایک قصیدے کے آخری اشعار میں بھی اس کا ذکر ہے ۔

فـاخـرج الـدهـر وحـي كـاهـنـه
و ذنـب رأس جـنـاه مـن دنبـه
و حـق لـعـن عـلـيـه مـن ازل
وزاد صيتـاً فـزده فـي لـقبـه
و قـد كـنـاه الـزمـان تـعـريـفـاً
بـمثـل تبـت يـدا أبـي لهبـه (۵۰)

۶) تقریظ وتعریف: علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے قدیم شعرائے عرب وفارس یا ماضی قریب کے شعرائے اردو کی طرح اپنی شعر وشاعری کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا اور نہ وہ ان علماء میں سے تھے جو وقت کے امراء ورؤسا کی تعریفوں میں اپنی صلاحیت صرف کرتے ہیں۔ ذاتی منافع اور دنیاوی شہرت کا خیال ان کے ذہن سے دور تھا۔ وہ نہایت غیور اور خوددار انسان تھے۔ البتہ دو واقعات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اول یہ کہ علامہ کشمیریؒ نے شوق نیموی محدث کی کتاب ''آثار السنن'' پر عربی میں دو تقریظیں لکھی ہیں۔ آپ ''آثار السنن'' کی تالیف میں علامہ نیمویؒ کے رفیق عام تھے اور تعجب یہ ہے کہ سالہا سال کی یہ رفاقت صرف تحریر کی حد تک محدود رہی۔ وہ ایک دوسرے کو کبھی بھی بالمشافہ نہ دیکھ سکے۔ علامہ کشمیریؒ نے ''آثار السنن'' کی علمی قدر ومنزلت اور مؤلف کے علم وفضل کے اعتراف میں دو قصیدے لکھے جو مطبوعہ آثار السنن میں شامل ہیں۔ ہم نے ان تقریظوں سے چند اشعار گذشتہ اوراق میں درج کئے ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ علامہ انور شاہ صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمان خان شروانیؒ کے دوست تھے، مولانا شروانیؒ، مولانا انور شاہؒ کے علم وفضل، دینی وعلمی خدمات اور اخلاص و دینداری کے انتہائی معترف تھے۔ دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحبؒ بھی ان کے پختہ علمی ذوق، امارت وریاست میں جذبۂ خدمت دین، علماء اور علمی اداروں کی سرپرستی اور مالی

حوصلہ افزائی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ ایک بار مولانا شروانیؒ دارالعلوم دیوبند آئے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی صدر مدرسی کا زمانہ تھا۔ آپ نے استقبالیہ تقریر میں ایک نظم پڑھ کر سنائی جس میں اس معزز مہمان کی تعریف سے زیادہ دارالعلوم کے مؤقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار ''برھان'' میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ۔

سعد الزمان لو جهك المتهلل   وربما طال المدىٰ فتفضل

چند اشعار کے بعد معزز مہمان سے مخاطب ہو کر واضح کرتے ہیں کہ دارالعلوم کا علم اور مذہب میں اپنا ایک خاص مسلک ہے اور وہ تجدید و اجتہاد سے زیادہ تقلید و اعتدال کا مسلک ہے:

وافيت قوما لا يرون تكلفاً
و يرون حسن العهد لم ينزيل
ترك الزمان قريبهم و بعيدهم
فبقوا جميعاً كالسماك الا عزل
فتراهم لم انا هم فاضل
في زيهم احد به لم يعدل (۵۱)

ایسا ہی ایک قصیدہ کابل کے امیر کے خیر مقدم میں کہا ہے جو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم فارسی زبان میں ہے جس کے چند اشعار مولانا انظر شاہ مسعودیؒ نے اپنی کتاب ''نقش دوام'' میں نقل کئے ہیں ۔

حامی ملت امیر بن الامیر بن الامیر
والی اقلیم دل آں شاہ کیواں پائیگاہ
حبذا وا دارگیتی شہریار دین پناہ
غازی اسلام امیر المومنین ظل الہ
کوکب اوج ایالت ثانی صاحب قران

بندہ درگاہ این بیت سعادت مہر و ماہ (۵۲)

نظام حیدر آباد دہلی آئے تو ان کے اعزاز میں بزبان فارسی علامہ انور شاہ نے ایک طویل قصیدہ لکھا جو "درقدم میمنت لزوم" کے عنوان سے اخبار میں شائع ہوا۔ اس کے چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں :

مرحبا برسر ماضل خدہ آمدہ
جندا آب بقا ابر سخا آمدہ
وصف توظلِ الہی و نظام اسلام
سایہ ات باد ہمیشہ کہ ھما آمدہ
میر عثمان علی خان شہ دین پرورما
مردے از غیب بکارے تو فرا آمدہ (۵۳)

۷) __مخلوط مباحث:__ "شعر من بمدرسہ کہ برد" خسرو کا مشہور طنز ہے مگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے شعر و ادب کی وادی بھی طے کر لی تھی، اگر آپ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوتے تو ہندوستان کے دوسرے آزاد بلگرامی ہوتے۔ آپ کے رسائل و امالی میں دوسرے قصائد کے علاوہ مختلف مقامات پر مختلف موضوعات سے متعلق اور بھی کئی اشعار بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور وہ اپنی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ان سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس سلسلے میں چند نمونے پیش کرتے ہیں:

ا۔ "قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنے" پر بحث کرتے ہوئے یہ اشعار پیش کرتے ہیں ۔

یا من یومل ان یکو
ن لہ سمات قبولہ
خذ بالاصول و من
نصوص لنبیہ رسولہ

نصاً علی مسبب اتیٰ

بالساکت المجھولہ

دع ما بفوتك وجھہ

بالبین المنقولہ (۵۴)

۲۔ایک روایت کو اس طرح نظم کیا ہے۔

قال ابن سعود کلاماً قدحکا

ہ الدارمی عنہ بلا نکران

ما عندہ لیلٌ یکون والا نھا

رقلت تحت الفلك یوجد ذان

نورالسموات العلی من نورہ

و الارض کیف النجم والقمران

من نور وجہ الرب جل جلالہ

و کذا حکاہ الحافظ الطبرانی (۵۵)

۳۔رفع یدین اور عدم رفع یدین کی بحث میں کوئی بھی مسلک اختیار کرنے کو درست قرار دیتے ہیں اور اس قسم کے فروعی اختلافات کی اہمیت وحیثیت ان صرفی نحوی اختلافات سے سمجھاتے ہیں جو بصرہ اور کوفہ کے فضلائے نحویین میں مشہور تھے۔ادب اور ظرافت سے بھرے ہوئے یہ اشعار درج کئے جاتے ہیں:

اذ کان فی أمر وجوہ عدیدۃ

فخذ بالذی ترضی و أخبر بہ کذا

دع اللحن فی الاعراب ثم انح نحوھم

الی کوفۃ أو بصرۃ حیثما تری

تنازع فعلان فان شئت اعملن

لاول اوثان و ذاك علی سویٰ

ولو انما تسعی لصوب مصوب

كـفـاك ولـم تـطـلـب قليل من الـرضـي
ومـن عـامـلـين مـعـنـوى وغيـره
يـجـوز لهـم خـفـض و رفـع كـمـا أتـي
فـان شئـت فـا نـصـب ايديـاً لاستكـانة
و ان جئـت بـالاسـكـان فـالاصل فـي البنـي
وان رمـت اظهـاراً لـلـحـرفيـن فـاعتـمـد
وان سئـت ادغـامـاً فـفـي الجنـس يرتضيٰ (۵۶)

۴۔جناب محمد اقبال قریشیؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں :

''علامہ کشمیریؒ نے سنایا تھا کہ مغل بادشاہ عالمگیر کا ایک ہندو منشی تھا جس نے ایک مرتبہ غبن کے جرم کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اس کی آنکھیں نکلوادی گئیں۔

اس ہندو منشی نے نابینا ہونے پر ایک بے نظیر قطعہ کہا ہے ۔

بسیار گفتم نفس دنی را
نـا کـرده بـایـد نـا کردنی را
نشنید از من ایں نفس کافر
تـادیـد آخر نـادیدنی را (۵۷)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فارسی میں بھی کافی جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ کے فارسی اشعار کی تعداد تیرہ سوچھبیس (۱۳۲۶) ہے جن میں پانچ نظمیں، تین نعتیں، ایک قصیدہ، تین قطعات اور کچھ خصوصی مواقع پر کہی ہوئی تاریخیں ہیں۔(۵۸)

اردو ادب

یوں تو علامہ انور شاہ کشمیریؒ عربی کے بے نظیر ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن اردو ادب میں بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ ہم آپ کی زبان اور طرز بیان کے نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انھوں نے ملک پر صدیوں حکومت کی۔(۵۹)

۲۔شعبان ۱۳۴۶ھ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ مفتی عزیز الرحمانؒ کے ساتھ مدرسہ اشرفیہ راند پور ضلع سورت کا سالانہ امتحان لینے کے لیے گئے۔آپ نے اپنے تاثرات مدرسہ کے بارے میں اس طرح لکھے :

"حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے پاس جملہ طلبہ نے کامیابی کے نمبر حاصل کئے۔ یہ سب کچھ جناب مہتمم صاحب اور حضرات مدرسین کے اخلاص اور صدق نیت کا ثمرہ ہے۔"(۶۰)

اردو شاعری: علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے عربی، فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ آپ نے ایک نعت لکھی ہے جس کے صرف پانچ اشعار ہیں۔

شاہ جانباز اگر ہمارا ہے
کیا ہے غم جب کہ وہ سہارا ہے
اگر وہ نہیں تو کچھ نہیں میرا
وہ اگر ہے تو میرا سارا ہے
وصف تیری زبان کی زینت ہے
بزم کو اس نے کیا سنوارا ہے
دونوں جگ میں ہے وہ آسانی
جس کے اوپر تیری مدارا ہے(۶۱)

منشی محمد الدین فوق نے اپنی کتاب "تاریخ اقوام کشمیر" میں علامہ موصوفؒ کے اشعار جمع کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

سفر کی منزل دار دنیا
ذرا تو اس کا خیال ساکر

سدا نہیں ہے یہ دیس میرا
ضرور جانا ہے دن نبھا کر

آگے کہا ہے

کبھی تأمل سے داہنے بائیں
اور آگے پیچھے کو دیکھ لینا
کدھر جاتے ہیں دوست پیارے
کہاں وہ رہتے ہیں یہاں سے جاکر
وہ چل بسے سارے باری باری
یہ باقی دنیا بھی چل بسے گی
تو چشم عبرت سے دیکھ غافل
کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر

آخری شعر ہے

نماز پڑھنا، قیام کرنا
رکوع کرنا، سجود کرنا
کبھی کھڑے ہوکر گاہ جھک کر
زمین پہ ماتھا ٹکا کر

فنی خوبیاں: ڈاکٹر سید محمد فاروق لکھتے ہیں :

"فنی اعتبار سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی شاعری نا صرف قابل قدر بلکہ قابل حجت ہے۔" (۶۲)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور ڈاکٹر حامد علی خان اس پر متفق ہیں :

"وقد فاق شعره شعر أبي الطيب المتنبي في حسن سبكه و نسيجه، وبديع انسجامه و صوغه و نصاعة لفظه و فصاحة كلماته" ۔ (۶۳)

یعنی علامہ انور شاہ صاحبؒ کی شاعری میں غیر مانوس الفاظ مطلق نہیں ہیں۔ حسن ترکیب، سلاست، انسجام اور الفاظ و ترکیب کے اختیار میں انھیں متنبّی پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔

علامہ انور شاہؒ پر تکلف شاعر نہیں ہیں بلکہ نیچرل شعراء کی طرح ان میں بھی شعر و شاعری کا ملکہ فطرۃً موجود تھا۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شعری صلاحیت گل و بلبل کی منظر کشی پر صرف نہیں کی بلکہ دوسرے علوم کی طرح ادب کو بھی تعلیم و اصلاح کے کام لائے۔ ادب و انشاء کے بارے میں ان کا اپنا ایک نظریہ تھا جس کے ذریعے وہ ادب و انشاء سے تعلیم و تربیت کا کام لینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سید محمد فاروق نے آپ کے اس نظریہ کو اس طرح نقل کیا ہے کہ ''انشاء پردازی کی رونق اور ادب کی عظمت اس میں ہے کہ مشکل مسائل اور غامض مباحث کو فصیح ادب میں بیان کیا جائے۔ باغوں اور پھلوں کے تذکروں، ہواؤں اور لہروں کی سرسراہٹ پر قلم اٹھانے سے ادب کو امتیاز اور فوقیت نہیں ملے گی کیونکہ ان موضوعات پر تمام شعراء اور ادباء نے بہت کچھ لکھا ہے''۔ (۶۴)

تنقیدی جائزہ: علامہ انور شاہؒ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شعر و سخن میں خیال آرائی کے بجائے واقعیت اور حقیقت نگاری کو پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر دل بہلائی نہیں بلکہ مفید مطلب باتیں کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے یہاں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی بکثرت دیکھیں گے جن کی اہمیت سماجی ہے۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ بنیادی طور پر عالم دین تھے، شاعری کی طرف وہ دوسرے درجے پر آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے کلام میں ایسے رجحانات پائیں گے جن کی حیثیت مذہبی اور دینی ہے۔ ادیب اور شاعر اپنی فطری اور ذہنی افتادِ طبع سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مولاناؒ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ آپ کے شاعرانہ کلام میں نثر کی طرح دینیات اور فقہی مسائل کی گہری چھاپ ہے۔ یہ بات ان کے آرٹ اور فن کے حق میں زیادہ اچھی ثابت نہ ہوسکی کیونکہ فقہی جزئیات جس عمدگی سے نثر میں بیان ہوسکتی ہیں، شعر کی قباء ان کے لیے کسی قدر تنگ ہے۔ قاری کو وہ لطف شیرینی محسوس نہیں ہوتی جو عام طور پر غزل گو شعراء کے کلام میں ہوتی ہے کیونکہ دینی مسائل اور فقہی جزئیات جام و ساقی، پیمانہ اور صراحی کی گرفت سے یکسر

باہر ہیں۔ مولانا موصوفؒ نے ان مضامین کو شعر و سخن کے قالب میں اس لیے ڈھالا تا کہ واضح ہو جائے کہ وہ اس میدان کے بھی صحیح اور حقیقی معنوں میں مرد تھے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی شاعری میں عشق و محبت کی چاشنی قطعاً نہیں، اس کے برعکس شریعت و طریقت کے ٹھوس مسائل کا بیان ہے۔ ہمارے عربی و فارسی شعراء اپنے قصائد کے آغاز میں کسی خیالی محبوب یا محبوبہ سے تشبیب یا اظہار عشق کے قائل ہیں۔ آپ نے اس قدیم روایت سے انحراف کیا ہے اور عربی و فارسی ادب کے لیے نئے سانچے اور نئے ڈھنگ مہیا کئے ہیں۔ شعر و سخن کے فطرتی جذبے کو بے سود اور لا طائل خیالات میں صرف کرنے کے بجائے مفید مطلب مضامین میں لگایا ہے اور اسی میں آپ کے فن کی پختگی کا راز ہے۔ مولانا موصوفؒ نے اپنے کلام کے ذریعے شاعری کو الفاظ کی مناسبت، نشست بندی، تک بندی اور بے سود قافیہ پیمائی اور خیالات کے پیچ و خم کے بجائے سیدھے سادے اور فطری لب و لہجہ اور انداز بیان کا پابند کیا ہے۔ آپ نے وزن و قافیے کی قباء میں فقہی مسائل، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، دوست و احباء کے مراثی اور نعوت سرور کائنات علیہ التحیۃ والسلام منظوم کیں اور جو کام نثر سے لیا جاتا ہے، نظم سے لے لیا اور اس طرح شعر و سخن کے بنیاد تخیل کی بجائے واقعیت و اصلیت پر رکھی۔

علامہ انور شاہ صاحبؒ کی نعوت اور فارسی تاریخیں اکثر متقدمین شعراء کے انداز پر ہیں۔ اور اس طرح ان میں متبعانہ پہلو زیادہ ہے۔ مراثی میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مرثیے میں "قفانبك من ذكرى مزار فند معا" کے الفاظ مشہور جاہلی شاعر امراء القیس کی یاد دلاتے ہیں جس نے اپنے قصیدہ کا آغاز تقریباً انھی الفاظ سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا ہے۔ بلا شبہ مولانا موصوفؒ کے عربی و فارسی کلام میں بالعموم تقلیدی رنگ نمایاں ہے تاہم کہیں کہیں جدید خیالات بھی مل جاتے ہیں۔ اور اس وقت یقیناً مولانا موصوفؒ کی قوت مخترعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔

مولانا محمد ابراہیم اپنے مقالہ "علامہ کشمیری کا ذوق سخن گوئی" میں لکھتے ہیں:

> "چونکہ عربی و فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی، ادبی مشغلہ اور مصروفیت کی زبان تھی اس لیے الفاظ کی ثقالت کہیں کہیں ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔" (۶۵)

مولانا صاحبؒ کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کا سارا کلام اسی ڈھرے پر چلتا ہے۔ بعض مقامات پر عمدہ اور قیمتی خیالات اسی طرح چمکتے نظر آتے ہیں جس طرح ریت میں چمکتے ہوئے ذرے۔

الغرض مولانا انور شاہ کشمیریؒ باوجود عالم متبحر، محدث اور مفسر ہونے کے شعر و سخن کے کوچے سے بھی نابلد نہ تھے۔ آپ اپنے وقت کے باکمال شاعر تھے۔ وہ اکثر و بیشتر مختلف زبانوں خاص طور پر عربی و فارسی میں فصیح و بلیغ شعر کہتے تھے۔ طلبہ اور اساتذہ کے اشعار کی تصحیح بھی ایک ماہر فن کی طرح کرتے تھے۔ بلاغت و بیان کے باریک مسائل پر بھی ان کی نظر کافی وسیع اور گہری تھی۔ شعرائے متقدمین کے آثار و دواوین کے گویا حافظ تھے۔ اس لیے ایسی جامعیت کے مالک کا فنی نقائص کا مرتکب ہونا مشکل نہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹر سید محمد فاروق لکھتے ہیں:

> ''ان کے بعض اشعار'' میں اغلاق و ایہام ضرور نظر آتا ہے مگر اس طرح کے اشعار کا نفس مضمون فلسفہ و کلام یا تصوف کا دقیق مسئلہ ہوتا ہے۔''(۶۶)

لیکن ان علوم کا ماہر ایسے اشعار سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے مگر دیگر زبانوں کے مسلم الثبوت شعراء جیسے اردو میں غالبؔ بھی اس سے بری نہیں ہیں۔ خود عربی ہی کے متنبّی اور ابو تمام اس خوبی یا خامی میں مشہور ہیں۔

مختصر یہ کہ شیکسپئیر جبر و قدر کے مسائل میں اس قدر الجھا کہ فلسفۂ حیات کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نطشے نے ایک مرد کامل کا تعین تو کیا لیکن اس مرد کامل میں اسے بربریت و بہیمیّت کے علاوہ کوئی صفت نظر نہ آئی۔ شوپن ہار کو زندگی میں سوائے تاریکی اور دکھ کے کچھ نظر نہ آیا۔ عمر خیام نے زندگی کے مسائل کو شراب کے جام میں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ میرؔ تو قسام ازل سے ہی ایک بجھا ہوا دل لے کر آئے تھے۔ غالب نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ ''قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔'' وہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ہی تھے جنھوں نے حیات اور رمز حیات کو سمجھا اور زندگی کے حقائق کا عرفان حاصل کر کے اسے ایک منضبط اور جامع فلسفہ کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ مولاناؒ کی شاعری ہمیں مصائب سے ٹکرانے اور مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔ ان

کے اقوال میں بوئے اسد اللہؓ اور اشعار میں فقر ابوذرؓ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور جدید نسل میں جینے کا ارمان پیدا کیا ہے، ان کی شاعری پیغمبری ہے، ان کا کلام الہامی ہے، ان کے نظریات آفاقی ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں پائیداری و پختگی ہے اور انقلاب دوراں کا کوئی جھونکا ان کی عظمت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ آپ نے اپنی عربی و فارسی نثر کے ذریعے گیسوئے ادب کو سنوارا اور شعر و سخن کے ذریعے بھی اس کی مانگ پٹی کرتے رہے۔ ان کا نام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک سورج چمکتا اور چاندنی مسکراتی رہے گی۔ اور جب کبھی برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان و ادب کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں انور شاہ صاحب کا نام نامی جلی حروف سے تحریر ہوگا۔

ہرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریده عالم دوام ما

حوالہ جات

۱	نزہۃ الخواطر	ج ۲، ص ۳۷
۲	جلوہ کشمیر	ص ۷۰
۳	تاریخ ہند	ج ۱، ص ۱۳۷، ۲۰۷
۴	جلوہ کشمیر	ص ۷۱
۵	عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ	ص ۳۵۴
۶	جلوہ کشمیر	ص ۷۳
۷	مجلّہ نہرو مردم	
۸	جلوہ کشمیر	ص ۷۴
۹	تاریخ حسن	ج ۱، ص ۳۴۴
۱۰	جلوہ کشمیر	ص ۷۹
۱۱	برہان دسمبر ۱۹۸۰ء	ص ۳۴
۱۲	ایضاً	
۱۳	نقش دوام	ص ۲۵۰
۱۴	دار العلوم، نومبر ۱۹۶۵ء	ص ۲۸
۱۵	حیات انور	ج ۱، ص ۸۳
۱۶	دیوبند نمبر، مارچ ۱۹۸۰ء	ص ۱۳۹

۱۷	نفحۃ العنبر	ص ۱۸۸
۱۸	ایضاً	
۱۹	حیات انور	ج ا،ص ۸۳
۲۰	فصل الخطاب	ص۴۵
۲۱	آثار السنن	ص ۱۳۰
۲۲	ایضاً	
۲۳	ایضاً	
۲۴	برہان، دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء	
۲۵	صدع النقاب مقدمہ مطبع قاسمی دیوبند	ص۱۵
۲۶	روزنامہ سیاست لاہور کا معراج نمبر	
۲۷	القرآن ۲۷۔ ۸	
۲۸	نفحۃ العنبر	ص۱۲۷
۲۹	ضرب الخاتم علی حدوث العالم	ص ۲
۳۰	ضرب الخاتم علی حدوث العالم	ص۴
۳۱	ایضاً	ص ۴
۳۲	ایضاً	ص۴۰
۳۳	عقیدۃ الاسلام	ص ۴۰،۴۱
۳۴	نفحۃ العنبر	ص۱۸۲
۳۵	نفحۃ العنبر	ص ۱۷۹
۳۶	ایضاً	ص۱۸۰

۳۷	برھان ستمبر ۱۹۸۰ء	ص ۳۳
۳۸	دارالعلوم دیوبند، اپریل ۱۹۷۴ء	
۳۹	خاتم النبیینؐ	ص ۹۶
۴۰	انوارالعلوم لاہور دسمبر ۱۹۵۲ء	
۴۱	ترجمان السنۃ	ج ۳، ص ۲۴
۴۲	مشکلات القرآن	ص ۲۲۲، ۲۲۳
۴۳	نفحۃ العنبر	ص ۱۸۴
۴۴	ایضاً	ص ۱۸۲، ۱۸۳
۴۵	نفحۃ العنبر	ص ۱۸۵، ۱۸۶
۴۶	مولانا انورشاہ کے علوم معارف	ص ۱۳
۴۷	دارالعلوم دیوبند نومبر ۱۹۶۵ء	ص ۲۸
۴۸	الکفار الملحدین	ص ۱۰۸
۴۹	نفحۃ العنبر	ص ۲۰۵
۵۰	نفحۃ العنبر	ص ۲۰۷
۵۱	برھان ستمبر ۱۹۸۰ء	ص ۳۸
۵۲	نقش دوام	ص ۲۶۳
۵۳	مہاجر سلطان العلوم نومبر ۱۹۲۸ء	
۵۴	انوار المحمود	ج ۱، ص ۶
۵۵	عقیدۃ الاسلام	ص ۲۰
۵۶	نفحۃ العنبر	ص ۱۹۳

۵۷	مولانا انور شاہ کشمیری کے علوم و معارف	ص ۳۴
۵۸	نقش دوام	ص ۲۶۰
۵۹	علمائے دیوبند اور اردو ادب	ص ۸۷
۶۰	دارالعلوم دیوبند، اپریل ۱۹۶۴ء	ص ۴۴
۶۱	بارگاہ رسالت اور بزرگان دیوبند	ص ۲۸
۶۲	برہان، دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء	ص ۴۲
۶۳	نفحۃ العنبر	ص ۱۷۸
	وہندوستان میں عربی شاعری (قلمی)	
۶۴	برہان	ص ۴۲
۶۵	تجلیات انور	ص ۲۷۷
۶۶	برہان دہلی، نومبر ۱۹۸۰ء	

باب: ۹

تحریک ختم نبوت میں علامہ کشمیریؒ کا کردار

www.ahlehaq.org

اہل حق کا مختلف فتنوں سے مقابلہ

ختم نبوت کے بارے میں ضروری وضاحت تو علامہ کشمیریؒ کے علمی کارناموں کے سلسلہ میں مقالہ ہذا میں جگہ جگہ کردی گئی ہے لیکن آپ اس مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور عام مسلمان کے لیے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

اسلام اپنے آغاز ہی سے جن فتنوں کا نخچیر رہا ہے اس کی دل دوز تاریخ ہمارے سامنے ہے اور یہ بھی کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک آپ کے جانشینوں کو سازشوں کی کن ہولناک وادیوں میں اتر کر باطل کا بھرپور مقابلہ کرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سے دنیا میں حق ہے اس وقت سے باطل اس کے مقابلے میں موجود، نور کے ساتھ ظلمت کی کشمکش، خیر اور شر کی نبرد آزمائی، کفر و ایمان کی معرکہ آرائی اور سعادت و شقاوت کے باہمی مقابلے کی داستان بڑی پرانی ہے۔

امت مرحومہ کے اہل حق کو پندرہ سو سال کے عرصہ میں فراغت کا کوئی ایسا لمحہ میسر نہیں آیا جس میں باطل کو سرنگوں کرنے کے لیے حق پسندوں کا گروہ پیش پیش نہ رہا ہو۔ ابو جہل، ابولہب، عاص بن وائل، عقبہ بن معیط، ولید بن مغیرہ، کے اٹھائے ہوئے ہنگاموں سے بچ کر نکلنے والا مقدس انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ کی نمناک خاک پر پہنچا تو وہیں عبداللہ بن ابی بن سلول کی شکل میں کچھ اڑتے ہوئے بگولے بھی نظر آئے اور کائنات کا یہ محسن اعظمؐ جب داخلی و خارجی فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر رہا تھا تو اچانک مسیلمہ کذاب کی باطل نبوت کا دعویٰ بھی اس کے پاکیزہ کانوں میں پہنچ گیا۔ آہ! اس محسن اعظمؐ نے ناسپاس دنیا کے اس بھیانک جرم کی نمائش اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ اس کی ختم نبوت ہی کے مقابلہ میں نبوت کا دعویدار کھڑا ہو گیا۔

مسیلمہ کے بعد اسود عنسی، سجاح بنت خویلد، ابن المقنع خشب جیسے بے شمار کذّاب

نبوت کے پاکیزہ دامن کو تار تار کرنے والے پیدا ہوتے رہے اور یہی ایک محاذ نہیں بلکہ سینکڑوں محاذ کھل گئے جن کی اطلاع خود ہادی برحق حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ:

"و تفترق امتی علی ثلث و سبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة"۔ (۱)

''میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی جن میں ایک ہی جماعت اپنے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جنت کی مستحق ہوگی''۔

تاریخ کے اوراق دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ پولس (یہودی کا نام) کے ہتھکنڈے جب عیسائیت کو نقصان نہیں پہنچا سکے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کا یہ سب سے بڑا مجرم ایک مقدس ظہور کا دعویٰ کرتے ہوئے یکا یک عیسائیت کا منادبن گیا۔ ٹھیک اسی طرح یہودی النسل ابن سبا نے اسلام کو تخت وتاراج کرنے کے لیے اسلامی قالب اختیار کیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معصوم خون کا انتقام لینے کے منصوبوں سے لے کر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مشاجرات میں برابر شریک کار رہا۔

اسی تاریخ میں کربلائی معرکے، حجاج کی سفاکیاں، ابن زیاد کی خون آشامیاں، مسئلہ تقدیر اور اس پر ہنگامہ آرائیاں، اعتزال کا فتنہ، خوارج کا طوفان، رافضیت کا سیلاب، شیعیت کی آندھی، خلق قرآن کا بگولہ اور اسی طرح بہت سے دیگر فتنے اٹھے جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

فتنۂ قادیانیت: دور نہ جائیے خود ہمارے اپنے ملک میں عقیدہ اور عمل میں ضلالت وگمراہی کس انداز سے پھیلتی رہی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن ہر عہد میں باطل کے مقابلہ میں حق پسندوں کا ایک گروہ بھی متحرک نظر آتا ہے۔ خلق قرآن کے فتنہ پر اس کی حمایت میں ایک زبردست حکومت وقت تھی مگر صرف ایک بطل جلیل امام احمد بن حنبلؒ نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے سرنگوں کردیا۔ ہندوستان میں دین الٰہی صرف شیخ مبارک ابوالفضل اور فیضی کی دماغی اپج نہیں تھی بلکہ اس کی تائید اور پشت پناہی کے لیے اکبر کی وسیع حکمرانی موجود تھی۔ اس الحاد کو توڑنے کے لیے شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت سامنے آئی۔ اس طرح

آج سے تقریباً ایک صدی قبل مشرقی پنجاب میں قادیان نامی ایک گاؤں میں جھوٹے نبی کا ظہور ہوا جس نے نبوت کا دعویٰ کر کے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن نبوت کو نوچنا چاہا، یہ فتنہ اٹھا، بڑھا اور پھیلا مگر حق پرستوں کا ایک گروہ اس کے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جس نے قادیانی نبوت کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس جماعت کے امام مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ہیں۔ قادیانیت کی تردید آپ کا خاص مشن تھا۔ آپ کے اس سلسلہ میں کارنامے بیان کرنے سے پہلے اس جھوٹی نبوت کے بانی کے مختصر حالات زندگی بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی اصلی حیثیت قارئین کے سامنے آجائے۔

مرزا غلام احمد کے مختصر حالات زندگی: مرزا غلام احمد ۱۸۳۹ء میں قادیان کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا۔ چھوٹی عمر میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کر لی۔ ان دنوں آریہ سماجیوں، ہندوؤں اور عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کی تعلیمات پر طرح طرح کے رکیک اعتراضات ہوا کرتے تھے۔ مرزا نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے قادیان اور کئی دوسرے مقامات میں ہائی سکول کھولے۔ ہندوؤں اور پادریوں کے اعتراضات کے جواب دیئے اور یورپ میں اسلام پھیلانے کے لیے مبلغ بھیجے۔ (۲)

شروع شروع میں مرزا نے اعلان کیا کہ میں "براہین احمدیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں، جس میں اسلام کی صداقت وسچائی کے بے پناہ دلائل ہوں گے۔ اس تالیف میں مرزا اسلام کی عالمگیر صداقت کا بظاہر پرجوش مبلغ نظر آتا ہے اس کتاب کے بعض مضامین اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہے جن میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لیے اُس کے مخصوص منصوبوں کا ذکر ہوتا۔ اس سے مسلمانوں کی ایک جماعت مرزا کے ہم خیال پیدا ہوگئی جس میں حکیم نورالدین قابل ذکر ہے جو مرزا کے مرنے کے بعد اس کا خلیفہ ہوا۔ (۳)

۱۹۰۸ء میں مرزا فوت ہوا اور ۱۹۱۳ء میں جب خلیفہ نورالدین بھی مر گیا تو اس کے بعد مرزائی جماعت کے دو گروہ بن گئے۔

ایک مولوی محمد علی کی قیادت میں لاہوری گروہ جو مرزا کو مجدد تسلیم کرتا ہے دوسرا قادیانی گروہ جس کا خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد منتخب ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد قادیان چھوڑ کر پاکستان آ گیا اور ضلع جھنگ میں چنیوٹ کے نزدیک دریائے چناب پر ربوہ نام کی ایک بستی

آبادکرلی اور مستقل یہیں آباد ہوگیا۔(۴)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے دعاوی کے مرحلے قدم بقدم طے کئے:

" فادعی اولاً، انه مجدد، و مثیل للمسیح ، ثم ادعی، أنه المهدی الموعود و المسیح المعهود، وادعی معه، أنه نبی ، و ظل لجمیع الأ نبیاء، وقال فانا آدم، وأنا ابراهیم و أنا موسی و أنا نوح، وأنا داؤد ، وأنا یحیٰ و أنا عیسیٰ،ولما استبعد ادعاء ہ النبوۃ فقال تارۃ، انه نبی لغوی و تارۃ نبی ظلی و تارۃ بروزی، ثم ارتقی وادعی أنه نبی تشریعی ورسول تشریعی، ثم جعل وحیه مثل القرآن، وجعل مسجده المسجد الاقصیٰ، وجعل قریته مکة المسیح ، وجعل بلدۃ لاهور مدینة وأسس مقبرۃ سماها، مقبرۃ الجنة وسمی أزواجه ، أمهات المومنین، وأتباعه أمته، وأنکر الجهاد وأنکر عقیدۃ ختم النبوۃ وادعی جواز ظهور نبی بعده فکهذا أنکر کونه صلی الله علیه وسلم خاتم النبیین ، وأنکر نزول عیسیٰ علیه السلام من السمآء وادعی موته وصلبه وأنه ابن یوسف النجار، وادعی أن الدولتة البریطانیة، ظل الله فی الارض"(۵)

مرزا کے یہ تمام دعوے قرآن وحدیث کے بالکل خلاف تھے اور امت مسلمہ ان کو بھلا کیسے برداشت کرسکتی ہے پوری امت کے اندر شدید ردعمل پیدا ہوا۔علمائے ربانی ان باطل عقائد کی بیخ کنی کے لیے میدان میں اتر آئے اور ختم نبوت کے تحفظ کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی۔

<u>ختم نبوت کی اہمیت:</u> حق تعالیٰ نے اس کائنات کے لیے رشد وہدایت کا جو سلسلہ جاری فرمایا وہ نبوت ورسالت کا سلسلہ ہے۔ اس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور اس عمارت کی تکمیل آخری خشت حضرت سید العالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اور ظہور پرنور ہے۔ ختم نبوت کے اس عقیدے پر خدا تعالیٰ کی سب سے آخری آسمانی کتاب قرآن کریم کی بے شمار تصریحات موجود ہیں۔ جس طرح یہ ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے اسی طرح دلالت کے لحاظ سے بھی قطعی اور ہر شک وشبہ سے پاک ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مسئلہ پر قرآن کریم کی ایک آیت بھی اگر قطعی الدلالت ہو تو مضمون کی قطعیت کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ قرآن کریم کی ایک سو سے زائد آیات ختم نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔ (٦)

اسی طرح عقیدہ ختم نبوت پر احادیث نبویہ بھی تو اتر کو پہنچ گئی ہیں۔ دو صد (۲۰۰) احادیث سے یہ عقیدہ ثابت ہوا ہے گویا قرآن وحدیث میں اس قطعیت کی نظیر کسی اور مسئلہ میں نہیں ملے گی۔ پھر امت محمدؐیہ کا اس پر اجماع بھی ہے۔ (٧)

توحید الٰہی جس طرح تمام ادیان کا اجماعی عقیدہ ہے اسی طرح ختم نبوت کا عقیدہ بھی تمام کتب الٰہیہ، تمام انبیاء اور تمام ادیان سماویہ کا متفق علیہ اور اجماعی عقدہ ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں اس اجماعی عقیدے کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جب کوئی مدعی نبوت کھڑا ہوا اس کا سر قلم کر دیا گیا، یہ اِس عقیدہ کا عملی ثبوت تھا جو اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں اسلامی جہاد کا آغاز ہی مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں جنگ یمامہ سے ہوا جس میں سات سو صرف حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ گویا اسی عقیدے کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ صحابہؓ شہید ہوئے۔ (٨)

بدقسمتی سے برطانوی اقتدار میں جھوٹی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور یہ سمجھ کر کہ ختم نبوت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کے متزلزل ہو جانے سے اسلام کی عمارت منہدم ہو جائے گی، اس پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کا انتخاب کیا گیا۔ متحدہ ہندوستان اسلامی حکومت کے سائے سے محروم تھا ورنہ مرزا

کا حشر بھی اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب سے مختلف نہ ہوتا۔ اس لیے مسلمان سوائے دینی بحثوں اور مناظروں کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

امت کے جن اکابرین نے اس فتنہ کے استیصال کے لیے محنتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ امتیازی شان مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کو حاصل ہے۔ انھوں نے جس طرح تجزیہ کر کے ان پر تنقید کی اس کی نظیر تمام عالم اسلام میں نہیں ملتی۔ آپ نے خود بھی گراں قدر تصانیف کیں اور اپنے تلامذہ سے بھی کتابیں لکھوائیں۔ مولانا بنوریؒ لکھتے ہیں :

> ''میں نے خود حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے سنا کہ جب یہ فتنہ کھڑا ہوا تو چھ ماہ تک مجھے نیند نہیں آئی اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ دین محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے زوال کا باعث یہ فتنہ نہ بن جائے۔ فرمایا۔ چھ ماہ کے بعد دل مطمئن ہو گیا کہ ان شاءاللہ دین باقی رہے گا اور یہ فتنہ مضمحل ہو جائے گا۔''(۹)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''میں نے اپنی زندگی میں کسی بزرگ اور عالم کو اس فتنہ پر اتنا دردمند نہیں دیکھا جتنا کہ حضرت امام العصر کو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میں ایک زخم ہو گیا ہے جس سے ہر وقت خون ٹپکتا رہتا ہے۔ جب مرزا کا نام لیتے تو فرماتے تھے: ''لعین ابن لعین لعین قادیان''۔ اور آواز میں ایک عجیب درد کی کیفیت محسوس ہوتی۔ فرماتے تھے کہ ''لوگ کہیں گے کہ یہ گالیاں دیتا ہے۔ فرمایا کہ ہم اپنی نسل کے سامنے اپنے درد دل کا اظہار کیسے کریں۔ ہم اس طرح قلبی نفرت اور غیظ وغضب کے اظہار پر مجبور ہیں ورنہ محض تردید وتنقید سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ تو علمی اختلافات ہیں جو پہلے سے چلے آتے ہیں۔''(۱۰)

پہلا انکشاف : یوں تو رد قادیانیت اور تحفظ ناموس رسالت کا کام کم وبیش تمام اسلامی جماعتوں نے کیا مگر دارالعلوم دیوبند جو بقول حضرت حاجی صاحبؒ ''ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ دین کی خاطر وجود میں لایا گیا تھا۔''(۱۱) اسے اس سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل ہے سب سے پہلے شخص جو اس فتنہ سے آگاہ ہوئے تھے وہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے۔ جنھوں نے حج کے موقع پر حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ کو اس کی بابت بتایا تھا

اوراس کے سد باب کے لیے واپس ہندوستان جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"هندوستان عنقریب یك فتنه ظهور کند، شماضرور در ملك خود واپس بروید، و اگر بالفرض شماردر هند خاموش نشسته باشد تاهم آں فتنه ترقی نه کند و در ملك آرام ظاهر شود ۔"(۱۲)

مقدمۂ بہاول پور:

اس مقدمہ کی تقریب یہ ہوئی کہ ایک مسلمان لڑکی مسماۃ غلام عائشہ بنت مولوی الٰہی بخش کا شوہر مسمی عبدالرزاق ولد جان محمد اسلام سے مرتد ہوکر مرزائی بن گیا تھا۔ اُس زوجہ کی طرف سے ۲۴/ جولائی ۱۹۲۶ء کو احمد پور شرقیہ کی عدالت میں دعویٰ کیا گیا کہ:

''مدعیہ اب تک نابالغ رہی ہے اب عرصہ دوسال سے بالغ ہوئی ہے مدعاعلیہ نے مذہب اہل سنت والجماعت ترک کرکے قادیانی، مرزائی مذہب اختیار کرلیا ہے اوراس وجہ سے وہ مرتد ہوگیا ہے۔ اس کے مرتد ہونے کے باعث مدعیہ اب اس کی منکوحہ نہیں رہی کیونکہ وہ شرعاً کافر ہوگیا ہے اور بموجب احکام شرع شریف بوجہ ارتداد مدعاعلیہ مستحق انفراق زوجیت ہے۔ اس لیے ڈگری تنسیخ نکاح بحق مدعیہ صادر کی جائے۔''(۱۳)

یہ مقدمہ ابتدائی عدالت سے دربار معلّٰی تک پہنچا اور وہاں سے بایں حکم ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں واپس کردیا گیا کہ :

'' مستند علمائے ہند کی شہادت لے کر بروئے احکام شرعیہ فیصلہ کیا جائے''(۱۴)

یہ مقدمہ سات سال سے چل رہا تھا...... ڈسٹرکٹ عدالت نے فریقین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مسلک کے مستند اور مشاہیر علماء کو شہادت کے لیے پیش کریں۔ انجمن مؤید الاسلام بہاول پور نے مدعیہ کی جانب سے اس مقدمہ کی پیروی شروع کی۔ بالآخر دوسال کامل تحقیق و تنقیح کے بعد ۷/ فروری ۱۹۳۵ء کو عالی جناب محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بہاول پور نے

اس مقدمہ کا تاریخی فیصلہ مدعیہ کے حق میں صادر کرتے ہوئے قرار دیا کہ:

''مدعیہ کی طرف سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب کاذب مدعی نبوت ہیں اس لیے مدّعا علیہ بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد قرار دیا جائے گا.......... لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعلیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔'' (۱۵)

مولانا ابوالعباس محمد صادق نعمانی تحریر کرتے ہیں:

''مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، حضرت مولانا محمد نجم الدینؒ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اور مفتی محمد شفیعؒ (مفتی دارالعلوم) پیش ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لیے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے...... خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ (کاشمیری) نے اپنی شہادت میں ایمان، کفر، نفاق زندقہ، ارتداد، ختم نبوت کی تعریف اور ایسے اصول و قواعد بیان کئے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علی وجہ البصیرت بطلان مرزائیت کا یقین کر سکتا ہے۔'' (۱۶)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ۱۹/ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور پہنچے تھے۔ ۲۵/ اگست کو آپ کا بیان شروع ہوا تو کمرۂ عدالت علماء و روساً اور امراء سے پُر ہو گیا تھا اور عدالت کے باہر میدان میں بھی دور دراز تک زائرین کا اجتماع تھا۔ (۱۷)

مولانا انوریؒ کا بیان ہے کہ:

''آپ کا بیان پانچ دن تک رہا جس میں روزانہ ۵، ۶ گھنٹے علم و عرفان کے دریا بہاتے رہے۔ مرزائیت کے کفر و ارتداد اور دجل و فریب کے تمام پہلو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن فرما دیئے۔'' (۱۸)

کفر اور ایمان کی حقیقت

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے اس بیان میں کفر اور ایمان کی حقیقت پر جو تبصرہ اور وضاحت بیان کی اسے مولانا ظفر علی خانؒ نے اپنے اخبار روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع کیا ہے۔ ایمان کے معنی بیان کرتے ہوئے مولانا موصوفؒ نے کہا کہ کسی کے قول کو اس کے اعتماد پر باور کرنے اور غیب کی خبروں کو انبیاء کے اعتماد پر یقین کر لینے کو ''ایمان'' کہتے ہیں اور حق ناشناسی یا منکر ہو جانے یا مکر جانے کو ''کفر'' کہتے ہیں۔ (۱۹)

دین محمدی کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت یا تو تواتر سے ہے یا خبر واحد سے، تواتر کی تعریف اور اس کی جو اقسام بیان کی تھیں اخبار نے اس مفہوم میں ان کو شائع کیا ہے۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کہا کہ:

> '' تواتر سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی ثابت ہو اور ہم تک علی الاتصال پہنچی ہو کہ اس میں خطاء کا احتمال نہ ہو۔''
>
> یہ تواتر چار قسم کا ہے:
>
> ۱)......تواتر اسنادی
>
> ۲)......تواتر طبقہ
>
> ۳)......تواتر قدر مشترک
>
> ۴)......تواتر توارث ''(۲۰)

ایک ہی بات جو مختلف لوگوں سے کہی جائے اور بات کے ایک ہونے کے باوجود اس کی حقیقت بدلتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کہا:

> ''کوئی شخص برابر کے آدمی سے کہہ دے کہ'' تم نے بکواس کی'' تو وہ کوئی چیز نہیں۔ یہی بات استاد اور باپ سے کہے تو کہنے والا عاق ہے اور پیغمبر کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کفر صریح ہے''(۲۱)

آپ نے کہا:

> ''نبوت کے ختم ہونے کے بارے میں کوئی دو سو حدیثیں ہیں۔ قرآن مجید اور

اجماع بالفصل ہے اور ہر نسل نے اگلی نسل سے اس کو لیا ہے اور کوئی مسلمان جو اسلام سے تعلق رکھتا ہے وہ اس عقیدے سے غافل نہیں رہا۔ اس عقیدہ کی تحریف کرنا اور اس سے انحراف کرنا صریح کفر ہے۔ اسلام ہے شناخت مسلمانوں کی اور مسلمانوں کے اشخاص شناخت ہیں اسلام کی، اگر اسلام کے اجماع کو درمیان سے اٹھادیا جائے تو دین سے وہ گیا۔" (۲۲)

جھوٹی نبوت کے استیصال میں علامہ کشمیریؒ کا کردار

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس فتنہ کے استیصال کے لیے علمی طور پر تین کام کرنے ضروری ہیں: اول مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات و اوہام کا ازالہ بھی ہو۔ دوسرے حیات عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن وحدیث اور آثار سلف سے مع ازالہ شبہات ملحدین۔ تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق، متعارض ومتہافت اقوال، انبیاء واولیاء وعلماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں۔ اس کا دعویٰ نبوت ووحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا، جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو۔ اس فتنہ کی مدافعت کے لیے یہی چیز اہم اور کافی ہے۔" (۲۳)

مولانا انور شاہ صاحبؒ نے قادیانیت کی تردید کے لئے باقاعدہ پروگرام مرتب کیا اور مختلف افراد کو اس کام پر لگایا۔ خاص طور پر اپنے شاگردوں کو مرزائیت کے خلاف کتابیں لکھنے پر ابھارا۔ اور ان کی تالیفات پر خود تقریظیں لکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مولانا محمد بدر عالمؒ نے آیت " انی متوفیك و رافعك الی " کی تفسیر کے ساتھ ایک مستقل رسالہ " الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح " تحریر کیا جو علمی رنگ میں لاجواب ہے۔ مولانا شاہ صاحبؒ نے اس پر ایک تقریظ لکھی ہے۔ اس مسئلہ پر اردو میں ایک رسالہ "کلمۃ السر فی حیواۃ روح السر" لکھ کر مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس پر بھی ایک تقریظ لکھی۔ مفتی محمد شفیعؒ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق جملہ مستند و معتبر روایات حدیث یکجا کر کے: "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" تحریر کیا۔ عام طور پر یہ رسالہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے نام سے ہی منسوب ہے اس کے بعد ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب انور شاہ صاحبؒ کے ایماء پر تحریر کی جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسنؒ نے بھی کچھ رسائل لکھے۔(۲۴)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے خود بھی اپنے قلم سے مرزائیت کے خلاف کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ ضخیم "عقیدة الاسلام فی حیاة عیسیٰ علیه السلام" دوسری کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" ہے۔ اس کو مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے آپ کے ایماء پر مرتب کیا تھا۔ دمشق میں شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ نے مذکورہ کتاب اپنے حاشیوں کے ساتھ تقریباً ۳۵۰ صفحات کی ضخامت میں ایڈٹ کی ہے، اس کے شروع میں ایک انھی کے قلم کا لکھا ہوا مبسوط مقدمہ بھی ہے۔ اس کتاب کو حال ہی میں مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تیسری کتاب "تحیة السلام" ہے۔ یہ مذکورہ بالا دونوں تصانیف پر اضافہ ہے۔ چوتھی کتاب "اکفار الملحدین" کے نام سے لکھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ نے کیا جسے مجلس علمی کراچی نے شائع کیا تھا۔ راقم الحروف نے جولائی ۱۹۸۱ء میں مجلس علمی کے مہتمم محمد طاسین صاحب سے اس ترجمہ کے بارے میں ذکر کیا تو انھوں نے کہا "وہ ترجمہ معیاری نہ تھا اس لیے دوبارہ شائع نہیں کیا۔"(۲۵)

"خاتم النبیین" یہ رسالہ فارسی میں ہے جو مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی آخری تالیف ہے۔ آپ نے یہ رسالہ خاص طور پر اہل کشمیر کے لیے لکھا تھا۔ یہ رسالہ دراصل آیت "خاتم النبیین" کی شرح ہے۔

یہ وہ کتابیں ہیں جو مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے یا تو خود اپنے قلم سے لکھی ہیں یا بعض اپنے شاگردوں سے لکھوائیں۔ بیانات جو وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوئے اور تقاریر جو مرزائیت کی تردید میں اطراف ملک میں کیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔

یوم قادیان: روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خانؒ نے ۸/۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ملک

میں یوم قادیان منانے کی اپیل کی، اسی سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے زیرِ صدارت ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ آپ نے اپنی تقریر میں جلسہ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا:

''مولانا ظفر علی خانؒ نے تمام اسلامیان ہند سے اپیل کی تھی کہ ضال و مضل امت قادیانیہ کے تبلیغی جلسوں کے جواب میں ۸/ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو طول و عرض ہند میں ''یوم قادیان'' منایا جائے تاکہ متنبیٔ منشی غلام احمد آنجہانی کی خانہ ساز اور جھوٹی نبوت کے قلعہ کو مسمار کر کے رکھ دیا جائے''۔ (۲۶)

طلبہ کو نصیحت: طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''فارغ ہونے کے بعد اگر دین کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو تمہارا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اس فتنہ کو جو گھن کی طرح اندر سے اسلام کی مضبوط جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے دنیا سے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ یہی ایک خدمت ہے جو خدا اور اس کے مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔'' (۲۷)

اخباری بیان: مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے روزنامہ ''زمیندار'' میں اپنا ایک بیان دیا تھا۔ اخبار نے ان جلی سرخیوں کے ساتھ اسے شائع کیا تھا:

''مرزائیوں کے کفر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہؒ کی باطل سوز تصریحات۔''

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے اپنے بیان میں کہا:

''متنبی غلام احمد بلاشبہ مردود ازلی ہے۔ اس کے کفر میں قطعاً احتمال نہ کرنا چاہیے۔ اس کو شیطان سے زیادہ لعین سمجھنا جزو ایمان ہے۔ اس خبیث و بد بخت نے جمیع انبیاء علیہم السلام پر افتراء پردازی کی اور ان کی توہین میں لب کشائی کی۔ علمائے اسلام نے انفرادی حیثیت سے متواتر کوششیں اس فتنہ کے استیصال کے لیے کیں لیکن دور حاضر میں فخر الملت جناب مولانا ظفر علی خانؒ کا علمی اقدام یقیناً لطیفہ الٰہیہ ہے۔ ان کی یہ جد و جہد اور ان کے رفقاء کی

سرگرمیاں خدا اور آخر الزمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان شاء اللہ مستحسن ہیں۔ قادیانیوں کے مقابلہ میں موجود جنگ خالصۃً لوجہ اللہ کی جا رہی ہے۔ وہ مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتیں رکھتی ہے۔ میں سیاسی پہلو کو بہت اچھا سمجھتا ہوں، اگرچہ کمزور اعضاء کی وجہ سے جیل جانے کی قدرت نہیں۔" (۲۸)

محاذ قادیانیت پر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے کارنامے

۱) تصانیف: ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۲) سپاہ تحفظ ختم نبوت: مولانا انور شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا محمد ادریس کاندہلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد ذاکرؒ آف جامعہ محمدی ضلع جھنگ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد چراغؒ آف گوجرانوالہ اور بہت سے افراد موجود تھے جن کو آپ نے رد قادیانیت پر مامور کیا۔ آپ اپنے شاگردوں سے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور رد قادیانیت کے لیے کام کرنے کا عہد لیتے تھے۔ آپ وصیت کر گئے:

"جنہوں نے مجھ سے حدیث کا سبق پڑھا ہے خصوصاً اور تمام اہل اسلام سے عموماً دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ لاہوری فدا کاران دین کی طرح مرزائیت کے قصر بے بنیاد کو برباد کرنے میں ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں۔" (۲۹)

۳) قادیانیت کے خلاف جدید طبقہ کو لا کھڑا کیا: مولانا انور شاہ صاحبؒ نے قادیانیت کے خلاف جدید طبقہ تک آواز پہنچانے کے لیے مولانا ظفر علی خانؒ ایڈیٹر "زمیندار" اور شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کو آمادہ کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں:

"باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں قادیانی فتنہ کی شر انگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں بڑا دخل ڈاکٹر محمد اقبال مرحومؒ کے اس لیکچر کا ہے جو انہوں نے ختم نبوت پر دیا ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا جو انگریزی میں قادیانی

تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا۔''(۳۰)

۴) تحریک ختم نبوت کی تنظیم: مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے تحریک ختم نبوت کو باقاعدہ منظم کرنے کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو''امیر شریعت''مقرر کیا۔ انجمن خدام الدین کے ایک عظیم الشان اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۰ء میں سید عطاء اللہ شاہؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہندوستان کے ممتاز ترین پانچ سو علماء کی بیعت ان کے ہاتھ پر کرائی اور انھیں''امیر شریعت'' کا لقب دیا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد امیر شریعت نے ان کی تحریک کو جاری رکھا۔(۳۱)

۵) مجلس احرار اسلام: تحفظ ختم نبوت کے لیے مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو ناموس رسالت کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرے اور فتنۂ قادیانیت کے استیصال کو اپنا مشن بنا لے۔ اس کے لیے مولانا کشمیریؒ نے''مجلس احرار اسلام''کو آمادہ کیا، اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو اس کا صدر مقرر کیا۔(۳۲)

۶) مولانا کشمیریؒ کی آخری وصیت

مرض موت میں جب تمام قوتیں جواب دے چکی تھیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے، ایک مرتبہ جمعہ کے روز جامع مسجد دیوبند میں ڈولی میں لائے گئے اور اپنے شاگردوں، علماء اور اہل دیوبند کو آخری وصیت کی کہ دین اسلام کی حفاظت کی خاطر اس فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لیے پوری کوشش کریں، مولانا محمد یوسف بنوریؒ آپ کی آخری وصیت کے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

> ''میرے تلامذہ کی تعداد جنھوں نے مجھ سے حدیث پڑھی ہے دو ہزار (۲۰۰۰) ہوگی ...... ان سب کو میں وصیت کرتا ہوں کہ اس فتنہ کے خلاف پوری جدو جہد کریں۔''(۳۳)

دجالی نبوت کا عبرت ناک انجام: ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کی عظیم ترین اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آئی۔ قادیانیوں کو قادیان چھوڑنا پڑا اور وہ چنیوٹ کے نزدیک دریائے چناب کے کنارے آباد ہوئے اور''ربوہ[۱]''کے نام سے ایک بستی قائم

کر لی۔ اب اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے نیا لائحہ عمل سوچا گیا۔ تحریک ختم نبوت کے صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ۱۴/ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ/ ۱۳/ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ملک کے دیگر علماء کے ساتھ ملتان میں جمع ہوئے اور ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے نام سے ایک غیر سیاسی تبلیغی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ مولانا عطاء اللہ شاہؒ اس کے قائد مقرر ہوئے۔ ۹/ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے یکے بعد دیگر مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی جالندہریؒ، مولانا لال حسین اخترؒ اور مولانا محمد حیاتؒ تحریک کے قائد مقرر ہوئے اور ان کے بعد مولانا کشمیریؒ کے تلمیذ خاص مولانا محمد یوسف بنوریؒ ۱۵/ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ/ ۹/ اپریل ۱۹۷۴ء کو اپنے استاد کی جاری کی ہوئی تحریک کے رہنما بنے۔

تاریخ ساز فیصلہ: مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو مجلس کی قیادت سنبھالے ہوئے ابھی دو ماہ نہیں گزرے تھے کہ ۲۹/ مئی ۱۹۷۴ء کو چناب نگر (ربوہ) اسٹیشن پر مشہور سانحہ پیش آیا۔ حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ ۳/ جون کو راولپنڈی میں علماء کا نمائندہ اجلاس ہوا پھر ۹/ جون کو مولانا بنوریؒ کی طرف سے لاہور میں نمائندہ اجتماع رکھا گیا۔ جس میں تمام فرقوں نے شمولیت کی اور ملک کے سیاسی رہنما بھی شامل ہوئے اور ''مجلس عمل'' کی تشکیل ہوئی۔ اسی اجلاس میں ''مجلس عمل'' کی جانب سے ۱۴/ جون ۱۹۷۴ء کو ملک گیر ہڑتال کے اعلان نیز مرزائی امت کے سوشل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۶/ جون کو ''مجلس عمل'' کا لائل پور (فیصل آباد) میں اجلاس ہوا۔ ۲۹/ مئی سے ۷/ ستمبر تک سو (۱۰۰) دن تک فتنہ قادیانیت کے استیصال کے لیے ملک میں تحریک چلتی رہی۔ آخر یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں پہنچا۔ ۳۱/ جولائی کو وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے مستونگ (بلوچستان) میں اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کے فیصلہ کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ چنانچہ فیصلہ کے لیے ۷/ ستمبر کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ قومی اسمبلی کی ''خصوصی کمیٹی'' نے قادیانی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لیے دو ماہ میں ۱۲۸ اجلاس کئے۔ قادیانیوں کے ربوائی

۱۔ حکومتِ پنجاب سے مولانا منظور چنیوٹی نے ربوہ کا نام تبدیل کروا کر چناب نگر منظور کروایا تھا۔

اور لاہوری پارٹیوں کے سربراہوں نے اپنے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے کتابچے پیش کیے۔ کافی تگ ودو کے بعد ۷/ستمبر کو ۴ بج کر ۳۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ (۳۴)

جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے ایک آرڈی نینس کے ذریعے اس فتنہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اب اس آرڈی نینس کی رو سے:

''وہ لوگ (لاہوری اور قادیانی) مرزا غلام احمد قادیانی بانی فرقہ مرزائیہ کے خلفاء کو امیر المومنین، مرزا کی بیویوں کو امہات المومنین وغیرہ القاب سے خطاب کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے اور نماز کے وقت عام مسلمانوں کی طرح اذان دینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ یہ اقدامات قابل دست اندازی پولیس جرائم قرار دیئے جا چکے ہیں اور ان جرائم کی سزا تین سال قید اور جرمانہ ہوگی۔'' (۳۵)

''قادیانی مسئلہ'' کے عنوان سے قومی ڈائجسٹ اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

''ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں کے لیے انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کا حامل ہے اسے ان کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ کہا جائے تو اس میں ذرہ بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ یہی بنیاد ہے جس پر اسلامی معاشرے کی عظیم الشان عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ لیکن قادیانیوں کے نام سے جس گروہ نے انگریزی دور میں برصغیر میں کام کا آغاز کیا اس نے اپنا ایک نبی بنالیا، اس نبی کے ارشادات اور خیالات مستقل طور پر ماخذ قانون قرار پائے اس صورت کو مسلمانوں نے چودہ سو سال میں کبھی برداشت نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر ایسے داعی کو اتفاق رائے سے کاذب قرار دیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے بقول '' نبوت کے کسی دعویدار سے ثبوت طلب کرنا بھی خلاف اسلام ہے۔'' مرزا غلام احمد اگر آج زندہ ہوتے اور دعویٰ رسالت کرتے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انھیں فاتر العقل قرار دے کر حوالۂ زنداں کر دیا جاتا کیونکہ ان کی پرورش برطانوی سامراج کے تحت ہوئی اس لیے ان کے دعویٰ سے وہ سلوک نہ کیا گیا جس کا یہ

مستحق تھا۔ پاکستان بننے کے بعد الحمدللہ! معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اسے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔" (۳۶)

خلاصہ کلام: وہ فتنۂ قادیانیت جس کی وجہ سے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ چھ ماہ تک مضطرب رہے۔ جس کے استیصال کے لئے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو قید و بند کے مصائب جھیلنے پڑے، جس کے خاتمے کے لئے مولانا کشمیریؒ کے امین مولانا محمد ذاکرؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو سیماب کی طرح متحرک رہنا پڑا۔ آخر کار فضل خداوندی سے سپاہ ختم نبوت کی مسلسل اور ان تھک کوششوں کے باعث یہ فتنہ ۷/ستمبر ۱۹۷۴ء کو مولانا انور شاہ صاحبؒ کی وفات کے اکتالیس سال بعد اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کی طرح یہ فتنہ بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ مولانا موصوفؒ اپنے نیک شاگردوں کو جو وصیت کر گئے تھے انہوں نے اسے پورا کر کے دکھایا۔ دنیا جانتی ہے کہ تحریک ختم نبوت کی اصل روح مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہی ہیں۔ انھوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا، خود ماہی بے آب کی طرح مضطرب ہوئے اور اپنے تلامذہ کو اس خطرہ سے نپٹنے کے لیے تیار کیا۔

مولانا کشمیریؒ ہی تھے جنھوں نے قادیانی امت اور ان کے خطرناک عزائم کو سمجھا اور ان کی جھوٹی نبوت کی اصلیت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ان کے فکر نے ہمیں عمل پر آمادہ کیا۔ ان کی تصانیف میں بوئے صدیق اور قصائد میں غیرت فاروق تھی۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے پوری امت اسلامیہ کو متاثر کیا ہے۔ اُسے خواب غفلت سے بیدار کیا ہے۔ جدید نسل کو قادیانیوں کے دجل وفریب سے آگاہ کیا ہے۔ ان کی فکر آفاقی ہے، ان کا کلام الہامی ہے۔ ان کے اقوال میں پائیداری ہے اور انقلاب دوراں کا کوئی جھونکا مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی عظمت اور ان کی تحریک کو متاثر نہیں کر سکتا۔

حوالہ جات

۱ جامع ترمذی

۲ تاریخ مسلمانان عالم ص۸۵۴

۳ نقش دوام ص۱۸۲

۴ تاریخ مسلمانان عالم ص۸۵۰

۵ مقدمہ اکفار الملحدین

۶ مقدمہ خاتم النبیین ص۲۱

۷ ایضاً

۸ ایضاً ص۲۲

۹ نفحۃ العنبر ص۲۰۴

۱۰ مقدمہ خاتم النبیین ص۲۴

۱۱ الرشید ساہیوال صفر ۱۳۹۴ھ، ص۶۷۳

۱۲ تاریخ مشائخ چشت ص۷۱۴

۱۳ فیصلہ مقدمہ بہاولپور ص۳۵

۱۴ الرشید ص۶۸۶

۱۵ فیصلہ مقدمہ بہاولپور ص۱۸۳

۱۶ الرشید ص۶۸۷

۱۷ نطق انور ص۲۳

۱۸ انوار انوری ص۱۴۱

۱۹ روزنامہ زمیندار ۲۶/ مارچ ۱۹۳۳ء

۲۰ ایضاً

۲۱ فیصلہ مقدمہ بہاولپور ص۵۵

۲۲ ایضاً

۲۳ مولانا انور شاہ کشمیری کے علوم و معارف ص۳۱

۲۴ علوم و معارف ص۳۲

۲۵ انٹرویو از مولانا محمد طاسین

۲۶ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء

۲۷ ایضاً

۲۸ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۶/مارچ ۱۹۳۳ء

۲۹ ایضاً

۳۰ الرشید ص۶۹۱

۳۱ الرشید ص۶۹۳

۳۲ ایضاً

۳۳ مقدمہ خاتم النبیین ص۲۴

۳۴ بینات علامہ بنوری نمبر ص۳۶۱

۳۵ الجامعہ شعبان ۱۴۰۴ھ ص۹

۳۶ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور جولائی ۱۹۸۴ء

باب: ۱۰

تحریک آزادی میں شاہ صاحبؒ کا حصہ

آزادی ہند اور مولانا کشمیریؒ

مولانا کشمیریؒ کے متعلق تو عام طور پر یہی معلوم ہوتا تھا کہ آپ ایک دینی عالم ہوں گے جو مختلف دینی مدارس میں عام علماء کی طرح چٹائیوں پر بیٹھ کر طلبہ کو پڑھاتے رہے ہوں گے۔ ملکی سیاست اور ملکی حالات سے بے نیاز رہے ہوں گے لیکن آپ نے عام مولویوں کی طرح ایسا نہیں کیا بلکہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے سیاست میں بھی بھر پور حصہ لیا اور اس میدان میں آپ کے کارنامے کم نہیں ہیں۔ جیسا کہ آپ ان کی تفصیل دیکھیں گے۔

دارالعلوم دیوبند نے ابتداء سے اپنا تعارف ایک مذہبی ادارہ کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اور اپنا نصب العین مسلمانوں میں اسلامی علوم کی اشاعت اور دینی روح کی تربیت مقرر کیا تھا۔ شروع شروع میں یہ خیال تھا کہ اس دینی ادارے کو سیاست کے ہنگاموں سے دور رکھا جائے لیکن سیاست سے یہ اجتناب زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا اور رفتار وقت کے تقاضوں کے باعث سیاست کے قدم دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔

"شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تربیت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اور آپ کو سالہا سال تک ان کی خدمت میں رہنا پڑا تھا۔ اور یہ وہ ہستیاں تھیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی آگ سلگتی رہتی تھی۔ اس لیے شیخ الہندؒ میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ (۱)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو یقین تھا کہ انگریز ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور وہ ہندوستان جیسے مذہبی اور روحانی ملک کو بے دین بنانا چاہتا ہے۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے واقعات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اپنے والدین اور اکابرین سے وہ انسانیت

سوز مظالم اور بربریت کے واقعات ضرور سنے جو انگریزوں نے اہل ہند کے ساتھ کئے تھے۔اس لیے آپ کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت تھی۔

۱۸۵۷ء سے پانچ سال بعد ۱۸۶۲ء میں تحریک سید احمد شہیدؒ کے مجاہدین نے آزاد سرحد پر باقاعدہ جنگ شروع کردی جن کے مقابلہ کے لیے وائسرائے ہند کو کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ ۱۸۶۴ء میں انبالہ کے مقدمہ کے بعد تحریک دارالعلوم دیوبند شروع ہوگئی جو مسلمانانِ ہند کی ایک مہتمم بالشان مذہبی، علمی اور سیاسی تحریک تھی۔ (۲)

۱۹۱۴ء میں جب سیاسی اشخاص کی گرفتاری اور نظر بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ گرفتار ہوگئے تو ان حالات میں مولانا محمود حسنؒ کا حکم مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پاس پہنچا کہ ''میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہنچو''۔ (۳)

۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسنؒ تحریک آزادی ہند کے سلسلے میں حجاز مقدس روانہ ہوئے تو انگریز گورنمنٹ نے آپ کو گرفتار کرکے کئی سال نظر بند رکھا۔ تحریک حریت کے سلسلے میں خفیہ میٹنگوں کے بجائے کھلے عام جلسے ہونے لگے۔ خلافت کمیٹی وجود میں آئی۔ تحفظ ملت اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے جمعیۃ العلماء ہند قائم کی گئی جس کا پہلا اجلاس ۲۸/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں لکھنؤ کے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی زیر صدارت ہوا۔ (۴) ۱۳/ جون ۱۹۲۰ء میں مالٹا سے رہائی پانے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبند واپس آئے جہاں انگریزوں کے ساتھ ترک موالات اور تحریک خلافت نے آپ کو خاص طور پر سرگرم عمل کردیا۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ جب مالٹا سے رہا ہوکر مولانا موصوفؒ واپس آئے تو نصاریٰ سے ترک موالات کا مسئلہ زیر غور تھا۔ طے پایا کہ یہ مسئلہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے تحریر کرایا جائے۔ آپ نے فتویٰ لکھا اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا محمد انوریؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''صرف دس سطور تھیں لیکن ایسی جامع مانع کہ حضرت شیخ الہندؒ نہایت محظوظ ہوئے۔'' (۵)

مولانا محمد انوریؒ اپنے مضمون ''کمالات انوری'' میں لکھتے ہیں:

''جب حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ مالٹا سے تشریف لائے تو حضرت کو فکر تھی کہ یہاں کے علماء اختلاف نہ کریں اس لیے سب سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ سے انگریز کی ترک موالات کرنے اور ان کی ملازمت چھوڑنے پر فتویٰ حاصل کرلیا۔''(۶)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ شیخ الہند محمود حسنؒ کی سیاسی خدمات کا تذکرہ اکثر کرتے رہتے تھے جس کا ثبوت مولانا محمد انوریؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے جو علامہ کشمیریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ بارہا ان کو کہتے سنا گیا کہ:

''وہ جانبازی جو حضرت شیخ الہندؒ نے دکھائی ہے وہ تو کوئی کیا دکھائے گا؟ ہاں حق ضرور واضح کر دینا چاہیے اور یہ شعر آپ پڑھا کرتے تھے:

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے''(۷)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی اعلیٰ تعلیم کے آخری مراحل دارالعلوم دیوبند میں طے کئے تھے جہاں ان کے ذہن و فکر پر آخری نقوش شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے فیضان علمی سے ثبت ہوئے تھے۔ جن کی تحریک آزادی ہند کی سیاسی تحریک کا ایک روشن اور جلی عنوان ہے یہ تحریک ''ریشمی خطوط'' کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے طالب علمی کے زمانہ کی ایک ایک دلچسپ سرگزشت ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک دن میں حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کے سیاسی مسلک کے بارے میں دریافت کیا۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہے۔ اپنے استاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حضرت الاستاد نے دارالعلوم دیوبند کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء

کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ میں نے اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے حضرت الاستاذؒ نے دارالعلوم دیو بند قائم کیا تھا۔"(۸)

پاک و ہند کی آزادی کی جدوجہد کا یہی وہ شرارہ تھا، جو شیخ الہندؒ کے فیضان تربیت سے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ میں منتقل ہوا۔ علوم وفنون میں غایت شغف و انہماک کے باوجود وہ شرارہ رہ رہ کر ابھرتا رہا۔ ان کی طالب علمی کا آخری دور جس ماحول میں بسر ہو رہا تھا اس میں سیاست سے الگ تھلگ رہنا ان کے لیے مشکل تھا۔

دینی سیاسی جماعت جمعیت علماء ہند

سیاسی حیثیت سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ جمعیۃ علماء ہند میں شامل اور اس کی "مجلس عاملہ" کے رکن رہے اور اپنے مشوروں سے پاک و ہند کی آزادی کے لیے اس کی رہنمائی کرتے رہے، مولانا مفتی کفایت اللہؒ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کو اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھتے تھے جب تک اس میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی شمولیت نہ ہو۔(۹)

مولانا انظر شاہ مسعودیؒ اپنی کتاب "نقش دوام" میں مولانا کشمیریؒ کی سیاسی خدمات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ مولانا موصوفؒ کو اگرچہ قید و بند کی صعوبتوں سے واسطہ نہیں پڑا تاہم حریت پسندوں کی صف میں انھیں ایک مقام حاصل ہے۔ شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد جب پاک و ہند میں برطانوی پولیس نے دارو گیر کا ہنگامہ برپا کیا تو ایک روز مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مکان پر دوش پہنچنے والی تھی کہ آپ نے اس تمام ریکارڈ کو نذر آتش کر دیا جس میں شیخ الہندؒ کے خلاف انگریزوں کو شواہد ہاتھ آتے۔ آپ کبھی کبھی اپنے درس کے دوران اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے بجز ایک چائے کی پیالی دو بسکٹ اور ایک تلوار جس سے میں اعلاء کلمۃ اللہ کا کام لوں۔

دور حاضر کی سیاست کا جہاں تک تعلق ہے اور عہد حاضر میں آزادیٔ وطن اور آزادیٔ ہند کا جہاں تک سوال ہے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا اس میں وہی مسلک تھا جو عام طور پر ان

کے اکابر کا مسلک رہا ہے، وہ باوجود اس ضعف و ناتوانی کے بھی جیل میں جانے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے لاہور میں ایک دفعہ لائن والی مسجد میں علماء کو جو خطاب کیا۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے کہا کہ ''لو! میں اس قدر ضعیف ہو گیا ہوں کہ اب ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا ہے لیکن اس ضعف کے باوجود میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔''(۱۰)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جو خط مفتی کفایت اللہؒ کو جیل میں لکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصری تحریکات سے آپ کو کس قدر دلچسپی تھی۔

تحریک شیخ الہندؒ کے نام سے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جو برطانوی ریکارڈ سامنے آیا ہے اس سے بھی آپ کی سیاسی سرگرمیوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیخ الہند محمود حسنؒ نے ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے جو تحریک چلائی تھی، علامہ کشمیریؒ نے اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ کانگرس کے قائدین ابھی سو کر بھی نہ اٹھے تھے کہ یہ تحریک آزادی مسافت کا بڑا حصہ طے کر چکی تھی۔ ''تجلیاتِ انور'' میں ''مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا سیاسی مسلک'' کے عنوان سے جو مقالہ لکھا گیا ہے اس میں برطانوی ریکارڈ کے حوالہ سے مولانا موصوفؒ کے متعلق جو رپورٹ نقل کی گئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ مولوی انور شاہ کشمیریؒ جو مدرسہ دیوبند کے استاد اور نامور عالم ہیں جنگ بلقان کے زمانے میں انھوں نے ''ہلال احمر'' کے لیے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا۔ وہ غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کے بھی حامی تھے، مولوی انور شاہؒ بھی اس سازش میں شریک تھے، وہ مولانا محمود حسنؒ کے ہمراہ حجاز جانے والے تھے لیکن انھوں نے اپنے بعد ہندوستان میں قیام کرنے پر باصرار روک دیا۔(۱۱)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے سامنے تقسیم کار کا وہی طریقہ تھا جو حضرت عبدالعزیز دہلویؒ نے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے مامور کیا اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کو درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی مسند تفویض کی تھی تاکہ علمی اور سیاسی دونوں محاذوں کو تقویت پہنچتی رہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف یہ اسپرٹ ہمیشہ بیدار رہی ہے اور انگریز حکومت کی مخالفت میں علماء کا ایک طبقہ

ہمیشہ پیش پیش رہا ہے ۔ سامراجی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور مسلمانوں میں تحریک آزادی کی روح پھونکنے کی پاداش میں علماء نے قید و بند کی مصیبتوں کو برداشت کیا ہے اور اس طرح مردانہ وار مقابلہ کیا ہے کہ راہ حق سے کبھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے ۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں برادران وطن کے دوش بدوش حصہ لیا ہے ۔ آپ اپنے ملک کی سیاسی صورت حال سے بے خبر نہیں تھے ۔ ایک سیاسی ماہر کی طرح ملک کے سیاسی نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے تھے، ہم ان کے ایک قلمی فتویٰ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ وطن عزیز کی سیاسی صورت حال سے کس قدر باخبر تھے؟ ملکی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب ہندوستان کے حال پر غور فرمائیں کہ کفار نصاریٰ کے احکام اس ملک میں قوت و غلبہ کے ساتھ جاری ہیں کہ اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم دے کہ مسجد وہاں میں نماز باجماعت ادا نہ کرو تو کوئی امیر و غریب یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ نماز باجماعت ادا کر سکے اور یہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی ادائیگی قواعد فقہ کے حکم کے تحت نہیں بلکہ محض ان نصاریٰ کے قانون کے مطابق ہے کہ انھوں نے رعایا میں یہ حکم جاری کر رکھا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتا ہے حکومت اس کی مزاحمت نہیں کرے گی۔''

آگے لکھتے ہیں:

> '' ان نصاریٰ کو نکالنے کے لیے جہاد و جنگ اور کثرت سامان جنگ کی ضرورت ہے ۔ بہر حال ہندوستان پر کفار کا تسلط اس درجہ کا ہے کہ کسی زمانے میں اس سے زیادہ نہ تھا ۔ مسلمانوں کی مراسم اسلام کی ادائیگی محض ان کی اجازت سے ہے ۔ مسلمان جتنے عاجز ہیں ایسی عاجز دوسری رعایا نہیں ۔ ہندوؤں کو وہ رسوخ حاصل ہے جو مسلمانوں کو ہرگز حاصل نہیں ۔'' (۱۲)

<u>مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا صدارتی خطبہ:</u> ۶، ۷، ۸/ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ/ ۲، ۳، ۴/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو جمعیۃ علماء ہند کا آٹھواں سالانہ اجلاس پشاور میں ہوا جس کی صدارت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے کی ۔ جب یہ جلسہ ہونے والا تھا تو مسلم اخبارات نے جلی سرخیوں کے

ساتھ اس اجلاس کی اہمیت کو واضح کیا۔ ہفتہ وار مہاجر دیو بند اس اجلاس کے بارے میں لکھتا ہے:

''شیخ الحدیث مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحبؒ کی صدارت سے اس اجلاس کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے اس لیے کہ علامہ موصوفؒ آج دنیائے اسلام کے ان متبحر علماء میں سے ہیں جن پر ہمیشہ امت نے فخر کیا ہے اور جن کو مادر گیتی بہت کم پیدا کرتی ہے۔'' (۱۳)

صدارتی خطبہ: آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں درج ذیل امور پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

۱......ضرورت نظام ملی و تقسیم کار

۲......مفہوم اولی الامر کی تشریح

۳......نبوت و نظام تشریعی اور مسئلہ ختم نبوت

۴......قومیت اہل اسلام اور رابطہ دینی

۵......جمعیت علماء کا وجود

۶......جمعیت علماء کی قومی و ملی خدمات

۷......استحسان معاہدہ مسلمین یا غیر مسلمین

۸......دارالاسلام، دارالحرب، دارالامان

۹......نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ

۱۰......تجاویز اتحاد کانفرنس کلکتہ

۱۱......آئینی کمیشن

۱۲......صوبہ سرحد کی سیاسی حالت

۱۳......دہلی کے تجویز مفاہمت

۱۴......سندھ کی علیحدگی

15) ضروریات اسلامیہ حاضرہ: ۱......دارالقضاء شرعی کا فقدان اور مسلمانوں کی مصیبت

۲......مسلمان عورتوں کی بے کسی اور فتنۂ ارتداد

۳......منتخب امیر یا قاضی کے اختیارات

۴......فریضۂ تبلیغ

۵......عورتوں کو میراث سے محروم کرنا

۶......لڑکیوں کی شادیوں پر روپیہ لینے کی رسم

۷......اصول تبلیغ

۸......تربیت نو مسلمین

۹......اصلاح رسوم مہلکہ

۱۰......تحفظ اوقاف مسلمین

۱۱......اسلامی اخوت اور مسلمانوں کا باہمی تعاون

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے مسلمانوں کو جرأت مندانہ طور پر تحریک آزادی میں حصہ لینے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور اس معاہدہ سے جو ہجرت مدینہ کے بعد یہودیوں سے کیا گیا تھا، اسے ثابت کیا ہے کہ ملک کے دفاع کے لیے اگر مسلمان غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاسی جدو جہد میں حصہ لیں تو ان کا یہ عمل اسلام کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ معاہدہ کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا:

> ''معاہدہ کا موضوع صرف یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے اور ایک دوسرے کے جان و مال، عزت و آبرو پر حملہ آور نہ ہو۔ ایذا دہی کو حرام سمجھے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہو۔'' (۱۴)

<u>اسلام میں وطن کی محبت</u>: وطن کے ساتھ محبت اور لگاؤ کی شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے مولانا انور شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں:

> ''ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انھوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا تو خمیر ہی ہندوستان کی آب و گل سے بنا ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان

مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپیہ کی جائیدادیں ہیں۔ عالی شان تعمیرات اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان کے ساتھ ایسی ہی محبت ہے جیسے ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہیے اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولا اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔" (۱۵)

ہندو اور مسلم دونوں قوموں کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"بہترین صورت یہی ہے کہ دونوں قومیں ایک منصفانہ معاہدہ کر لیں" (۱۶)

حصولِ آزادی کے متعلق نظریہ: حصولِ آزادی کے متعلق آپ نے کہا:

" آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔" (۱۷)

صوبہ سندھ کی علیحدگی: اس ضمن میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کہا:

" آج سندھ کی علیحدگی کے لیے جو آواز بلند کی جارہی ہے کہ اس کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے بہر حال اس امر کا خاص طور پر اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ اب سندھ کی ۳۲ لاکھ کی آبادی کے مفاد میں ہم کو ہرگز غفلت نہ کرنی چاہیے اور بالاتفاق مطالبہ کرنا چاہیے کہ اسے علحدہ صوبہ کے ماتحت ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔" (۱۸)

دارالاسلام، دارالحرب، دارالامان: دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامان کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا "اس وقت ایک بات یہ بھی قابل غور ہے جس کے پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اول جو اسلامی حکومت اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔ دوسرے جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو دارالحرب میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تصریح فرمادی ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ کا یہ فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ

زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان ہیں اسلامیت کا رنگ بہت گہرا تھا۔ ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں۔'' (۱۹)

الغرض یہ کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے خطبۂ صدارت میں نہ صرف ملک کے سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ مسلم معاشرے کے معاشی اور اقتصادی مسائل پر بھی مسلمانوں کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے جو چیزیں ضروری ہوسکتی ہیں ان سب کا پوری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس لئے مولانا کشمیریؒ کا یہ خطبہ بڑی قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کو اپنی علمی اور درس وتدریس کی مصروفیتوں کے سبب عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور سیاسی میدان میں تگ ودو کا موقع نہ مل سکا مگر وہ اپنی دانش وتدبیر اور فکر ونظر سے ہندوستان کے سیاسی قائدین کی رہنمائی کرتے رہے۔ مجلس احرار اسلام کے قائدین کو بھی آپ کی فکری بصیرت اور سرپرستی حاصل تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے نامور مجاہدین آزادی مولانا ظفر علی خانؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، علامہ محمد اقبالؒ، مولانا محمد ذاکرؒ (جامعہ محمدی)، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ وغیرہم یہ سب حضرات دین وسیاست کی بڑی بڑی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر مولانا انور شاہ صاحبؒ کے براہ راست شاگرد ہیں اور باقی حضرات آپ کے حلقہ علم وعرفان میں زیر تربیت رہ چکے ہیں۔

سیاسی فہم وفراست: ہندوستان ضرور آزاد ہوگا:

> ''مرض موت میں ایک دفعہ مولوی حامد الانصاری غازیؒ کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ بھائی! ہمیں اب یقین ہوگیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیئے ہیں۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ دیر تک بقاء نہیں ہوسکتی اس لیے یقین ہوگیا ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آگئے ہیں۔'' (۲۰)

قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند دسمبر ۱۹۸۰ء میں لاہور آئے تھے تو انھوں نے ایک انٹرویو میں مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی یہ پیشین گوئی سنائی تھی۔ پھر کہنے لگے کہ ''حضرت شاہ صاحبؒ انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے ٹیکس کو ''ٹے کس'' بولتے تھے۔'' (۲۱)

قاری صاحبؒ کی یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ مولانا انظر شاہ مسعودیؒ کے بیان کے مطابق شاہ صاحبؒ نے بچپن میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ (۲۲)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے بقول آپ نے چھ ماہ میں انگریزی زبان سیکھ لی تھی اور انگریزی کتابوں سے براہ راست استفادہ کر لیتے تھے۔ (۲۳)

قاری صاحبؒ نے دوران گفتگو یہ بھی بتایا کہ ''جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس پشاور میں ہوا۔ شاہ صاحبؒ صدر مقرر ہوئے۔ خطبۂ صدارت مولانا حبیب الرحمانؒ سے لکھوایا کیونکہ آپ انگریزی نہیں جانتے تھے۔''

شواہد سے قاری صاحبؒ کی یہ بات بھی نادرست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل خطبہ فارسی زبان میں ہے جو قسط وار مختلف اخبارات میں شائع ہوا، بعض اخبارات نے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ راقم الحروف کو اس کی دو قسطیں ''مہاجر'' کی فائل میں ملی ہیں۔ جو میوزیم لائبریری لاہور میں موجود ہے اور اس کا مکمل ترجمہ پروین روزینہ نے اپنی کتاب ''جمعیت العلماء ہند'' جلد اول میں شائع کیا ہے۔ انگریزی کے ساتھ اس کا تعلق ہی نظر نہیں آتا۔

مختصر یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے وطن عزیز کو آزاد کرانے اور بدیشی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا حقیقت سے آنکھیں موند لینے کے مترادف ہوگا۔ آپ کی خدمات برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی پہلودار شخصیت اور ان کی ہمہ گیر زندگی جس کے ایک ایک گوشے میں متعدد انجمنیں اور ان گنت محفلیں برپا تھیں ہندوستان کی مذہبی، علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک فرد کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ان کا وجود ہماری تاریخ کا ایک اہم عہد تھا جس کی پشت پر شاندار عروج کی پرعظمت داستانوں، زوال کی ہیبت ناک کہانیوں، جہد آزادی کے ولولہ انگیز کارناموں اور تعمیر نو کی انتھک کوششوں کی مربوط اور مسلسل تاریخ تھی۔

حوالہ جات

۱ نقش دوام ص ۵۵۱
۲ علماء حق ج ۲، ص ۱۷۱
۳ الانور ص ۴۸۷
۴ ایضاً ص ۴۸۸
۵ حیات انور ج ۱، ص ۳۱۰
۶ کمالات انوری ص ۶
۷ ایضاً ص ۳۸
۸ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۶۴ء
۹ تجلیات انور ص ۲۶۰
۱۰ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۶ء
۱۱ تجلیات انور ص ۲۶۰
۱۲ ماخوذ از ہندوستان اور دارالحرب (قلمی)
۱۳ مہاجر دیوبند ۲/ دسمبر ۱۹۱۷ء
۱۴ جمعیت العلماء ہند ج ۱، ص ۴۰۰
۱۵ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱، ص ۲۴۴
۱۶ جمعیت العلماء ہند ج ۱، ص ۴۰۱
۱۷ ایضاً ص ۴۱۱
۱۸ ایضاً ص ۵۲۸
۱۹ علماء حق ج ۱، ص ۲۴۸
۲۰ انٹرویو از مولانا قاری محمد طیب دسمبر ۱۹۸۰ء
۲۱ ایضاً
۲۲ نقش دوام ص ۲۱۱
۲۳ نفحۃ العنبر ص ۹۴

باب: ۱۱

مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ہم عصر علماء میں سے اور بھی بہت مشہور عالم گزرے ہیں جیسے ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، سید حسین احمد مدنیؒ لیکن سب سے زیادہ آپ کا لگاؤ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر موصوفؒ اگر چہ انگریزی تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ تھے اور ان کی راہ ورسم بھی زیادہ تر انھی سے رہی لیکن دین اسلام کے ساتھ ان کا قلبی وطبعی لگاؤ مولانا کشمیریؒ کی کشش کا باعث بنا۔ بعض مسائل میں آپ نے ان کی رہنمائی بھی کی۔ خاص طور پر قادیانیت کے سلسلہ میں ڈاکٹر موصوفؒ کے ذہن میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے تھے ان کو دور کیا اور وہ ختم نبوت کے ایک زبردست مبلغ بن گئے جنھوں نے جدید طبقہ میں زبردست کام کیا۔ اس اہمیت کے پیش نظر اس عنوان کے تحت دونوں بزرگوں کے تعلقات اور علمی روابط کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے متعلق گفتگو کرتے وقت اکثر و بیشتر نقادان فن الجھن اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں کبھی کوئی انھیں محض شاعر سمجھتا ہے اور شاعری کے پیمانوں سے ان کے کلام کو ناپنا چاہتا ہے اور کوئی شخص کبھی اقبالؒ کو فلسفی سمجھتا ہے اور فلسفیانہ قوانین ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ اقبالؒ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، شاید اسی لیے کہا گیا ہے:

" A poet is struggling with a Philosopher."

اقبالؒ کی شاعری اور ان کا فلسفہ دست بدست اور قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؒ خود بڑے پائے کے فلسفی تھے۔ فلسفہ قدیم و جدید پر ان کی یکساں نظر تھی۔ علوم جدیدہ میں ان کو کمال حاصل تھا لیکن وہ بھی علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نگاہ التفات کے خواستگاروں میں سے تھے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اپنے خطبات The Reconstruction of Religious thoughts in Islam. کے لکھنے میں شاہ صاحبؒ سے کافی مدد لی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کو علامہ محمد انور شاہؒ کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ اور اکثر دینی امور میں آپ ہی سے رجوع کرتے تھے بلکہ کئی موقعوں پر علامہ

اقبالؒ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی علمی، دینی اور فقہی قابلیت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان سے رہبری اور رہنمائی حاصل کی۔ آپ کہا کرتے تھے" اس وقت روئے زمین پر انور شاہؒ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔"(۱)

مولانا محمد انوریؒ بیان کرتے ہیں کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ ان الفاظ میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا تذکرہ کرتے تھے: "جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا۔"(۲) ڈاکٹر موصوفؒ نے علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کی وفات پر تعزیتی جلسے میں کہا: "اُدھر پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"(۳)

عبدالرحمان کوندو ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ مشہور حدیث " لایسب احدکم الدھر فان اللہ ھو الدھر " (۴) میں دہر (بمعنی ٹائم) کا لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحبؒ سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران مولانا موصوفؒ نے مجھے اس مخطوطہ (غیتہ البیان فی تحقیق الزمان و المکان) کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر مجھے اس کی ایک نقل بھی ارسال کی۔"(۵)

مولانا محمد انوریؒ اس مخطوطہ کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی یہ وضاحت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے کہا: "یہ علامہ عراقیؒ کا ایک فارسی رسالہ ہے اس میں انھوں نے زمان و مکان کی بڑی عمدہ تحقیق کی ہے۔ نیوٹن نے جو کچھ لکھا ہے وہ چھ سو سال پہلے علامہ عراقیؒ نے لکھ دیا تھا۔ نیوٹن کی یہ اپنی تحقیق نہیں ہے۔"(٦)

یہ سن کر ڈاکٹر محمد اقبالؒ حیران رہ گئے۔ اس کے بارے میں یورپ کے اخباروں میں آرٹیکل شائع کرائے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے السنتہ الشرقیہ (مشرقی زبانوں) کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہوا تھا جس کے صدارتی فرائض ڈاکٹر موصوفؒ نے ادا کئے۔ اس جلسہ میں ملک کی دیگر یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے صدارتی خطبہ میں مولانا انور شاہؒ کی اس تحقیق کا ذکر کیا تو وہ بھی سن کر حیران رہ گئے۔(۷)

روابط کا آغاز

علامہ اقبال مرحومؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے تعلقات کا آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔جمعیت علماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے۔اس کے روح رواں مولانا عبدالقادر قصوریؒ وکیل تھے۔اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلاء ہال میں منعقد ہوا جو موجودہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے عقب میں ہے۔راقم نے اتنے علمائے دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا۔اس جلسہ کی صدارت ابوالکلام آزادؒ نے کی تھی۔مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا طاہر دیوبندی کی تھی............اسی جلسہ میں اول مرتبہ میں نے خود علامہ اقبالؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا تعارف کرایا تھا۔''(۸)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی متعدد ملاقاتیں رہیں۔علامہ اقبالؒ کی خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تا کہ علامہ خود اور اہل لاہور اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ ان کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی ضروریات اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب عملی طور پر بانجھ تھا۔اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں یہاں انجمن، کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت کی متاع نہیں بکتی۔''(۹)

ایسے میں علامہ اقبالؒ کی نظر انتخاب برصغیر ہند میں دو شخصیات پر ٹھہری جنھیں لاہور میں مستقل طور پر قیام کی دعوت دی جائے۔ایک سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، لیکن ان میں سے کوئی بزرگ بھی لاہور نہ آسکے۔ڈاکٹر چغتائی رقمطراز ہیں:

''ایک مرتبہ علامہ انور شاہ صاحبؒ لاہور میں اتفاق سے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرون موچی دروازہ رنگ محل لاہور) پیر عبدالقادر شاہؒ (م جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ) کے ہاں مہمان تھے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ نے انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور سے طے کر لیا تھا کہ اگر آپ یہاں آئیں تو آپ خطیب شاہی مسجد اور اسلامیہ کالج میں علوم دین کے سربراہ ہوں گے۔''(۱۰)

علامہ اقبال کا پیغام دعوت: مارچ ۱۹۲۵ء کو مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ انجمن خدام الدین لاہور کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تو علامہ اقبالؒ نے خط لکھ کر مولانا موصوفؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی عزیز الرحمانؒ کو اپنے ہاں شام کے کھانے کی دعوت دی۔(۱۱)

ڈاکٹر چغتائی اس ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> '' علامہ اقبالؒ کے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت تھی جس میں مذکورہ بالا علماء کے علاوہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولوی حبیب الرحمان لدھیانویؒ بھی مدعو تھے، اس وقت علامہ اقبالؒ کے مدنظر یہ تھا کہ کسی طرح علامہ انور شاہ صاحبؒ کو لاہور میں مستقل طور پر بلایا جائے۔''(۱۲)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے استعفاء پر مسرت کا اظہار: ۱۹۲۶ء میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ انتظامی اختلافات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ ہوئے تو علامہ اقبالؒ کو اس پر خوشی ہوئی۔ شاید اب وہ مولانا کو قیام لاہور پر راضی کر سکیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

> '' حضرت شاہ صاحبؒ کے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفاء کی خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ '' آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تأثر ہو، میں بہر حال شاہ صاحبؒ کے استعفاء کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا، کیا آپ کو دارالعلوم کے نقصان کا کچھ ملال نہیں، فرمایا۔ کیوں نہیں! مگر دارالعلوم کو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے لیکن اسلام کے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں وہ سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔''(۱۳)

تدوین فقہ: قاضی افضل حق کہتے ہیں کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ یا سید سلیمان ندویؒ کو لاہور میں بلانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس وقت زندگی کے ہر شعبہ میں جو مختلف مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ مرحوم چاہتے تھے کہ ''آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں، ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو، جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ ہم دونوں ہی اس کام کو کر سکتے ہیں۔ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سر چشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل شاہ صاحبؒ کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحبؒ بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک وتعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آئے گی۔''(۱۴)

علامہ محمد انور شاہؒ کے نام ٹیلیگرام: جب مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے دار العلوم سے استعفیٰ دے دیا تو علامہ اقبالؒ نے آپ کے نام جوابی تار دیا کہ آپ لاہور آجائیں۔ جب جواب نہ آیا تو مولانا عبد الحنان ہزارویؒ خطیب آسٹریلیا جامع مسجد لاہور کو دیوبند بھیجا تاکہ شاہ صاحبؒ سے براہ راست بات کر کے انھیں لاہور لایا جائے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ٹیلیگرام ملنے سے پہلے آپ ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکے تھے۔(۱۵)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ لاہور میں تو نہ آسکے لیکن ڈاکٹر اقبالؒ اور ان کے درمیان باقاعدہ خط وکتابت ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ خط وکتابت دینی امور کے بارے میں ہی ہوتی ہوگی۔ اس ضمن میں مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دار العلوم لکھتے ہیں:

> ''اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرتؒ ان کے شافی جواب لکھتے تھے۔''(۱۶)

مولانا محمد انوریؒ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جو خط حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر اقبالؒ کو تحریر کیے ان میں سے بعض تیس تیس صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔''(۱۷)

علامہ اقبالؒ کا علامہ کشمیریؒ کی تصانیف سے استفادہ: علامہ محمد اقبالؒ مولانا محمد انور شاہؒ کی

تصانیف کو نہایت دلچسپی اور غور وفکر سے پڑھتے اور ان کی کوئی کتاب چھپ کر آتی تو وہ علامہ موصوفؒ کے پاس بھیج دیتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی شاہ صاحبؒ کے ایک رسالہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت استاذؒ کا ایک منظوم رسالہ "ضرب الخاتم علی حدوث العالم"حدوث العالم کی بحث پر ہے۔ ۲۵ اشعار کا یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہے لیکن حقیقت میں اس مسئلہ پر قدیم وجدید فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے(۱۸) جب یہ رسالہ شائع ہوا تو آپ نے اس کی ایک کاپی علامہ اقبالؒ کو بھیجی۔ مولانا سعید احمد کا بیان ہے کہ:

> '' ڈاکٹر صاحبؒ جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اسی کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی تحفہ اس چندورقی رسالے سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور وفکر کے ساتھ پڑھا۔''(۱۹)

پروفیسر اختر کلیم اپنے مقالہ ''ڈاکٹر اقبالؒ اور مولانا انور شاہ صاحبؒ'' میں ڈاکٹر موصوفؒ کے ان تأثرات کو لکھتے ہیں جو انھوں نے شاہ صاحبؒ کے رسالہ "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" کا مطالعہ کرنے کے بعد بیان کئے تھے:

> '' کہنے لگے کہ میں تو مولانا انور شاہ صاحبؒ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسولؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں ان کو اس قدر درک وبصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔''(۲۰)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی بیان کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد اقبالؒ شاہ صاحبؒ کے چار اشعار کا مطلب نہ سمجھ سکے اور ان یعنی مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ شاہ صاحبؒ سے ان اشعار کا مطلب پوچھیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے وہ رسالہ میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس میں چار اشعار ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان پر نشان لگا دیا ہے۔ آپ اب دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے

جائیں اور شاہ صاحبؒ سے ان کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔''(۲۱)

مولانا موصوفؒ نے وہ رسالہ جناب شاہ صاحبؒ کو پہنچا دیا تو انھوں نے ان اشعار کا مطلب فارسی میں تفصیل سے لکھ کر دیا۔ اس کی تفصیل مولانا اکبرآبادیؒ یوں بتاتے ہیں :

''میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آ کر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحبؒ کا پیغام پہنچایا لیکن حضرت الاستاذؒ نے مجھے ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے اس کا جواب فارسی طویل خط میں لکھ دیا اور یہ خط میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کو پہنچا دیا۔''(۲۲)

<u>علامہ اقبالؒ اور علامہ کشمیریؒ کی آخری ملاقات:</u> علامہ اقبالؒ اور علامہ کشمیریؒ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا انور شاہ کشمیریؒ ''مقدمۂ بہاولپور'' کے سلسلہ میں ۱۹/ اگست کو وہاں پہنچے ۲۵/ اگست کو ان کا بیان شروع ہوا۔ جو متواتر پانچ دن تک جاری رہا۔ آپ کے شاگرد مولانا محمد انوریؒ ہمراہ تھے۔ سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس سفر کے دوران حضرت شاہ صاحبؒ نے لاہور میں بھی دو روز قیام کیا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں نماز فجر کے بعد وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء و عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوئے تھے۔''(۲۳)

اغلب یہ ہے کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ کی آخری ملاقات یہی ہو کیونکہ اس سفر سے جب آپ واپس دیوبند گئے تو سفر کی تکان کی وجہ سے تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور آخر ۲۹/ مئی ۱۹۳۳ء کو یہ عظیم محبّ اسلام، عاشق رسول، شاعر بے بدل ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گیا۔ پروفیسر کلیم اختر لکھتے ہیں:

''علامہ اقبالؒ اور مولانا انور شاہؒ کے دینی عقائد میں یگانگت تھی اور طبائع بھی آپس میں ملتے تھے۔ مولانا انور شاہؒ کی سیرت و کردار سے جو بات اجاگر ہوتی ہے وہ آپ کا مطالعہ سے عشق، بے پناہ حافظہ، حسن صورت، لطائف و مزاح، خودداری، رواداری، خدمت مذہب اور عشق رسول ہے۔ یہی خوبیاں ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی ذات میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔''(۲۴)

<u>علامہ اقبالؒ کے مختلف ادوار کی اصلاح میں علامہ کشمیریؒ کے فکری زاویوں کا کردار:</u> ایک

وقت وہ تھا جب علامہ موصوفؒ وحدۃ الوجود کے زبردست قائل تھے مگر ایک وقت آیا کہ اس مسلک سے اختلاف کیا۔ ایک وقت تھا کہ اقبالؒ وطنیت پرست تھے لیکن یہ دور بھی آیا کہ زمان ومکان کی قیود ٹھکرا کر اقامت دین پر ساری انرجی صرف کر دی۔ اسی طرح ایک زمانہ تھا جب علامہ موصوفؒ ذخیرہ حدیث کی طرف شک کی نگاہ سے دیکھتے مگر وقت آیا کہ احادیث کی اہمیت واضح ہوئی۔ اسی طرح قادیانیت کا مسئلہ تھا جس نے برصغیر پاک وہند میں دینی فضا مکدر کی تھی، تعلیم یافتہ طبقہ سخت اضطراب کا شکار تھا، یہ ڈاکٹر اقبالؒ ہی کا منتظر تھا۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے انھیں خط لکھ کر حقیقت حال سے آگاہ کیا تو وہ قادیانیت کے خلاف ایک پر جوش مبلغ بن گئے اور اس کے خلاف پر زور اور بصیرت افروز بیان دیا اور قادیانیت کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس وسوسہ میں مبتلا تھا بچ گیا اور قادیانی تحریک کے خطرناک عزائم سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ غرض علامہ اقبالؒ کی زندگی کے مختلف ادوار اور ان کی تدریجی اصلاح کی وجہ حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کی ملاقاتیں تھیں۔

ڈاکٹر اقبالؒ کا کشمیر سے تعلق: علامہ اقبالؒ روح اسلام کی جہاں گیریت اور اپنے فلسفے کی آفاقیت کے باوجود کشمیر اور کشمیریت کے لیے ایک خاص جذبہ اپنے قلب کے نہاں خانے میں محفوظ پاتے تھے۔ جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ذات سے آپ کے بے نظیر علم وعمل اور عبقریت کے علاوہ کشمیریت کی وجہ سے بھی علامہ کو محبت تھی۔ مولانا موصوفؒ کی وفات کے بعد ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ڈاکٹر اقبالؒ کے قلبی جذبات کی منہ بولتی تصویر ہے، جس کا پہلا قطعہ مولانا انور شاہؒ کی جدائی کے رنج وغم اور حسرت کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ شاعر مولانا محمد انور شاہؒ کے مقام پیدائش ''لولاب'' کو بھی اپنی سوگواری میں شریک بنا کر ''اے وادئ لولاب، اے وادئ لولاب'' کی تکرار کر رہا ہے۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں حضرت شاہ صاحبؒ منبر ومحراب کے حقیقی وارث، نواہائے جگر سوز کے نئے نواز، فغان سحر سے دلوں کو بیدار کر دینے والے درویش اور ایک عظیم الشان کشمیری تھے۔ یہ قطعہ پڑھ لینے سے علامہ اقبالؒ اور مولانا کشمیریؒ کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد عثمان نواسہ شیخ الہند اپنے مقالہ ''علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ''

میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبالؒ عالم اسلام کی ان بالغ نظر اور محرم اسرار شخصیتوں میں سے ایک شخصیت تھے جو وقت اور زمانہ کی گردشوں اور فرس دوران کی اس گردش کی نوعیتوں اور اثرات سے واقف تھے جو مدتوں سے روح اسلام کو دھندلا کرنے کا سبب بنتی رہی ہیں۔ وہ روایتی مذہب اور اس کی خالی از روح مقاومت کی کمزوریوں کا بھی شدید احساس رکھتے تھے اور اس کے لیے دردمندی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کے فکر و فلسفہ میں حقیقت کے خرافات میں گم ہو جانے اور امت کے روایات میں کھو جانے کے شدید احساسات پیدا کرنے والے عناصر نمایاں اور موجود ملتے ہیں۔ ان کا ذہن اس سلسلہ میں یہ تھا کہ اگر ان کے فکر اور مغرب سے ان کی واقفیت اور محرمانہ شعور کے ساتھ علامہ انور شاہ صاحبؒ کا علم اور رہنمائی معاونت اور دلربائی شامل ہو جائے تو اتحاد ذہن سے جو چیز پیدا ہوگی وہ مغربی فلسفہ اور تہذیب پر اسلامی فکر و فلسفہ کے تفوق کی ضامن بن جائے گی۔''(۲۵)

مختصر یہ کہ علامہ اقبالؒ کے خیالات پر علامہ انور شاہؒ کے خیالات و نظریات کے فیصلہ کن اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں اور ان اثرات کے مشاہدات کی بدولت علامہ اقبالؒ کے خیالات پر علامہ انور شاہؒ کے فن و کمال اور جلالت و شان کے اعتراف و احترام کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱ الرشید ساہیوال شوال ذی قعد ۱۳۹۸ھ
۲ کمالات انوری
۳ اقبال کے ممدوح علماء ص ۱۳۴
۴ مشکوٰۃ المصابیح ج ۲، ص ۱۲۳
۵ الانور ص ۵۷۱
۶ انوار انوری ص ۱۵۰
۷ ایضاً
۸ بادشاہی مسجد لاہور ص ۳۷
۹ اقبال نامہ ج ۲، ص ۴۸
۱۰ بادشاہی مسجد لاہور ص ۳۸
۱۱ اقبال نامہ ج ۲، ص ۲۵۷
۱۲ اقبال کے ممدوح علماء ص ۳۷
۱۳ حیات انور ج ۱، ص ۱۹۳
۱۴ ایضاً ص ۳۹
۱۵ چٹان لاہور جنوری ۱۹۷۵ء
۱۶ سیرت انور ص ۸۴
۱۷ الانور انوری ص ۱۰۴
۱۸ حیات انور ص ۱۹۰
۱۹ الانور ص ۵۶۸
۲۰ الرشید ص ۴۲۴
۲۱ الانور ص ۵۶۹
۲۲ حیات انور ص ۱۹۲
۲۳ الانور ص ۵۷۲
۲۴ الرشید ص ۴۲۴
۲۵ تجلیات انور ص ۱۹۳

باب: ۱۲

تصانیف اور علمی نگارشاتؒ

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علمی کارناموں کے سلسلہ میں مختلف عنوانات کے تحت آپ کی بعض تصنیفات و تالیفات کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اگر کوئی محقق ان کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تالیفات کو ایک نظر میں دیکھنا چاہتا ہو تو اس لیے آپ کی تمام مصنفات کو ایک جگہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ کون کون سی کتب و رسائل مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے قلم سے تحریر کئے ہیں اور وہ کس سال میں کس ادارے کی طرف سے شائع ہوئے ہیں اور ان میں بعض کے اہم موضوعات کی فہرست بھی مقالہ میں شامل کی ہے۔ اسی طرح آپ کی درسی امالی جو آپ کے بعض شاگردوں نے ترتیب دے کر شائع کی ہیں ان کا بھی تفصیلاً تعارف کرایا گیا ہے۔ اور ابھی تک بہت سی تالیفات ایسی بھی ہیں جو طبع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کی بھی ایک فہرست دی ہے۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین اور تقاریر کو جمع کیا ہے ان سب کی تفصیل آپ اس باب میں ملاحظہ کریں گے۔

تصنیفات و تالیفات: علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات و شخصی علوم کا ادراک اس بات کی قطعی ضمانت نہیں ہے کہ لوگ اس ہستی میں موجود ہر نوع کے کمالات اور فنون سے آگاہ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات میں اور اس وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گزری ہوں گی جن کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہوگا اور یہ بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کی محض عددی کمیت و اکثریت کی بناء پر علامۂ زمان بن جائے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ علماء اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے موتی موجود ہیں جو کسی تاج مرصع کی زینت نہیں بنے۔ مقدمۃ الفہرست لابن الندیم (۱) میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ پندرہ روزہ الداعی، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی اس رائے کو نقل کرتا ہے جو انھوں نے حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العیدؒ جیسے محقق کے متعلق دی تھی کہ امت محمدیہؐ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گزرا، اگر ان کی کتاب "احکام الاحکام "یا" کتاب الامام بشرح الالمام " کی ناتمام نقول کتابوں میں نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔ کیا کوئی گمان کر

سکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصریؒ اپنی کثرت مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العیدؒ جیسے محقق روزگار سے سبقت لے جائیں گے۔(۲)

بسا اوقات دفتر تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ معاصرین ،فیض یافتہ اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کے لیے اس کا پورا احساس بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء امت اور ارباب ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہ جاتی ہے۔ مولانا انظر شاہ مسعودیؒ مولانا انور شاہ صاحبؒ کے ایک شاگرد مفتی محمود کی اپنے استاد مکرم کے بارے میں رائے نقل کرتے ہیں کہ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے زیادہ کامیاب کوئی مصنف اور حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ سے بڑھ کر کوئی مدرس پیدا نہیں ہوا۔(۳)

ایک دفعہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے استاد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کو اپنی ایک تالیف پڑھ کر سنائی جو اتنی زیادہ دقیق اور علمی انداز میں لکھی ہوئی تھی کہ انھوں نے خود شاہ صاحبؒ کو اس کی شرح بھی لکھنے کو کہا تاکہ اساتذہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔(۴)

سید سلیمان ندویؒ شاہ صاحبؒ کے کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> ''مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں۔''(۵)

آپ شاہ صاحبؒ موصوف کی قوت حفظ اور ان کی وسعت علمی کے بھی بڑے معترف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ مرحوم معلومات کے دریا، حافظ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے۔ ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے۔(۶)

حضرت محمد انور شاہ کشمیریؒ نے باوجود اس محیر العقول جامعیت، تبحر، کثرت معلومات، وسعت مطالعہ، استحضار و قوت حفظ کے شوق سے کبھی تالیف و تصنیف کا ارادہ نہیں کیا اور اہل علم کی یہ خواہش ہی رہی کہ کاش! کسی اہم کتاب حدیث پر کوئی اپنی تصنیف یادگار چھوڑ جاتے۔(۷) اگرچہ حدیث پر آپ کی درسی امالی جو آپ کے بعض شاگردوں نے

ترتیب دی ہیں متعدد ہیں لیکن باقاعدہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اسی خواہش کے پیش نظر آپ کے ایک شاگرد مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے ایک دفعہ شاہ صاحبؒ سے کہا:

''اگر آپ جامع ترمذی وغیرہ کی کوئی شرح تالیف کر دیتے تو پسماندگان کے لیے سرمایہ ہوتا، غصہ میں آ کر کہنے لگے'' زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے۔''(۸)

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اپنے مواعظ میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ بھاگلپور میں علماء کا اجتماع ہوا تھا، مولوی انور شاہ صاحبؒ بھی تشریف لے گئے تھے۔ جلسہ میں پہلے بڑے بڑے عمامے اور جبے والے مولوی موجود تھے۔ مگر ایک ہندو نے مولوی انور شاہ صاحبؒ کو دیکھ کر کہا کہ یہ شخص اس مجمع میں سب سے بڑا عالم معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ نہ جبہ پہنے ہوئے تھے نہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ معمولی لباس میں تھے گویا اپنی طرف سے انھوں نے اپنے کو چھپانا چاہا مگر علم وعمل کا نور کہاں چھپتا ہے؟ وہ تو چہرہ سے عیاں ہوتا ہے۔''(۹)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جب مناظرے کے لیے جاتے تو آپ بھی ساتھ ہوتے تھے اور کتابوں کے حوالے کتاب کا نام، صفحہ نمبر، مصنف کے نام کی نشان دہی آپ کے سپرد ہوتی تھی۔ کبھی آپ ان کے ساتھ نہ ہوتے تو کہتے تھے:

''آج حوالوں کے لیے دقت پیش آئے گی کیونکہ آج میرا کتب خانہ ساتھ نہیں ہے۔''(۱۰)

شیخ کشمیریؒ نے مستقل طور پر کوئی رسالہ یا کتاب نہیں لکھی۔ آپ کی تصانیف امالی ہیں جن سے کتابیں بنالی گئیں یا تصریحات ہیں جنھیں آپ نے عنوان دے کر علیحدہ بیان کیا ہے۔ اگر آپ تصنیف وتالیف میں لگ جاتے تو آپ علوم اور تحقیقات کے دریا بہا دیتے اور آپ کے علمی نوادرات کائنات علم کو متقدمین اہل علم وفضل کی کثرت کے باوجود منور کر

دیتے۔ آپ نے محض وقتی طور پر درپیش دینیہ اور اسلامیہ مسائل کی وجہ سے چند رسائل تصنیف کیے ہیں۔"(۱۱)

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا معمول یہ تھا کہ ہر کتاب، چاہے جس علم کی ہو اور کسی بھی مصنف کی ہو جو آپ کو ملتی اس کا شروع سے اخیر تک مطالعہ کرتے تھے۔ آپ متقدمین اور اکابر محققین کی کتابوں کے مطالعہ سے پورا پورا استفادہ کرتے تھے۔ آپ کا درس محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی اور دیگر علوم جدیدہ پر مشتمل ہوتا تھا۔(۱۲) جب آپ کسی نفیس چیز یا کسی بلند تحقیق پر مطلع ہوتے تو اس کو محفوظ کر لیتے، آپ کے ان نوادرات کے اندراج میں چند اصول تھے، جن کی آپ رعایت کرتے تھے وہ اصول حسبِ ذیل ہیں:

۱) ان مسائل کو درج کرتے جن سے قرآن یا حدیث یا فقہ یا اصول فقہ یا علم الحقائق یا علم الکلام اور توحید وغیرہ علوم کے مشکل مسائل کی عقدہ کشائی ہوتی اور کبھی آپ ان علمی مسائل کو بھی قلم بند کر لیتے جو مشکل کے حل میں استشہاداً یا تنظیراً مفید ہوں۔

۲) جب آپ کے سامنے مذہب حنفی کی کوئی دلیل یا جو چیز تائید میں استشہاد میں دلیل کا فائدہ دے یا اس کا اس دلیل کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق ہوتا جو آپ کی فکر دقیق کے سامنے واضح ہوتا۔

۳) جب آپ کسی مسئلہ یا کسی مشکل کے حل میں جمہور کے مسلک کے خلاف کوئی خاص تحقیق کر رہے ہوتے اور دوران مطالعہ کوئی ایسی چیز ظاہر سامنے آتی جو اس تحقیق کے لیے مفید ہو یا اسے تقویت دیتی ہو یا آپ کے مقصود پر دلیل ہو تو آپ اسے بھی ضبط تحریر میں لے آتے۔

<u>مثال کے طور پر:</u> عماء کا مسئلہ! اس کی ماہیت کیا ہے؟ آیا قدیم ہے یا حادث؟ ترمذی کی اپنی "سنن" میں زرین عقیلی سے روایت کردہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "کان اللہ فی عماء" کا کیا مطلب ہے؟ روح و نفس کا مسئلہ اور ان سے متعلق تحقیقات، تجلی کی حقیقت، معیت دہریہ، سبقت دہریہ، معیت سرمدیہ ازلیہ، باری سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے مقدورات ازلیہ پر وجود کے اضافہ کی کیفیت، عالم مثال کی حقیقت اور اس جیسے دیگر علوم

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے پاس نوٹ بک میں علمی مشکلات کے حل کے لیے علم کے ذخائر اور نفیس مباحث جمع ہوگئے اور حدیث کے بعض اہم اختلافی مسائل پر آپ کی نوٹ بک سے آپ کے شاگردوں، ساتھیوں اور مستفیدین نے مواد لے کر رسالے تالیف کئے، آپ بعض مشکل مسائل سے متعلق اہم نکات نوٹ کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تالیفات میں سلاست اور روانی نہیں ہے۔ حوالوں کی کثرت ہے جس سے عام قاری کو سخت مشکل پیش آتی ہے۔ شیخ ابوغدہؒ لکھتے ہیں :

''آپ دیکھیں گے کہ ان کی تالیفات جملہ عبارات کو اچھی طرح ادا کرنے کے بجائے دوسری کتابوں کے حوالوں سے بھری ہوئی ہیں۔'' (۱۳)

مختصر یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے انھی نوٹس کو اپنے حین حیات ہی میں خود مرتب کیا ہے یا پھر آپ کی املائی تقاریر اور ملفوظات ہیں جنھیں مجلس علمی ڈابھیل اور کراچی نے شائع کیا ہے۔ تحقیق وتلاش کے بعد راقم الحروف کو آپ کی جو تصنیفات وتالیفات میسر آئی ہیں ان کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے جن میں سے بائیس (۲۲) مولانا موصوفؒ کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہیں اور طبع ہو چکی ہیں۔ سات ایسی تالیفات ہیں جو درسی تقاریر ہیں اور جنھیں آپ کے بعض شاگردوں نے ترتیب دے کر شائع کرا دیا ہے اور نصف سے زائد ایسی مؤلفات ہیں جو ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔

اب مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تصنیفات وتالیفات کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی قلمی تصنیف مشکلات القرآن کو لیتے ہیں۔

۱۔ مشکلات القرآن : یہ آپ کی ان تصانیف میں سے ہے جنھیں آپ کی وفات کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ کتاب دوسری کتابوں سے مختلف ہے۔ یہ عربی، فارسی اور اردو تینوں کا مجموعہ ہے۔ زیر نظر نسخہ مشکلات القرآن کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے مجلس علمی ڈابھیل نے دسمبر ۱۹۳۷ء کو علی پریس مالیگاؤں سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع میں دو مقدمے بھی شامل ہیں۔ ایک آپ کے شاگرد و داماد مولانا احمد رضا بجنوریؒ مؤلف ''انوار الباری'' کے قلم سے بعنوان " حكمة الناشر " ایک بسیط مقدمہ ہے دوسرا مقدمہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا لکھا ہوا ہے جو " يتيمة البيان

لمشکلات القرآن " کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کا اردو میں ترجمہ صاحب سوانح کے صاحبزادے مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ نے کر کے تین قسطوں میں دارالعلوم (دیوبند) میں شائع کیا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ "مشکلات القرآن" کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"قرآن کریم کی جن آیات کو مشکل خیال فرمایا تھا خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہوں یا کلامی حیثیت سے، سائنس کی رو سے ہوں یا کسی عقلی پہلو سے یا علوم عربیت و بلاغت کی جہت سے ہوں ان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی۔ اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ اس کو نقل فرمایا۔" (۱۴)

آگے لکھتے ہیں:

"یہ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش بہا گنجینہ ہے، اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جا کر کتاب ختم ہوگی۔"

انظر شاہ مسعودیؒ اپنی کتاب "نقش دوام" میں تحریر کرتے ہیں:

"مولانا احمد رضا بجنوریؒ نے حواشی میں ان تمام کتابوں کی طرف مراجعت کر کے جن کے مولانا شاہ صاحبؒ نے "مشکلات القرآن" میں حوالے دیئے ہیں اصل عبارت نقل کر دی ہے، اس طرح یہ تالیف ایک نایاب ذخیرہ بن گئی ہے۔" (۱۵)

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ اپنی کتاب "مولانا انور شاہؒ کی حیات اور علمی کارنامے" میں صفحہ ۲۶۰ پر مشکلات القرآن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ان (مولانا انور شاہؒ) کی وفات کے بعد ترتیب دی گئی اور صفحہ ۲۶۱ پر اس کا سن طباعت ۱۳۴۷ھ لکھتے ہیں۔

اس کتاب کا یہ سن طباعت غلط ہے کیونکہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کی وفات کا سال ۱۳۵۲ھ ہے تو ظاہر ہے اس کتاب کی اشاعت کا سال وفات کے بعد ہی ہوگا۔

مشکلات القرآن میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۹۰ قرآنی آیات پر محققانہ بحث کی ہے۔ یہ قرآنی آیات کتاب اللہ کی ۴۸ سورتوں سے ماخوذ ہیں۔

سورت کا نمبر	آیات کے نمبر
۱	۶
۲	۲، ۱۹، ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۶۲، ۸۱، ۸۴، ۹۰، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۱۷، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۴، ۱۷۳، ۱۷۸، ۱۸۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۱۳، ۲۲۲، ۲۳۱، ۲۳۹، ۲۷۵، ۲۸۲۔
۳	۱۹، ۴۳، ۷۳، ۸۱، ۹۳، ۱۰۴، ۱۱۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۳، ۱۴۴، ۱۶۷
۴	۱۵، ۲۴، ۲۵، ۴۳، ۴۸، ۶۴، ۸۸، ۹۲، ۹۳، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۳، ۱۵۰، ۱۵۹
۵	۵، ۶، ۱۷، ۱۹، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۷۵، ۸۲، ۸۷، ۹۶، ۱۰۶
۶	۶، ۷۶، ۱۲۸، ۱۵۱، ۱۵۸
۷	۴۴، ۴۸، ۱۴۵، ۱۵۶، ۱۸۸، ۲۰۴، ۲۰۵
۸	۱۶، ۴۱، ۷۲
۹	۱، ۷، ۲۸، ۷۴
۱۰	۱۸، ۴۵، ۴۷، ۸۸
۱۱	۱۰۷، ۱۱۴
۱۲	۷۶، ۱۰۰
۱۳	۳۳، ۴۴، ۶۷، ۷۰، ۷۲، ۱۱۲، ۱۲۴
۱۸	۲۱، ۶۹
۱۹	۶۴
۲۱	۲۲، ۶۳، ۹۲
۲۲	۲، ۵۲
۲۳	۱۰۲، ۱۱۲
۲۴	۲، ۳، ۳۱

۲۵	۷۷
۲۷	۸۰
۲۸	۲۳
۲۹	۲۷،۳۵
۳۰	۷،۸
۳۱	۱۴
۳۲	۵،۲۳
۳۳	۴،۳۵،۴۰،۴۳
۳۶	۴۰،۳۸
۳۷	۱۶۴
۴۲	۵۱
۴۳	۴۵،۶۰،۶۱
۴۸	۲۵
۴۹	۱۴
۵۰	۳۱،۳۴،۳۵
۵۱	۵۶
۵۳	۱،۱۱
۵۴	۱
۵۵	۶
۵۷	۱۳،۲۷
۶۵	۱،۴،۶،۷،۱۲
۶۸	۴۲
۶۹	۴۴
۷۲	۲۶

۷۳	۱
۷۵	۱۶
۸۶	۱۱
۸۷	۱۵
۱۰۹	۲،۱

۲۔فصل الخطاب فی مسئلة ام الکتاب : آپ کی یہ کتاب ۱۳۳۸ھ کی تصنیف ہے۔ یہ یونیورسل پرنٹنگ ورکس دہلی میں طبع ہوئی ہے اور ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب نے اس کتاب کے صفحوں کی تعداد ۱۰۵ لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"اللهم لك الحمدُ دائماً مع خلودك ولك الحمد حمداً ۔"

پھر مقصد تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں: " ان غرضی أن أحصل علی غرض الشارع أولاً " یعنی میں نے اس رسالہ میں مسئلہ خلف الامام کو اس طرح منقح کرنے کی کوشش کی ہے کہ شارع علیہ السلام کی غرض وغایت واضح طور پر متعین ہو جائے۔

اس کتاب میں حدیث عبادہ بن صامتؓ بروایت محمد بن اسحاقؒ پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔صرف لفظ ''فصاعداً'' کی تحقیق بارہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ضمناً نحو اور معانی کے دقیق ترین مباحث بھی آگئے ہیں۔اس رسالہ کے لکھنے کا مقصد شافعیہ یا کسی اور کا رد نہیں بلکہ احناف کے مسلک کی توضیح ہے۔آخر میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس مقصد تالیف کی وضاحت کرتے ہیں:

" فاعلم أني ما كتبت هذا السطور بقصد الرد على الشافعيه، و انما كتبتها ليعلم وجه الحنفية في اختيارك الترك ـــــ الخ "

کتاب کے خاتمے پر یہ شعر درج ہے:

وقفت بها صحبی و جددت عهد هم
وانی علی امثال تلك لحابس

''فصل الخطاب'' کی تردید میں حافظ عبداللہ امرتسری (روپڑی) نے "الکتاب المستطاب فی جواب فصل الخطاب" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جو پہلی بار ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ حافظ موصوفؒ نے اپنے رسالہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ پر نہ صرف فقہی اعتبار سے اعتراضات کئے ہیں بلکہ ان کی عربی گرائمر کی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

مولانا محمد انوریؒ بیان کرتے ہیں کہ مولانا خیر محمدؒ مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان نے مولانا انور شاہ صاحبؒ سے مذکورہ کتاب کے بارے میں پوچھا کہ انھوں نے اس کتاب کو دیکھا ہے یا نہیں؟ تو شاہ صاحبؒ نے جواب دیا ''میں جہلاء حمقاء کی کتابیں نہیں دیکھا کرتا'' مولانا خیر محمد اس وقت اس کے جواب میں ایک رسالہ "خیر الکلام فی ترك الفاتحه خلف الامام" لکھ رہے تھے اور کئی مسائل انھوں نے شاہ صاحب سے پوچھ کر اس میں شامل کئے''۔(۱۶)

مقالہ نگار نے مولانا شاہ صاحبؒ کے ایک شاگرد حافظ سید محمد نعمان صاحب سے انٹرویو لیتے ہوئے دریافت کیا کہ آیا ''الکتاب المستطاب'' [۱] کے جواب میں کوئی کتاب لکھی گئی تھی یا نہیں؟ ۔ حافظ صاحب نے اس کی تردید میں لکھے گئے دو رسالوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا ذکی الدین نے ''الدقیق فی کتاب'' کے نام سے ۶۴ صفحات کا ایک تردیدی رسالہ لکھا جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا رسالہ حافظ صاحب نے خود ''الاعتصام النور'' کے نام سے لکھا تھا جو ۱۹۳۴ء میں چار مینار اعظم پریس حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔(۱۷)

۱: ڈاکٹر محمد رضوان اللہ نے اپنے مقالہ میں فصل الخطاب کی تردید میں لکھے گئے رسالہ ''الکتاب المستطاب'' کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

اول الذکر رسالہ کا پورا نام حافظ موصوف کو یاد نہیں تھا نیز انھوں نے اس رسالہ کا سال طباعت ۱۹۲۸ء بتایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ'' الکتاب المستطاب '' جس کی تردید میں مذکورہ رسالہ مولانا ذکی الدین صاحب نے لکھا تھا ۱۹۲۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی تو قبل از وقت واویلا کے کیا معنی؟ شاید حافظ صاحب کو صحیح سن طباعت یاد نہ ہو۔ راقم الحروف نے حافظ موصوف سے ان کے اپنے رسالہ کے دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے بقول '' وہ رسالہ اب میرے پاس نہیں ہے۔''

۳۔ **خاتمة الخطاب فی مسئلة فاتحة الکتاب** : یہ رسالہ بھی قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ پر فارسی زبان میں ہے۔ یہ بیس (۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے یہ رسالہ بلا مراجعت کتاب صرف دو روز میں تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب لکھتے ہیں :

'' اسے شاہ صاحبؒ نے اپنے ابتدائی دور میں جب کہ ان کا قیام دہلی میں تھا، تصنیف کیا تھا۔'' (۱۸)

اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کہتے ہیں :

" ابتداء عهد بالتدريس فی دار العلوم الديوبندية " (۱۹)

یعنی دار العلوم دیوبند میں قیام کے ابتدائی سالوں میں یہ رسالہ آپ نے تحریر کیا تھا۔

یہ دونوں تحقیقات درست نہیں ہیں۔

اس لیے کہ صاحب رسالہ خود رقمطراز ہیں:

'' و ایں رسالہ را ۸/ محرم ۱۳۲۰ھ بعد نماز فجر شروع کردہ روز عاشورہ بعد نماز ظہر تمام شد ''

مولانا انور شاہ صاحبؒ کی اس تحریر کے مطابق اس رسالہ کی تالیف کا زمانہ ۱۳۲۰ھ ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب آپ مدرسہ امینیہ دہلی سے رخصت لے کر اپنے وطن کشمیر چلے گئے تھے۔ (۲۰) اور دار العلوم دیوبند میں آپ کی تدریس کا آغاز ۱۳۲۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ (۲۱) اور دہلی میں آپ کے قیام کا ابتدائی زمانہ ۱۳۱۵ھ ہے۔

لوح کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''یہ رسالہ ''خاتمہ الخطاب فی مسئلہ فاتحہ الکتاب'' دہلی مسجد سنہری میں مؤلف سے بقیمت ملتا ہے۔''

صفحہ بیس پر مولانا محمد عبدالغفورؒ اور مولانا محمود حسنؒ صدر مدرسین دارالعلوم کی تقریظیں لکھی ہوئی ہیں۔ رسالہ کا افتتاح ان عربی اشعار سے ہوتا ہے ؎

واذا کنت فی المدارك غرا
ثم الصبوت حاذ قالا تمار
واذا لم تر الهلال فسلم
لاناس رأوه بالا بصار

اس رسالہ کا موضوع بحث یہ ہے۔

۱) مقتدی کی قرأت کے بارے میں ائمہ اربعہؒ کا مسلک۔

۲) مختصراً ائمہ ثلاثہؒ کے دلائل ۳) دلائل امام اعظمؒ۔ نماز کی مشروعیت کے وقت ہی سے مقتدی کے لیے عدم قرأت کی تحقیق اور قرأت امام کا مقتدی کے لیے کافی ہونا نیز نماز امام کا نماز مقتدی کو متضمن ہونا۔

۴) نماز امام، نماز مقتدی کو متضمن ہے، احادیث نبویہ سے استنباط۔

۵) نماز امام کا نماز مقتدی کو متضمن ہونا، ابتدائے مشروعیت امامت ہی سے ہے۔ سکتات امام کے دوران قرأت کے شبہ کا جواب۔

۶) " من کان له امام فقرأة الامام له قرأة " کے رواتِ سند کی توثیق اور حافظ ابن حجر کی تضعیف کا جواب۔

۷) اس شبہ کا جواب کہ اگر ابتداء مشروعیت امامت ہی سے قرأت امام مقتدی کے لیے کافی تھی تو بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کیوں منقول ہے؟۔

۸) حدیث " واذاقرأ فانصتوا " کی تخریج اور اس کے متابعات۔

۹) " واذا قرئ القرآن " والی آیت مولانا محمد انور شاہؒ کی تحقیق کے مطابق مدنی ہے مکی

نہیں۔

۱۰) مثبتین قرأت مقتدی کے دلائل کے جوابات

۱۱) حدیث عبادہ کی توجیہہ۔

۴۔عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی یہ تصنیف عربی میں ہے۔اصل کتاب ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ابتداء میں ۳۲ صفحات کا ایک مقدمہ ہے جسے مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ۱۹۶۰ء میں لکھ کر کتاب ہذا کے ساتھ شامل کر دیا۔۱۶ صفحات پر مبنی فہرست مضامین ہے۔زیر نظر نسخہ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء میں مجلس علمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ مقدمہ کا اردو ترجمہ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نے بینات کراچی میں پانچ قسطوں میں شائع کیا ہے۔

اس تالیف کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ رقمطراز ہیں:

''یہ چند سطریں عربی میں ہیں۔اس رسالہ کا نام میں نے "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" رکھا ہے۔اس کو ابتدأ میں نے صرف طلبہ کو املا کرادیا لیکن آج ۲ رمضان ۱۳۴۳ھ میں اس کو رسالہ کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔اس کتاب میں میں نے ایسی دلیلیں دی ہیں جن سے عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ثبوت ملتا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کا نزول قیامت کے قریب ہوگا۔''

نوٹ : ڈاکٹر رضوان اللہ نے رسالہ خاتمة الخطاب فی مسئلہ فاتحة الکتاب کے موضوع پر بحث کے بارے میں کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔

اس رسالہ کا دوسرا نام آپ نے" حیات المسیح بمتن القرآن و الحدیث الصحیح" بھی لکھا ہے۔

اس رسالہ کی وجہٴ تالیف یہ تھی کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے عیسیٰ ابن مریم، مہدی مسیح موعود، رسالت و نبوت کے مختلف دعوے کئے تھے، اپنی وحی کو مثل قرآن کہا۔ جہاد اور حج کو منسوخ کیا، اس کے پیروکار برطانوی حکومت کے زیر سایہ اپنی کارروائیاں کر رہے تھے تو مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس سے بڑے مضطرب ہوئے اور ان کی جھوٹی نبوت کو رد کرنے کے

لیے یہ کتاب لکھ دی۔ آپ نے اس کتاب کے مباحث کو سترہ فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے ضمنی مباحث میں موضوع کی مناسبت سے آپ نے بہت اہم اور نادر تحقیقات پیش کی ہیں۔ مثلاً یاجوج ماجوج، ذوالقرنین، سد سکندری اور ختم نبوت کی تفسیر بڑے بلیغ انداز میں درج کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ عقیدہ ضروریات دین میں سے ہے۔

مجلس علمی ڈابھیل نے ''الرشید، القاسم، الامداد، ہفتہ وار مدینہ اور روزنامہ الجمعیہ دہلی'' میں اپنی مطبوعات کے بارے میں جو اشتہار دیا ہے اس میں زیر تبصرہ کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> '' مرزا قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر ہی اپنی نبوت کاذبہ کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے، حیات عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ قرآن عزیز، احادیث صحیحہ، اجماع امت کا طے شدہ ہے۔ اس کتاب میں متداول ادلۂ شرعیہ سے محققانہ بحث کی گئی ہے اور متنبّی کاذب کے سراب پر قائم شدہ قلعہ کو مسمار کیا ہے۔''

۵۔ تحیة الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام : ''عقیدۃ الاسلام'' کی تالیف کے آٹھ سال بعد وفات سے ایک سال قبل مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ۱۳۵۱ھ میں یہ کتاب لکھی تھی۔ اس وقت آپ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تھے۔ اس کتاب کا موضوع بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ہے۔ یہ ۱۵۰ صفحات کا رسالہ ہے۔ دراصل یہ عقیدۃ الاسلام کی تعلیمات اور اس پر اضافات ہیں۔ یہ ادب و بلاغت کی عجیب و غریب تحقیقات کا شاہکار ہے۔ اس میں ضمنی تحقیقات کے علاوہ دو سو اکیس (۲۲۱) حواشی ہیں جن کے متعلق آپ نے لکھا ہے :

> '' یہ وہ حواشی ہیں جن کو میں نے اپنی کتاب '' عقیدۃ الاسلام'' کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اس کتاب کا نام "تحیة الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" ہے جو کہ ایسی آیتوں کی تفسیر پر متضمن ہے جن سے اس ملحد، دشمن خدا، کافر قادیانی کا منہ بند ہو سکے اور یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہے اور شیطان کا دوست ہے۔''

مجلس علمی کراچی نے ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء میں دونوں کتابوں کو یکجا شائع کیا ہے۔ مجلس

کے سلسلہ مطبوعات میں یہ ۳۳ ویں نمبر پر ہے۔

زیر نظر کتاب کے آخری تین، چار صفحات دیمک کی نذر ہو گئے ہیں۔اس لیے خاتمہ پر عبارت کو نقل کرنا دشوار ہو گیا۔

۶۔اکفار الملحدین فی ضروریات الدین : یہ کتاب دراصل مسئلہ تکفیر پر محققانہ محاکمہ ،علماء سلف کی نقول اور ان پر تبصرہ ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح مجتہد فیہ مسائل پر تکفیر سخت مذموم ہے اسی طرح اصول شرع اور ضروریات دین کے انکار کے باوجود تکفیر نہ کرنا اس سے زیادہ مذموم ہے۔ یہ رسالہ نایاب ہو گیا تھا۔مجلس علمی کی استدعاء پر علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے نظر فرما کر بعض نہایت اہم مباحث کا اضافہ فرمایا ہے۔(۲۲)

اکفار الملحدین کا زیر نظر نسخہ مجلس علمی کراچی نے ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ اصل کتاب ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر رضوان اللہ نے اپنی کتاب میں اس کے صفحات کی تعداد ۱۲۸ صفحات لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔اس کتاب کی ابتداء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ میں ایک مقدمہ بھی لکھ کر شامل کر دیا تھا۔صفحہ ۱۳۳ سے صفحہ ۱۵۷ تک مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں سے متعدد حوالے نقل کئے گئے ہیں جن سے اس کی مصنوعی نبوت کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔صفحہ ۱۵۸ سے صفحہ ۱۷۰ تک مختلف علماء وقت کی اس کتاب کے بارے میں آراء شامل کی گئی ہیں۔کتاب کے اخیر میں انڈکس ہے۔

اکفار الملحدین کا اردو ترجمہ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ نے کیا تھا جسے مجلس علمی کراچی نے ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

اس کتاب میں ۱۳۲ کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کا موضوع بحث قادیانیوں کی تردید ہے۔ نیز قرآن وحدیث اور تصریحات سلف کی روشنی میں کفر وایمان کی حقیقت ،اہل قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر نہایت جامع کتاب ہے۔اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"الحمدلله الذی جعل الحق یعلو ولا یعلی حتی یاخذمن

مکافة القبول مکالا فوق السماء ۔"

مولانا انور شاہ صاحبؒ اس کتاب کی تالیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تالیف سے میرا مقصد مؤمنین کی خیر خواہی نیز کفر و ایمان کے الجھے ہوئے مسئلہ میں صراط مستقیم کی نشاندہی ہے نیز اس کی بھی وضاحت کردی کہ اپنی کتاب کا نام "اکفار الملحدین والمتأولین فی شئی من ضروریات الدین" رکھ رہا ہوں ۔ اس نام کا مأخذ قرآن مجید کی یہ آیت ہے ۔"

" ان الذین یلحدون فی آیاتنا لا یخفون علینا افمن یلقی فی النار خیر أم من یأتی آمناً یوم القیامة ، اعملوا ما شئتم انه بما تعملون بصیر " ۔ (۲۳)

رسالہ کے آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"تاویل کے سلسلہ میں بحث چھڑ گئی اس لیے بات سے بات پیدا ہوتی چلی گئی شاید اس سے لوگوں کو کچھ فائدہ ہو ۔ دین میں یہ ہرگز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہا جائے ۔ لوگ اس زمانہ میں دو قسم کے ہیں یا تو بہت زیادہ شدت پسند اور غلط راستہ پر ہیں یا پھر ان کو مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔"

اس کتاب میں مصنف نے جن امور کی تحقیق کی ہے ان میں بعض یہ ہیں:

۱ ضرورت دین

۲ ایمان کی حقیقت

۳ تواتر اور اس کی چار قسمیں

۴ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول متواتر ہے

۵ پنجاب کا ملحد اور دعویٰ نبوت

۶ مرزا غلام احمد کی تکفیر کے وجوہ وعیسویت

۷ غلط تاویل کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں

۸ تاویل کہاں معتبر ہے؟

۹ زندیقین، ملحدین اور باطنیہ کی تعریف

کتاب کے اخیر میں مولانا محمد انور شاہ صاحب نے اپنا شجرہ نسب لکھا ہے۔

۷۔**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح** : زیرِ نظر کتاب جمعیۃ تحفظ ختم النبوت پاکستان ملتان نے شائع کی ہے جس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصل کتاب صفحہ۹۱ سے صفحہ ۳۰۸ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ابتداء میں تین بسیط مقدمے ہیں۔ اس کتاب کو ایک شامی شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے ایڈٹ کرکے رجب ۱۳۸۵ھ میں حلب سے شائع کیا تھا۔ پہلے دو مقدمے شیخ ابوغدہؒ نے لکھے ہیں اور تیسرا مقدمہ مولانا محمد شفیع عثمانیؒ مفتی اعظم پاکستان نے تحریر کیا تھا۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کے مختلف پہلوؤں کو قرآن مجید کی روشنی میں ایک حقیقت ثابتہ ظاہر کرنے کے لیے مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ''عقیدۃ الاسلام'' تالیف کی لیکن آپ کا منشا یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے قُربِ قیامت میں نزول سے متعلق احادیث جو حدیث کے مختلف مجموعوں میں منتشر ہیں انھیں یکجا کیا جائے۔ قاضی شوکانیؒ مصنف ''نیل الاوطار'' نے اپنے دور میں اس موضوع پر ایک رسالہ جس کا نام ''التوضیح بما تواتر فی المنتظر والمهدی والمسیح'' ہے تالیف کیا جس میں وہ کل انتیس (۲۹) احادیث اس سلسلہ میں پیش کر سکے۔

مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں فتنہ قادیانیت اپنے عروج پر تھا، اس لیے آپ نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بہت ہی تحقیق و تفتیش اور دیدہ ریزی سے معاجم و صحاح و مسانید و جوامع کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اپنی اس تالیف میں ۷۵ احادیث اور صحابہ و تابعین کے ۳۵ آثار جمع کئے ہیں۔ قاری ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب نے ۷۰ احادیث اور ۲۳ آثار لکھے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ یہ کتاب لکھتے وقت مؤلف نے ایک سو سات (۱۰۷) کتابوں کو بطور ماٰخذ کے لیا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے ایماء پر مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے مرتب کی تھی لیکن عام طور پر آپ ہی کے نام منسوب کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا زاہد الکوثریؒ اس کو تعویذ کی طرح ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ (۲۴)

فرقہ مرزائیت کے بانی غلام احمد قادیانی نے نزول مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے ہوئے

انتہائی الہام پوش فریب کاریوں سے کام لیا ہے۔ مولانا انورشاہ کشمیریؒ نے اس کی فریب کاریوں کا پردہ اپنی متعدد تصانیف میں چاک کیا ہے۔ اسی سلسلہ کی تصنیف زیر تبصرہ کتاب بھی ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ثبوت حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

۸۔ **نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین** : مولانا انورشاہ کشمیریؒ کی یہ کتاب عربی زبان میں ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۳۵۰ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں صرف ایک ماہ کے اندر لکھی گئی اور مجلس علمی ڈابھیل نے اسے شائع کیا۔ آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"الحمدلله الذی لم یتخذو لدا ولم یکن له شریك فی العلم ولم یکن له ولی عن الذل و کبره تکبیراً"۔

مسائل مختلف فیہ میں مسئلہ رفع الیدین کو ہر زمانہ میں علماء نے اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ مجلس علمی کی استدعا پر آپ نے یہ مختصر سی کتاب تحریر کی ہے۔ مسائل مختلف بین الصحابہ یا بین الأئمہ کے متعلق فیصلہ کی توقع رکھنا خام خیالی ہے، البتہ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسا رسالہ یا کتاب تصنیف نہیں ہوئی جس میں حدیث کی اس طرح آثار اور نقد اسانید و رجال میں اس توسط کے ساتھ اغراض شارع، موارد نصوص و معانی و مطالب پر اس انصاف کے ساتھ پورا غور کیا گیا ہو۔

یہ کتاب پانچ فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں بے شمار کتابوں کے حوالے درج ہیں۔ صرف پہلی فصل میں صفحہ اول پر ۵۰ سے زائد کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں یہ مضامین زیر بحث آئے ہیں:

فصل اول	فی معنی رفع الیدین
فصل دوم	فی ما فهمه بعض السلف من معنی التکبیر
فصل سوم	فی احادیث الرفع
فصل چہارم	فی احادیث ترك رفع الیدین و نبذ من الآثار

فصل پنجم فی احادیث ترک رفع الیدین فی غیر الافتتاح و الآثار

خاتمہ میں لکھتے ہیں :

" لا یخفی ان البحث فی ھذا الشان یحوج الی طول حماد ستة و کثرة مراجعه الی الاصول و المتابعات و الشواهد و الاعتبار و التطریق "۔ والحمدللّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم محمد و آله و صحبه اجمعین ۔"

اس کے بعد مولانا انور شاہ صاحبؒ نے اپنا شجرہ نسب لکھا ہے نیز اپنے بزرگوں، اپنی اولاد اور اپنے بھائیوں کے لیے دعا کی ہے۔

۹۔بسط الیدین لنیل الفرقدین : ۶۳ صفحات کا یہ عربی رسالہ "نیل الفرقدین" کا تکملہ ہے، سلسلہ مطبوعات مجلس علمی ڈابھیل میں اس رسالہ کا نمبر ۹ ہے اور مجلس نے ۱۳۵۱ھ میں اسے شائع کیا ہے۔۱۴۴ حاشیوں کے ساتھ اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متأخرین اور عصر حاضر تک کے علماء کے خیالات محققانہ اسلوب میں جدید استدلال اور دقیق استنباطات کے ساتھ پیش کرنا مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔

آغاز میں لکھا ہے:

" الحمدللّٰہ عدد خلقه و زنة عرشه و رضی نفسه و مداد کلماته و الصلوٰة والسلام علی رسوله و نبیه محمد و علی آله ------ الخ "

مولانا حبیب الرحمان قاسمیؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زاہد کوثریؒ کہتے تھے کہ رفع یدین کی بحث بڑی طویل ہے۔ اس موضوع پر جانبین سے اہم کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس باب میں العلامہ البحر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی دو کتابیں " نیل الفرقدین و بسط الیدین" بہترین کتابیں ہیں۔ جن میں بحث کا عطر کشید کرلیا گیا ہے۔(۲۵)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ رسالہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

"الحاصل فقہاء شارع علیہ السلام کی ذو جہات گفتگو سے امر واحد کو متعین کرتے ہیں اسی طرح متاخرین فقہائے مجتہدین کے متعدد اقوال سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو جس طرح فقہاء کو شارع علیہ السلام کے مقابلہ میں صاحب شریعت نہیں کہہ سکتے ایسے ہی متاخرین کو ائمہ مذاہب کے باب میں مستقل فقہ کا مؤسس قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔"

۱۰۔ **کشف الستر فی صلاۃ الوتر** : ۹۸ صفحات کا یہ عربی رسالہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۳۴۸ھ میں وتر کے مسائل پر لکھا تھا اور آپ کی وفات کے بعد ۱۳۵۳ھ میں مجلس علمی ڈابھیل نے اسے شائع کیا۔ وتر کے مسائل اگرچہ عوام میں چنداں مشہور نہیں لیکن حدیثی اعتبار سے نہایت قابل توجہ ہیں۔ آپ نے منشاء اختلاف متعین کر کے اس باب کی جملہ احادیث کی اس طور پر شرح کی ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کسی حدیث میں تعارض باقی نہیں رہتا اور ہر ہر حدیث اپنے اپنے موقع پر درست نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ مذہب حنفی کی مکمل تائید ہوتی ہے۔

اس رسالہ کی اہمیت و جامعیت کا اندازہ علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب "فتح الملہم" کے اس بیان سے ہوتی ہے جو حبیب الرحمان قاسمیؒ نے اپنی کتاب "علماء دیوبند اور علم حدیث" میں صفحہ ۴۷ پر نقل کی ہے کہ شاہ صاحبؒ کی کتاب کشف الستر کی قدر اس وقت معلوم ہوئی جب اس مسئلہ پر جتنا ذخیرہ حدیث تھا سب کا سب مطالعہ کیا پھر اس رسالہ مذکور کو اول سے آخر تک پڑھا۔ یہ رسالہ درج ذیل عنوانات پر مشتمل بارہ فصلوں میں تقسیم ہے:

۱۔ فصل فی تنقیح ملاحظه فی احادیث صلوٰۃ الوتر

۲۔ فصل فی منشاء الاختلافات

۳۔ فصل فی حدیث صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ

٤۔ فصل فی شرح جملی لهذا الحديث

٥۔ فصل فی آخر فی هذا المعنی

٦۔ فصل فی حديث فاذا خشی احدکم الصبح صلی واحدة

۷۔ فصل فی بعض الاحاديث الفعلية المحتاجة ......ليخلص منها عدد الوتر

۸۔ فصل فی حدیث ابن عباس لیلة مبیتة فی بیت خالة میمونه رضی الله عنها

۹۔ فصل فی حدیث سعد بن هشام عن عائشه رضی الله تعالیٰ عنها

۱۰۔ فصل فی ومثله حدیث الحکم عن مقسم عن ام سلمة رضی الله تعالیٰ عنها

۱۱۔ فصل فی اشیاء بقیت فی الباب

۱۲۔ فصل فی رفع الیدین فی الدعاء وما یتعلق به

اس رسالہ کا آغاز:

"الحمدللّٰہ الواحد الاحد الوتر الفرد الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احداً" سے **اور اختتام** "سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك و أتوب اليك" پر ہوتا ہے۔

۱۱۔ **ضرب الخاتم علی حدوث العالم** : مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا یہ عربی منظوم رسالہ ہے اس کے کل صفحات ۱۲ ہیں۔ مجلس علمی کراچی نے ۱۳۸۲ھ میں شائع کیا ہے۔ سلسلہ مطبوعات میں اس رسالہ کا نمبر ۲۷واں ہے۔ آپؒ نے دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران ۱۳۴۵ھ میں یہ رسالہ نظم کیا تھا۔ آخری دور میں کلامی مسائل کی طرف آپ کی توجہ بڑھ گئی تھی۔ فارغ اوقات میں طلباء کو پڑھانا شروع کر دیا اور خود عربی میں ایک طویل نظم کہہ ڈالی جس کا نام "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" رکھا۔ اس رسالہ کا موضوع "اثبات الصانع الحکیم علمه المحیط، وارادة الازلیة المستقلة" ہے لیکن بقول مؤلف عنوان میں ایک قسم کی شناعت تھی، اس لیے حدوث العالم کا نام تجویز کیا۔

۱۔ اس رسالہ کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

"رسالة منظومة فی نحو اربع مأة بیت"

۲۔ شیخ ابوغدہؒ رقمطراز ہیں:

"رسالة فی اربع مائة بیت من الشعر"

۳۔ ڈاکٹر رضوان تحریر کرتے ہیں:

''سولہ صفحات کا یہ رسالہ چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔''

۴۔ انظر شاہ مسعودیؒ کی تحقیق بھی یہی ہے:

''یہ چار سو اشعار پر مشتمل ایک تالیف ہے''

۵۔ ڈاکٹر سید محمد فاروق اپنے مقالہ ''مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی علوم عقلیہ میں بصیرت'' میں ان اشعار کی تعداد ۲۵۷ لکھی ہے۔

اس رسالہ کے اشعار کے بارے میں مذکورہ بالا تمام اعداد درست نہیں ہیں۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق ان اشعار کی تعداد ۲۴۶ ہے۔

مسئلہ حدوث عالم و اثبات واجب میں یہ ایک محققانہ بلند پایہ عربی نظم ہے جس میں براہین محکمہ سے حدوث عالم ثابت کیا ہے، اس سے قبل دیگر محققین نے اس موضوع پر طویل و عریض بحثیں کی ہیں مگر حق یہ ہے کہ جس قدر اس کا طول و عرض ہے اس قدر ان کا عمق نہیں۔ رسالہ ہٰذا کے مؤلف نے دلائل سابقہ کو مسامحات سے خالی کر کے اپنی طرف سے پندرہ انواع اثبات واجب کے دلائل جدیدہ مرتب کئے ہیں۔ اب یہ رسالہ فن طبیعیات اور مسائل کلامیہ کے اہم و اعلیٰ حقائق کے لاینحل مشکلات کی شرح کا ایک بے نظیر مجموعہ بن گیا ہے۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اس رسالہ کی تالیف میں صدرا شیرازیؒ کی اسفار اربعہ فرید وجدی و بستانی کی دائرۃ المعارف، روح المعانی، مکتوب شرح المعماء، فتوحات مکیہ'' نهاية الاقدام للشهرستاني تقریر دلپذیر، مکتوبات قاسم العلوم'' اتحاف السادۃ'' مباحثہ جہان پور، انتصار الاسلام وغیرہ جیسی عظیم الشان کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ مؤلف خود حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''میرا مقصود اس تالیف سے اثبات باری تعالیٰ ہے لیکن یہ عنوان غیر مہذب ہے اس لیے میں نے حدوث عالم کا عنوان اختیار کیا حالانکہ دونوں عنوانات کا ایک مفاد ہے۔''

پہلا شعر یہ ہے ؎

تعالى الذى كان لم يك ما سوى

و اول مــا جـلـى الـعـمــاء بـمـصـطـفى

اورآخری شعر یہ ہے ؎

انــا لا حــقــر الـمـدعــو انـور شـاه مــن

مـضــافــات كـشـمـيـر جـزى الله من جـزى

۱۲۔مرقـاة الـطـارم لـحـدوث العالم : یہ سابقہ رسالہ کا تتمہ ہے اور اس میں ''ضرب الخاتم'' ہی کے مقاصد کو شواہد و بینات سے مدلل کیا گیا ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ۱۳۵۱ھ میں زمانہ قیام ڈابھیل کے دوران اسے لکھا تھا اور مجلس علمی ڈابھیل نے اسے شائع کیا ہے۔ سلسلۂ مطبوعات مجلس علمی میں اس کا دسواں نمبر ہے۔ یہ رسالہ عربی نثر میں ہے لیکن فارسی اور عربی میں کچھ منظوم کلام بھی شامل ہے۔ اس کے کل صفحات باسٹھ ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''حدوث عالم کا مسئلہ قدیم زمانہ سے مختلف فیہ رہا ہے، قیل و قال کے باوجود کوئی شفاء بخش حقیقت سامنے نہیں لائی جا سکی۔ یہ میرے ذاتی افکار ہیں جو میں نے اس موضوع پر حیات مستعار کا بڑا حصہ صرف کرنے کے بعد حاصل کیے ہیں۔ اس سے پہلے " ضـرب الـخـاتـم على حدوث العالم " لکھ چکا ہوں اور اس کی تسہیل کے لیے یہ کچھ اور صفحات لکھ رہا ہوں۔''

یہ وہی رسالہ ہے کہ جب اسے مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ۱۳۵۷ھ میں شیخ الاسلام مصطفیٰ صبریؒ کو قاہرہ میں پیش کیا تو مطالعہ کے بعد کہنے لگے:

> " انـي افـضـل هـذه الـوريـقـات على اسفار الاربعة للصدر الشيرازى ـ"

شیخ الاسلام نے اپنی تالیف ''القول الفیصل'' میں اس رسالہ سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

۱۳۔سهم الغيب في كبد اهل الريب : (تاریخی نام قسم سہم الغیب)
مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا یہ اردو رسالہ بائیس (۲۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ

نے یہ رسالہ بیس سال کی عمر میں جبکہ مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے مولوی عبدالمجید دہلوی کے رسالہ ''فی علم المجتبیٰ'' کی تردید میں لکھا تھا۔ اور دہلی ہی سے شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالمجید نے اپنے رسالہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب ثابت کیا نیز اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم میں صرف عرضی اور ذاتی کے سوا کوئی فرق نہ رکھا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالمجید ایک فرضی نام ہے۔ رسالہ کے مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں اس نام کا کوئی مصنف موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر رضوان اللہ لکھتے ہیں کہ باوجود تحقیق کے یہ رسالہ کہیں نہ مل سکا۔

راقم الحروف اسی ریسرچ کے سلسلہ میں رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ میں جامعہ العلوم الاسلامیہ نیوٹاؤن کراچی گیا تو مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ایڈیٹر ''بینات'' نے یہ رسالہ دیا۔ اس کے سرورق پر مولانا محمد یوسف بنوری کے قلم سے دو نوٹ لکھے ہوئے تھے اور بغیر تاریخ کے ہر دو جگہ ان کے دستخط بھی تھے۔ نوٹ نمبر ایک میں لکھا تھا:

> ''یہ کتاب اصل میں مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی تصانیف میں سے ہے مگر جس کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی اس شخص نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس لیے یہاں بھی مصلحت سے (نام) ظاہر نہیں کیا گیا (ہے)۔''

نوٹ نمبر دو میں درج تھا:

> ''یہ رسالہ خود حضرت امام العصر محترمؒ نے مجھے عنائت فرمایا اور سبب تالیف اور سبب عدم ذکر نام مبارک بھی بیان فرمایا۔ اس وقت میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ مقام ''ورنو'' علاقہ وادیٔ لولاب کشمیر میں تھا۔ غالباً محرم ۱۳۴۸ھ کی تاریخ تھی۔''

اس رسالہ کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

> ''سبحان الذی یسمع دبیب النملة السوداء علی الصخرة الصماء فی اللیله الظلماء۔''

آخر میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود حسنؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی تعریف میں قصیدے ہیں۔

۱۴۔ **کتاب..... فی الذب عن قرۃ العینین** : یہ کتاب فارسی میں ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کو مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے دہلی کے زمانہ قیام میں لکھا تھا۔ اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت اس طرح پیش آئی کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب " قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین "کا حیدر آباد دکن میں کسی شیعہ عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شیخین حضرت ابوبکر صدیقؓ، وحضرت عمر فاروقؓ، کو ختنین حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ترجیح دی تھی۔ شیعہ مصنف نے اس کے الٹ لکھا۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ''کتاب فی الذب'' میں عقل ونقل سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تائید کی اور شیعہ کی تردید کی ہے۔ ''قال المولی المولف'' لکھ کر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

''قال المعترض'' سے تردید کرنے والے کی عبارت اور اقوال سے مراد حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت ہے جو انھوں نے شیعہ کی تردید میں لکھی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کہتے ہیں :

> ''مولانا موصوفؒ نے کشمیر میں قیام کے دوران اس کتاب کا ایک نسخہ دیا تھا۔ اس کے شروع میں آٹھ صفحات غائب تھے۔ آپ سے پوچھنے کی نوبت نہ آسکی۔ یہاں تک کہ آپ واصل بہ حق ہوئے اور میں نے خود اس کا نام " ازالۃ الدین فی الذب عن قرۃ العینین " تجویز کیا تھا۔''

اس رسالہ کے خاتمہ پر مولانا انور شاہ صاحبؒ نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

> '' این است آخر کلام معترض کہ بغایت مصارحہ و مکافعہ جواب دندان شکن وے دادہ شد، قل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً ۔ اما باشد کہ کر اثناء مطارحہ گاہے سخن بطور مجاراۃ مع الخصم گفتہ و مسایرت وی وارخاء عنان درالزام و افہام اونمودہ باشیم، امید ازناظرین آنکہ ہر مقالے را بر محل خود فرود آرند، ولکل مقام مقال، تو فانا اللہ تعالیٰ علی حقیقۃ

الـديـانة والاطـاعة و طـريقة السنة والجماعة و حشر نا معهم ۔
آمين ثم آمين آه ۔ "

۱۵۔خاتم النبیینؐ: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن مجلس علمی کراچی نے ۱۳۵۴ھ میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد شائع کیا تھا۔ یہ آپ کی سب سے آخری نہایت محبوب کتاب ہے۔آپ کو اسلام اور اس کے بنیادی عقائد کے خطرناک ترین حریف نبی قادیان کی ملحدانہ تعلیمات کے استیصال کے ساتھ جو قدرتی شغف تھا، اس نے آپ کو بستر علالت پر بھی چین نہ لینے دیا۔ مرض کی غیر معمولی شدت اور تسلسل کے باعث اگرچہ تمام اعضاء صحت وتوانائی کو آخری جواب دے چکے تھے، تاہم تحفظ دین محمدیؐ کے جذبات میں ڈوبا ہوا یہ مرد خدا دم واپسیں تک دین الٰہی کی خدمت میں اس شان سے منہمک رہا گویا علالت ونقاہت کا کہیں آپ کے پاس گزر بھی نہیں ہوا۔ جب آپ اس کی تسوید و تالیف سے فارغ ہوئے تو ایک نامور کاتب کو طلب کیا اور کہا:

''مولوی صاحب! اس وقت زندگی کی آخری منازل طے کر رہا ہوں۔ میرے پاس آخرت کا کوئی ذخیرہ نہیں ۔ یہ دو چار تحریریں ہیں جو میرے لیے سامان آخرت ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اس رسالہ کو ذاتی مصارف سے بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کروں اور یہ کتاب مفت تقسیم کی جائے۔'' (۲۷)

زیر تبصرہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی متن کے ساتھ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کا اردو ترجمہ وتشریح بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا عتیق الرحمان عثمانی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد یوسف بنوریؒ امیر مجلس تحفظ ختم نبوت کا تحریر کردہ'' پیش لفظ'' ہے پھر مترجم نے دیباچہ مترجم تسوید کیا ہے۔

اس سے قبل مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہا لیکن تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ پھر مولانا عزیز الحق بہاری نے کتاب ہذا کو اردو کا لبادہ پہنانے کی کوشش کی مگر انجام محرومی ہی رہا۔ بقول انظر شاہ مسعودیؒ اب حکیم عزیز الرحمان اردو میں کتاب ہذا کو منتقل کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہیں۔ (۲۸)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ وہ خوش نصیب انسان ہیں جنھوں نے اس کتاب کا اردو

میں ترجمہ کیا۔اس سے قبل ۱۳۹۵ھ میں آپ نے اسی کتاب کا ترجمہ کر کے ''بینات'' کے شماروں (شعبان، رمضان، شوال) میں قسط وار شائع کیا تھا۔اب کافی اصلاح وترمیم کے بعد مستقل کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس کتاب میں ایک سو نو (۱۰۹) کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ جدید اشاعت مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے ۱۳۹۷ھ میں کی ہے۔اس کتاب کے بارے میں مترجم لکھتے ہیں کہ اس میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت کی گئی ہے:

۱۔ فارسی متن میں غلطیاں تھیں ان کی تصحیح پر توجہ کی گئی ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی آیات حدیث طیبہ اور دیگر نقول کے حوالوں کی تخریج کی گئی

۳۔ کتاب کے منتشر مضامین کو تبویب کے عنوان سے مرتب کر دیا گیا۔

۴۔ فارسی متن اور اردو ترجمہ کو الگ الگ کر دیا گیا اور پوری کتاب کو تیئس (۲۳) فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

رسالہ خاتم النبیین کے مضامین متفرق اور منتشر تھے۔ان کی کوئی فہرست تھی نہ کسی موضوع کا عنوان۔مترجم نے ان بکھرے ہوئے اوراق کو ابواب وفصول میں منسلک کر دیا ہے۔اب کتاب ہذا کو دو حصوں اور درج ذیل اٹھارہ فصلوں پر مرتب کیا گیا ہے۔

حصہ اول: نبوت اور منصب نبوت، ختم نبوت خاتم النبیین، تفسیر آیت خاتم النبیین، ختم نبوت اور حدیث نبوی اجماع امت اور ختم نبوت، ختم بنوت اور صوفیائے کرام عیسیٰ علیہ السلام۔

حصہ دوم: تحریفات مرزا، تلبیسات مرزا، کفریات مرزا، دعاوی مرزا، تناقضات مرزا، عقائد مرزا، عجائبات مرزا، سیرت مرزا، الہامات مرزا

یہ پوری کتاب آیت " ما كان محمد أبا احد من رجالكم ولكن رسول الله و خاتم النبيين "(۳۳۔۴۰) کی تفسیر ہے جسے مجلس ختم نبوت ملتان نے شائع کیا ہے۔

حافظ سید محمد نعمان نے راقم الحروف کو انٹرویو دیتے ہوئے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے رسالہ خاتم النبیینؐ کے متعلق بتایا:

> ''شاہ صاحبؒ نے رد قادیانیت کے لیے ۱۹۲۵ء میں عربی زبان میں ''خاتم النبیین'' رسالہ لکھا تھا۔میں نے خود اس کا قلمی نسخہ پڑھا تھا بعد میں کسی نے

اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا ہوگا۔''

حافظ صاحب کا یہ بیان قابل نظر ہے۔

(الف) شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ رسالہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کی آخری تصنیف ہے۔ آپ کی وفات ۲۹/مئی ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں اس کتاب کی تصنیف کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔

(ب) یہ رسالہ آپ نے عربی میں نہیں بلکہ فارسی زبان میں لکھا تھا تاکہ کشمیر اور بلوچستان کے لوگوں کے لیے یہ مفید ثابت ہو اور وہ قادیانی مکروفریب سے محفوظ رہیں۔

نوٹ: ڈاکٹر محمد رضوان اللہ صاحب نے اپنے مقالہ میں '' خاتم النبیینؐ'' کتاب کے اردو ترجمہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اور نہ ہی اس کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔

۱۶۔ خزائن الاسرار: یہ رسالہ عربی زبان میں ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا قلمی مسودہ مجلس علمی ڈابھیل کو کشمیر سے مولانا محمد سلیمان شاہؒ برادر مولانا انور شاہ صاحبؒ کے ذریعے موصول ہوا۔ جسے ۱۳۵۴ھ میں مولانا موصوفؒ کے وصال کے بعد مجلس علمی نے شائع کیا۔ یہ اوراد و عملیات کی کتاب ہے۔ جن کا انتخاب آپ نے علامہ دمیریؒ کی کتاب ''حیاۃ الحیوان '' سے کیا ہے۔ گویا آپ نے علامہ موصوفؒ کی دو کتابوں کو ملخص کیا ہے۔ آپ نے ان وظائف و اعمال اور تحقیقات عالیہ کا انتخاب کیا ہے جن کا اکثر حصہ احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ حسب ضرورت آپ نے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔

خزائن الاسرار کا مسودہ بعض جگہ سے جل کر ضائع ہو گیا تھا مگر مولانا انور شاہ صاحبؒ کے داماد مولانا احمد رضا بجنوری نے اصل کتاب سے مقابلہ کر کے اسے مکمل کیا اور پھر مجلس علمی کراچی نے اسے شائع کیا۔ حیات انور حصہ اول صفحہ ۲۲۳ پر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اس کتاب کا نام خزینۃ الاسرار لکھا ہے۔ یہ رسالہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے قدیمی مسودات جو کشمیر میں تھے سے دستیاب ہوا تھا۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔ دراصل خزائن الاسرار اور خزینۃ الاسرار دو کتابیں نہیں ہیں بلکہ صحیح نام خزائن الاسرار ہے۔ انظر شاہ مسعودیؒ نے بھی اس کا نام خزائن الاسرار لکھا ہے اور یہ لکھا کہ اس کا اردو ترجمہ مولوی مظفر الحسن مونگیری نے کیا تھا۔ (۲۹)

۱۷۔ گنجینۂ اسرار: یہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی مذکورہ بالا مطبوعہ بیاض خزائن الاسرار کا اردو ترجمہ ہے اور اس میں اور بہت سی غیر مطبوعہ تحقیقات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے شروع میں دو مقدمے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک مقدمہ مولانا انظر شاہ مسعودیؒ نے اور دوسرا خود مترجم مولانا مظفر الحسن القاسمی نے لکھا ہے۔ گنجینہ اسرار کو ادارہ اسلامیات انار کلی لاہور نے اکتوبر ۱۹۷۹ء میں پہلی بار شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۱۳۴ وظائف و عملیات درج ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

حفاظت ایمان، اعمال خیر میں مشغولیت، زیارت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برائے شفاعت، تجارت میں برکت، حاجت کا پورا ہونا، ادائیگی قرض، مچھروں سے حفاظت، چینوٹیوں سے حفاظت، مال کا گم ہونا، حفاظت حمل، جنات سے حفاظت، دشمن سے حفاظت، بچھو کا ڈنگ مارنا، کھانسی، دمہ، درد پیٹ، سوزاک، جریان، نامردی، بواسیر، سیلان الرحم، چیچک، استخارہ وغیرہ۔

(نوٹ: ڈاکٹر رضوان اللہ نے گنجینۂ اسرار کا ذکر نہیں کیا ہے۔)

۱۸۔ **النور الفائض علی نظم الفرائض**: فارسی نظم میں بانوے (۹۲) اشعار پر مشتمل یہ رسالہ علم میراث پر ہے۔ جسے مولانا انور شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک شاگرد مولانا فخر الدین مرادآبادی کو درساً پڑھایا اور پھر بطور یادگار ان کو دے دیا۔ مولانا موصوفؒ جب مدرسہ فخریہ مرادآباد میں صدر مدرس تھے تو ۱۳۵۶ھ میں مرادآباد ہی سے شائع کر دیا۔ اور اس کا نام "النور الفائض علی نظم الفرائض" رکھا۔

آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

بعد حمد خدا و نعت رسول
بشنو از انور ظلوم و جہول
مال نہ بود چوں مستحق العین
بعد تجہیز و دفن و دادن دین
ہم پس از عزل ثلث موصی بہ
ذی فروض مقدرہ را دہ

عصبہ بعد ازاں برد ہمہ مال
بعد ازیں رو بذی فروض سگال
بعد ازیں دو فریق اے منغام
وارث مال داں ذوی الارحام

جو اسباب مانع وارث ہیں ان کی تفصیل میں لکھا:

مانع ارث آمدہ اند ایں چہار
رق و قتل و اختلاف دین و دار
لیک قتلے کہ بالسبت باشد
مانع ارث کس نمی باشد

۱۹۔دعوت حفظ ایمان: اردو زبان میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کا یہ رسالہ دو حصوں میں ہے۔ جمعہ کے روز آپ کی سانحہ وفات سے تین دن پہلے بستر مرگ سے یہ چار صفحہ کا پیغام آپ نے اپنے قلم سے تیار کیا۔ بعد جمعہ دیوبند کی جامع مسجد میں ''انجمن امداد الاسلام'' کی جانب سے ایک جلسہ ہوا۔ جامع مسجد کے صدر دروازے میں آپ دیوار سے سہارا لیے ہوئے کھڑے تھے اور مولانا احمد رضا بجنوری نے آپ کی جانب سے اس پیغام کو پڑھ کر سنایا۔ سانحہ وفات کے بعد انجمن امداد الاسلام نے اس کو شائع کیا۔ اس پیغام کے اختتام پر ریاست کشمیر کو انتباہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ عاجز بحثیت رعیت ریاست کشمیر ہونے کے ریاست کشمیر کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ قادیانی عقیدہ کا آدمی عالم اسلام کے نزدیک مسلمان نہیں ہے۔ لہٰذا حکومت کشمیر جمیع اہل اسلام اور مذہب اہل کشمیر کی رعایت کرتے ہوئے قادیانیوں کو اسکولوں، محکموں میں بھرتی نہ کرے۔''

اس پیغام کا دوسرا حصہ سولہ صفحات کا ہے اور جسے مدینہ پریس بجنور نے ذی قعد ۱۳۵۱ھ میں شائع کیا۔ اس میں آپ نے عقائد صحیح، ادیان سماوی، صائبین، ختم نبوت، الحاد و زندقہ، نیز غلام احمد قادیانی کے مختصر حالات وعقائد، ضروریات دین اور کفر و ایمان کی حد فاصل پر جچی تلی گفتگو کے بعد کہا:

''یہ قادیانی دین متواتر میں تحریف اور شریعت میں تمسخر کے مرتکب ہوئے ہیں
اس لیے ان کا کفر قطعاً ثابت ہے جس میں کسی مسلمان کو شبہ نہ ہونا چاہیے۔''

رسالہ کے اختتام میں پنجاب میں قائم انجمن ''دعوت وارشاد'' میں شرکت کی اپیل کی ہے اور مولانا ظفر علی خانؒ کے اخبار ''زمیندار'' کے ساتھ تعاون کے لیے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے اور کشمیر سے شائع ہونے والے قادیانی اخبار کی اعانت سے مسلمانوں کو روکا ہے۔فرمایا:

''اہل کشمیر پر واضح رہے کہ جو قادیانی اخبار کشمیر سے جاری ہوا ہے وہ قادیانی عقائد کی ترجمانی کرتا ہے اور عنقریب اس کے نتائج برآمد ہوں گے۔ مسلمان اپنی جیبیں خالی کر کے کفر نہ خریدیں۔''

سہ روزہ الجمعیۃ دہلی (جولائی ۱۹۳۳ء) لکھتا ہے:

''مولاناؒ نے کشمیر سے مرزائیت کے استیصال کے لئے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا کہ دعوت حفظ ایمان ۱،۲ کی صورت میں ناظرین تک پہنچ چکا ہے۔''

(ڈاکٹر محمد رضوان اللہ لکھتے ہیں کہ اس رسالہ کا ذکر شاہ صاحب کی تصانیف میں نہیں ملتا)۔

۲۰۔خطبۂ صدارت ۱۹۲۷ء: جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ۲،۳،۴/ دسمبر ۱۹۲۷ء میں پشاور میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں آپ نے جو صدارتی خطبہ پڑھا تھا اسے برقی پریس دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس خطبہ کا اردو ترجمہ مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔ ہفتہ وار جریدہ ''مہاجر'' دیوبند نے ''بحر عرب کی عجمی موجیں، مذہبی معارف سیاسی قالب میں'' جیسی شہ سرخیوں کے ساتھ اس خطبہ کو بزبان فارسی متعدد قسطوں میں شائع کیا تھا۔ راقم الحروف کو اس خطبہ کی پہلی تین قسطیں میوزیم لائبریری لاہور سے ملی ہیں۔ جن کی فوٹو کاپی موجود ہے۔ اس خطبہ کا اردو ترجمہ پروین روزینہ نے اپنی کتاب ''جمعیت العلماء ہند'' حصہ اول میں شامل کیا ہے۔

(ڈاکٹر رضوان اللہ نے اس خطبہ کا اپنی کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا)

۲۱۔خلاصہ تقاریر مولانا انور شاہ کشمیریؒ: مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا یہ رسالہ اردو میں اسلامیہ

سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ شاہ صاحبؒ کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے دارالعلوم میں صدر مدرسی کے زمانہ میں کشمیر سری نگر میں کی تھیں اور بعد میں مرتب ہوئیں۔ تقاریر کے موضوعات یہ ہیں: قرآۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ۔ ان مسائل پر تفصیل سے بحث کرنے کے علاوہ ان سے متعلق بعض ایسے سوالات کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں محدثین اور فقہاء کے اختلافات چلے آرہے ہیں۔ رسالہ کے آخر میں چند اشعار بھی درج ہیں۔ نعت کا آخری شعر یہ ہے ؎

کسی نیست ازیں امت تو آنکہ چوانورؔ
با روئے سیاہ آمدہ و موئے زریری

درسی امالی

۱۔ فیض الباری علی صحیح البخاری ...... مرتبہ مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ: یہ کتاب مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے درس بخاری کی املائی شرح ہے جسے ان کے شاگرد مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے کئی سالوں کی محنت و کاوش کے بعد فصیح و بلیغ عربی میں مرتب کیا ہے۔ یہ بڑے سائز کی چار جلدوں میں ہے، صفحات کی مجموعی تعداد ۲۰۰۹ ہے۔ ہر جلد کی تفصیل یوں ہے۔

جلد اول: یہ جزو ۴۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جو ''باب کیف بدالوحی'' سے شروع ہو کر "باب التیمم" پر ختم ہوتا ہے۔ شروع میں مولوی محمد آفتاب احمد میرٹھیؒ کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ پھر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے کتاب کی تعریف میں ایک طویل عربی قصیدہ لکھا ہے۔ اس کے بعد انھی کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے پھر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی لکھی ہوئی عربی میں تقریظ ہے۔ گویا یہ علمی تحقیقات ۸۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ جزو ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء میں مولانا محمد آفتاب احمد میرٹھیؒ نے اپنے خرچہ پر المطبعۃ الاسلامیۃ السعودیہ لاہور سے شائع کروایا۔

جلد دوم: یہ جلد ۴۹۵ صفحات پر مشتمل ہے جو باب " الصلوۃ سے لے کر باب ماینھی من

سبب الاموات" تک ہے۔ یہ جلد بھی ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء ہی میں مذکورہ بالا مطبع سے چھپی۔

جلد سوم: اس جلد میں ۴۷۸ صفحات ہیں اور باب "وجوب الزکوٰۃ" سے لے کر باب "الموادعۃ من غیر وقت" تک ہے۔ یہ جلد بھی اسی سال میں المطبعۃ اسلامیہ السعودیہ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

جلد چہارم: ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور باب "بدء الخلق" سے قول اللہ تعالیٰ "و نضع الموازین القسط" تک ہے۔ اس جز کے ساتھ درس بخاری کے تمام مقامات مکمل ہو جاتے ہیں۔ یہ حصہ بھی المطبعۃ الاسلامیہ لاہور سے مولانا محمد آفتاب میرٹھیؒ نے شائع کروایا ہے۔

"فیض الباری" میں صحیح بخاری کا متن درج نہیں ہے، جامع کے قلم سے جگہ جگہ حواشی ہیں جو "حاشیہ البدر الساری" کے نام سے فیض الباری کے ساتھ ہی چھپے ہیں۔

یہ کتاب مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے علوم و کمالات کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر فاضل جامع کے قلم کو لغزش ہوگئی ہے پھر بھی تحقیقات علمیہ و نوادرات حدیثیہ کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ جہاں شیخ الاسلام بدرالدین عینیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے بلند پایہ محققین بے بس نظر آتے ہیں وہاں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے خصائص و کمالات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ آراء دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ العرف الشذی علی جامع الترمذی: یہ امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ کی شہرہ آفاق کتاب جامع ترمذی کے درس کی املائی شرح ہے اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی درسی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ اسے مولوی محمد چراغ[۱] مہتمم مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ نے ۱۳۴۸ھ میں شائع کیا تھا۔ باب "الطہارت" سے لے کر "ابواب المناقب" تک ۵۴۴ صفحات پر

---

[۱] مولانا محمد چراغ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد ہیں۔ تادم تحریر بحیات ہیں۔ مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ کے ناظم ہیں۔ راقم الحروف نے دو بار ان سے ملاقات کی ہے۔ مولانا موصوف کی قوت سماعت جواب دے چکی ہے اور آلۂ سماعت استعمال میں لاتے ہیں۔ انھوں نے ایک خط میں کچھ علمی معلومات بھی لکھ کر بھیجی تھیں۔

مشتمل ہے۔ العرف الشذی اگر چہ فیض الباری کے معیار کو نہیں پہنچتی پھر بھی یہ کتاب تحقیقات ونوادرات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور اپنی حسن ترتیب، اختصار کے ساتھ جامعیت، تحقیق رجال، تائید مسلک احناف کی رعایت اور اقسام حدیث کی تصریح وغیرہ علمی مباحث کی وجہ سے علماء واساتذہ کے نزدیک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ بعض مقامات علمی لحاظ سے بھی قابل گرفت ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری اہل حدیث عالم نے "تحفہ الاحوذی شرح ترمذی" میں عرف الشذی کے مندرجات کو خصوصی تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ جابجا اس کا تعاقب کرتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

> "جامع ترمذی کے مشکلات، احادیث احکام پر محققانہ کلام، ہر موضوع پر کبار امت کے عمدہ ترین نقول اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبہ حدیث اور اساتذہ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔"

۳۔ انوار الباری (شرح اُردو صحیح البخاری): مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اپنے درس حدیث میں حدیث کے مختلف پہلوؤں پر بڑی سیر حاصل گفتگو کرتے تھے اور علوم دینیہ کے تمام پہلو زیر بحث لاتےتھے اور بہت سی ایسی باتیں طلباء کو معلوم ہوتیں جو بالکل نئی اور انوکھی ہوتی تھیں اس لیے طلباء انھیں قلم بند کر کے محفوظ کر لیتے تھے۔ یہی تمام یادداشتیں بعد میں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور داماد مولانا احمد رضا بجنوری ان تمام شہ پاروں کو جو درس بخاری کے نام سے عربی زبان میں موجود تھے اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ کے بقول انوار الباری کے تیرہ حصے طبع ہو چکے ہیں لیکن راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق سترہ جلدیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ مؤلف موصوف دسمبر ۱۹۸۱ء میں لاہور آئے تو مقالہ نگار بھی ان سے ملا تو انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "انوار الباری کی اتنی جلدیں تو اور ہوں گی۔"

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ لکھتے ہیں :

"انوار الباری سے قبل شاہ صاحب کے افادات ...... عربی میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن اب تک ...... کوئی مجموعہ ایسا نہیں تھا جو اردو داں طبقہ کے لئے مفید و کارآمد ہو۔"

۴۔انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد : یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی شرح وتقریر ہے، اس میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے درس ابی داؤد کے افادات کو کافی ضبط واتقان کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ اوران کے فرمودات میں دوسرے اکابر کے ارشادات وشروح کتب حدیث سے اضافے کئے گئے ہیں۔

مولانا محمد صدیق نجیب آبادی نے مولانا انور شاہ صاحبؒ کی ان تقاریر کو جمع کر کے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ جلد اول ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، جو کتاب المناسک تک ہے۔ کلمات طیبات کے نام سے شروع میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی اردو تقریظ شامل ہے جو انھوں نے ڈابھیل میں قیام کے دوران لکھی تھی۔

دوسری جلد ۶۷۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جو کتاب النکاح سے شروع ہو کر کتاب الادب تک ختم ہوتی ہے۔ آخر میں صفحہ ۵۶۹ پر مولانا محمود حسنؒ کے حالات زندگی لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے حالات زندگی درج ہیں۔

دونوں جلدوں کا سنہ طباعت ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء ہے جو جمال پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔

۵۔الاتحاف لمذھب الاحناف : یہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا حاشیہ ہے جو انھوں نے شیخ ظہیر الحسن شوق نیمویؒ کی کتاب "آثار السنن" پر لکھا تھا۔ یہ عکسی نسخہ ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ کے شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی نے مجلس علمی کی طرف سے لندن میں جدید طریقہ طباعت کے ذریعے اسے ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا تھا۔

۶۔ایضاح البخاری : یہ بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے درس بخاری سے متعلق تقاریر کا مجموعہ ہے جو مولانا فخر الدین نے جمع کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحقیقات درج ہیں۔ جامع موصوف نے بخاری مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے نہیں پڑھی تھی اس

لیے ان کے اقوال درج کرنے میں غلطیاں کی ہیں۔ان کی نشاندہی مولانا احمد رضا بجنوری نے اپنی تالیف انوار الباری میں کردی ہے۔مولانا سعید احمدؒ لکھتے ہیں ''مؤلف انوار الباری نے بڑی تحقیق سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔اس کے علاوہ مؤلف موصوف کو شاہ صاحبؒ کے درس میں شرکت کی سعادت حاصل ہے۔انوار الباری کی ترتیب کے وقت مراجعت کتب اور تصحیح حوالہ جات کا بھی بہت اہتمام کیا گیا ہے، کتاب انوار الباری کو کافی تحقیق و تدقیق سے مرتب کیا گیا ہے اسی لیے اس کا معیار بہت بلند ہے۔'' (۳۰)

یہاں تک مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی ان تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے جو زیور طباعت سے مزین ہو چکی ہیں لیکن ابھی بہت سے جواہر پارے ایسے بھی ہیں جس سے علمی دنیا نا آشنا ہے یہ تا حال مخطوطات کی صورت میں پڑے ہیں۔ان کی فہرست یہ ہے۔

۱) اَمالیہ علی ''صحیح مسلم'' مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی، اس مجموعہ کو مولانا موصوف نے کسی وقت علامہ عثمانیؒ کو دے دیا تھا مگر انھیں یاد نہیں رہا۔ بقول مولانا حبیب الرحمان قاسمیؒ یہ امالی اس وقت علامہ عثمانیؒ کے بھائی جناب فضل احمد کے پاس ہیں۔(۳۱)

۲) اَمالیہ علی ''صحیح مسلم'' از ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، یہ مجموعہ ضائع ہو گیا تھا۔اس کی نقل دو فضلاء نے لے لی تھی، ایک خواجہ عبدالحئی فاروقی اور دوسرے مولانا خلیل بن محمد یمانی۔(۳۲)

۳) اَمالیہ علی ''ابوداؤد'' ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور خواجہ عبدالحئی فاروقی نے مشترکہ طور پر شاہ صاحبؒ کے نوادر علمیہ کو قلم بند کیا تھا لیکن کوئی صاحب لے اڑے۔(۳۳)

۴) اَمالیہ علی ''صحیح بخاری'' مرتبہ حفظ الرحمان سیوہاروی

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں :

''جس سال میں دورۂ حدیث میں پڑھتا تھا اسی سال یہ (مولانا سیوہاروی) بھی صحیح بخاری کی سماعت کرتے تھے اور میرے لیے حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر قلم بند کرتے تھے۔ میرے بھائی حفظ الرحمان سیوہاروی کی لکھی ہوئی یہ دو موٹی کاپیاں محفوظ تھیں مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں جب گھر لٹا تو وہ کاپیاں بھی نہ رہیں۔'' (۳۴)

۵) امالیہ علی ''صحیح بخاری'' مرتبہ مولانا عبدالعزیز

۶) امالیہ علی "صحیح بخاری" مرتبہ مولانا عبدالقدیر
مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ نے "فیض الباری" میں ان دونوں تقریروں کے مجموعہ سے استفادہ کیا ہے۔

۷) مجموعہ اَمالی، مرتبہ قاری محمد طیبؒ قاسمی، سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند۔
یہ بھی کسی طالب علم کی نذر ہو گیا۔

۸) اَمالیہ علی "صحیح مسلم" از مولانا احمد علی اعظمی۔
کسی صاحب نے مستعار لی مگر واپس نہ کی۔

۹) امالی ترمذی، مرتبہ انوار الحق مئوی اعظمی۔
یہ امالی اب مؤلف کے بھتیجے مولانا ریاض الحق قاسمی کے پاس محفوظ ہیں۔ یہ عربی میں ہیں۔۲۸۶ صفحات ہیں۔تقریر کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

" باب ماجاء فی الجنب و الحائض و الحائض مفحا لایقرأ القرآن قال الکرخی لا یجوز مطلقا وقال الطحاوی یجوز قطعةً قطعةً "۔

اور انتہاء اس عبارت پر ہوئی ہے:

" الف الف تحیة سلام علی النبی الامی خیر الانام علی ان بلغ الکتاب الی الختام یعون الله الملك العلام العشر خلون من رجب یوم الاثنین بعد الفجر ۔ ۱۳۳۶ھ "

یہ امالی صحت، نقول اور حسن بیان کے لحاظ سے عرف الشذی پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۳۵)

۱۰) مولانا[۱] محمد عبداللہ ملتانیؒ بیان کرتے ہیں کہ:
"ریاست بھوپال میں "ابی داؤد" کا ایک صحیح نسخہ تھا۔ جب مولانا محمود حسنؒ

---

۱) مولانا محمد عبداللہ ملتانی مولانا انور شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ اب محکمہ اوقاف پنجاب لاہور میں سینئر گریڈ خطیب ہیں۔ راقم الحروف نے ۸/ اگست ۱۹۸۲ء کو ان سے ملاقات کی۔

ابوداؤد کا حاشیہ لکھ رہے تھے تو اسی زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحبؒ آپ کے ساتھ بھوپال گئے۔ دارالکتب سے کتاب مستعار مانگی لیکن انھوں نے انکار کیا۔ شاہ صاحبؒ کہنے لگے مجھے یہیں رہنے دو میں دو دن میں اس کا مطالعہ کرلوں گا۔ آپ وہیں ٹھہر گئے، کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد واپس آگئے اور زبانی ساری کتاب نقل کردی۔"

۱۱) شرح ابوداؤد مرتبہ مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ

مولانا محمد عبداللہ ملتانی کہتے ہیں کہ اس شرح کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

۱۲) شرح ابوداؤد، مرتبہ مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ

مولانا شمس تبریز خان اپنے مقالہ "علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے افکار و خیالات" میں لکھتے ہیں:

"مولانا انور شاہ صاحبؒ کے پاس ایک نہایت مبسوط اور خوبصورت شرح ابو داؤد تھی۔ وہ اسے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتے تھے۔ میں نے اس سے کچھ اجزاء نقل بھی کئے تھے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس شرح کا انجام کیا ہوا۔"(۳۶)

۱۳) حاشیہ سنن ابن ماجہ، ازمولانا محمد ادریسؒ (۳۷)

۱۴) مشکلات القرآن جلد ثانی (۳۸)

مخطوطات کی مندرجہ ذیل فہرست الشیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے "التصريح بما تواتر في نزول المسيح" کے مقدمہ میں دی ہے:

۱۔ رسالة في الهيئة ---- اپنے کسی ساتھی کے لیے تالیف کیا تھا۔

۲۔رسالة في مسئله من الهند سة و علم المرايا و المناظر

۳۔رسالة في حقيقة العلم۔

۴۔رسالة في مسئالة يا شيخ عبدالقادر شياً لله

۵۔رسالة في مسئالة الذ بيحة لغير الله۔

۶۔رسالة في علم المعاني۔

اس میں وہ مسائل ہیں جن کا آپ نے سکاکی اور خطیب پر استدراک کیا ہے۔ اوران مسائل کا کتاب سیبویہ، الکشافؒ اور بہاء الدین سبکیؒ کی کتاب عروس الافراح سے استنباط کیا ہے۔

۷۔مقامات أدبيه على نهج مقامات الحريری۔

ان میں سے کچھ الفاظ منقوط اور کچھ الفاظ غیر منقوط ہیں جبکہ بعض ''المقامة المراغیہ'' کی طرز پر ہیں۔جن کا ایک کلمہ معجمہ ہے اور ایک کلمہ غیر معجمہ ہے۔

۸۔حواشي علىٰ " الأشباه والنظائر" لابن نجیمؒ

۹۔رسالة فی مسئلة صلاة الجمعة و اختلاف الأئمة فی شروط ادائها۔

(یہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا)

۱۰۔حواشي على حواشي الزاهدية على شرح القطبيه۔بعض اہم اور نادر تلخیصات۔

۱۱۔تلخیص " امام الکلام " للعلامه عبدالحئی لکھنویؒ

۱۲۔تلخیص ادلّة الحنفیه من " فتح القدیر " لابن همامؒ۔

(صرف کتاب الحج تک تلخیص ہو سکی)

۱۳۔علامہ دمیری کی کتاب ''حیاۃ الحیوان'' سے بعض مہمات کی تلخیص۔

(یہ کتاب خزائن الاسرار کے نام سے شائع ہو چکی ہے)

۱۴۔آپ کے حدیثی بحثوں میں قیمتی نوٹس۔مثلاً ظہر کے وقت میں مثل یا مثلین کا مسئلہ۔حدیث " من أدرك ركعة من الصبح " کا مسئلہ۔

ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے متعلق مشکل موضوع۔(۳۹)

۱۵۔کشکول از مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ۔(۴۰)

۱۶۔مکتوبات و ملفوظات مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ

یہ کتاب مولانا محمد انوریؒ نے مرتب کی تھی۔اور رسالہ'' ملفوظات رائے پوریؒ'' کے آخری صفحہ پر اس کے بارے میں ایک اشتہار بھی شائع ہوا۔راقم السطور نے جولائی ۱۹۸۱ء میں مؤلف کے صاحبزادے ابوالقاسم امام مدینہ مسجد کلفٹن کراچی سے ان مکتوبات و ملفوظات کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ابھی تک چھپے نہیں۔

۱۷۔ہندوستان اور دارالحرب (قلمی)۔

اس کی فوٹو کاپی راقم السطور کے پاس ہے جو جامعہ العلوم الاسلامیہ نیو ٹاون کراچی کے دارالکتب سے حاصل ہوئی تھی۔

۱۸۔ بندوق کے شکار کے مسائل پر رسالہ۔(۴۱)

مضامین اور تقاریر

۱۔ **حقیقت عید:** عید مسلم۔ یہ مضمون ''مہاجر'' دیوبند ''سیاست'' لاہور اور ''الحق'' اکوڑہ خٹک میں درج ذیل تفصیل سے شائع ہوا۔

۱۔ ہفتہ وار مہاجر دیوبند قسط اول ۲۹/ مارچ ۱۹۲۸ء

۲۔ ہفتہ وار مہاجر دیوبند قسط دوم ۷/ اپریل ۱۹۲۸ء

۳۔ روزنامہ سیاست لاہور ''عید نمبر'' ۲۳/ مارچ ۱۹۲۸ء

۴۔ ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک پشاور مارچ ۱۹۶۶ء

۲۔ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم: روزنامہ سیاست لاہور ''معراج نمبر'' فروری ۱۹۲۵ء

۳۔ تقریر عنوان ا۔ عالم آخرت نمبر ا و ۲ سالانہ جلسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۳۵۰ھ و ۱۳۵۲ھ

۴۔ ۲۳/ صفر ۱۳۵۰ھ میں جامع مسجد سوپور میں تقریر کی جسے قلم بند کر لیا گیا۔ اس کی ایک نقل مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے سوانح نگار عبدالرحمان کوندو کے پاس ہے۔(۴۲)

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی اہم تصنیفات و تالیفات ایک نظر میں

۱۔ علم التفسیر: مشکلات القرآن مع مقدمہ لعلامہ بنوریؒ موسوم " يتيمة البيان "۔

۲۔ علم الحدیث

۱۔ فیض الباری علی صحیح البخاری۔

۲۔ العرف الشذی شرح جامع الترمذی۔

۳۔ انوار المحمود فی شرح ابی داؤد۔

۴۔ انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری۔

---

۱) (ڈاکٹر محمد رضوان اللہ نے اپنے مقالہ ''مولانا انور شاہ کشمیری: حیات اور علمی کارنامے'' میں ان مخطوطات، شاہ صاحب کے مضامین اور تقاریر کا کہیں ذکر نہیں کیا۔)

۵۔ الاتحاف لمذهب الاحناف۔

٦۔ معارف السنن۔

۳۔علم الفقہ

١۔ فصل الخطاب فی مسئله ام الکتاب۔

٢۔ نیل الفرقدین فی مسئله رفع الیدین۔

٣۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین۔

٤۔ کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر۔

۴۔علم لغت وتاریخ

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔

۵۔علم عقائد وکلام ،فلسفہ،ہئیت اور سوانح

١۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیه السلام۔

٢۔ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین۔

٣۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم۔

٤۔ مرقاۃ الطارم لحدوث العالم۔

٥۔ ازالة الدین فی الذب علی قرۃ العینین۔

٦۔علم ادب وصحافت

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ عربی، فارسی اور اردو شاعری کا ملکہ رکھتے تھے اگر چہ صاحب دیوان شاعر نہ تھے تاہم کافی منظوم کلام مختلف جریدوں میں محفوظ ہے۔

حوالہ جات

۱ ابن الندیم، الفہرست
۲ پندرہ روزہ الداعی (عربی) مارچ /اپریل ۱۹۸۰ء
۳ نقس دوام ص۲۹۴
۴ ایضاً ص۲۹۵
۵ معارف جون ۱۹۳۳ء
۶ حیات انور ص۲۱۱
۷ ایضاً
۸ ایضاً
۹ الابقاء ص۲۸
۱۰ خیر خبر ص۱۴
۱۱ ماخوذ از مقدمہ التصریح۔ ص۲۷
۱۲ خیر خبر ص۱۴
۱۳ مقدمہ التصریح۔۔۔۔ ص۲۸
۱۴ حیات انور ص۲۲۲،۲۲۳
۱۵ نقش دوام ص۲۹۸
۱۶ انوار انوری ص۵۵
۱۷ انٹرویو از حافظ محمد نعمان
۱۸ مولانا انور شاہ ص۲۵۰
۱۹ نفحۃ العنبر ص۱۱۳
۲۰ الانور ص۱۱۴

۲۱ ایضاً ص ۱۴۵

۲۲ اشتہار دارالکتب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۳۵۰ھ

۲۳ القرآن ۴۱ : ۴۰

۲۴ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۲۷

۲۵ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۴۷

۲۶ حیات انور ص ۲۲۱

۲۷ مقدمہ خاتم النبیین ص ۱۸

۲۸ نقش دوام ص ۳۲۷

۲۹ نقش دوام ص ۳۳۱

۳۰ برھان دہلی نومبر ۱۹۶۳ء

۳۱ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۷۸

۳۲ ایضاً

۳۳ الانور ص ۱۶۶

۳۴ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۷۹

۳۵ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۸۱

۳۶ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۷ء

۳۷ علماء دیوبند اور علم حدیث ص ۷۵

۳۸ دارالعلوم دیوبند اگست ۱۹۶۷ء

۳۹ مقدمہ التصریح ----- ص ۳۲

۴۰ نقش دوام ص ۳۳۰

۴۱ دارالعلوم دیوبند اگست ۱۹۶۷ء

۴۲ الانور ص ۲۱۸

کتابیات

قرآن وتفاسیر

۱۔ القرآن الحکیم۔

۲۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل۔ (م۔۷۷۴ھ) تفسیر ابن کثیر مصر، المکتبہ الکبریٰ، ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۳۷ء

۳۔ بیضاوی، ناصر الدین عبداللہ۔ تفسیر بیضاوی مصر: دارالکتب العربیہ الکبری، ۱۳۳۰ھ

۴۔ حریری، غلام احمد۔ تاریخ تفسیر ومفسرین۔ فیصل آباد: ملک سنز، ۱۹۷۸ء

۵۔ ذہبی، محمد حسین۔ التفسیر والمفسرون۔ مصر(قاہرہ): دارالکتب الحدیثیہ، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء

۶۔ سیوطی، جلال الدین۔ الاتقان فی علوم القرآن۔ لاہور: مطبع ناصری، ۱۲۸۰ھ

۷۔ شاہ ولی اللہ۔ فتح الرحمان (فارسی ترجمہ قرآن مجید۔ دہلی: مطبع حیدری، ۱۲۸۴ھ

۸۔........ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (عربی) مع الجزء اللطیف فی ترجمہ العبد الضعیف۔ لاہور: المکتبہ السلفیہ، ۱۳۷۱ھ

حدیث

۹۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی (م۔۸۵۲ھ)۔ فتح الباری۔ مصر: مطبعۃ الکبریٰ، ۱۳۰۰ھ

۱۰۔ بجنوری، احمد رضا۔ انوار الباری علی صحیح البخاری۔ بجنور: مکتبہ ناشر العلوم، ۱۹۶۲ء

۱۱۔ البخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل (م۔ ۲۵۶ھ)۔ الجامع الصحیح معروف بہ صحیح بخاری۔ مصر (قاہرہ): مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۸۳ھ

۱۲۔ بنوری، مولانا محمد یوسف۔ آثار السنن۔ پٹنہ: احسن المطابع، ۱۳۱۹ھ

۱۳۔ التبریزی، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب۔ مشکوٰۃ المصابیح مع الاکمال فی اسماء الرجال۔ کلکتہ: حاجی محمد سعید تاجر کتب، ۱۳۵۰ھ

۱۴۔ الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ۔ جامع الترمذی مع شمائل الترمذی ۔ کراچی: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، س۔ن۔

۱۵۔ سخاوی، محمد بن عبدالرحمان ۔ الضوء الامع ۔ بیروت: لبنان، دارالکتب الحیاۃ، ۹۸۴ھ

۱۶۔ عثمانی، علامہ شبیر احمد ۔ فتح الملہم ۔ کراچی: مکتبہ الحجاز، ۱۳۵۲ھ

۱۷۔ عینی، محمود بن احمد (م۔۸۵۵ھ) ۔ عمدۃ القاری ۔ لبنان (بیروت): محمد امین دمج، س ۔ ن ۔

۱۸۔ فنسنک، ا ۔ ی ۔ کنوز السنہ مترجمہ عربی از محمد فواد عبدالباقی مع مقدمہ از سید محمد رشید رضا ۔ لاہور: سہیل اکیڈمی، ۱۳۹۱ھ

۱۹۔ گیلانی مناظر احسن ۔ تدوین حدیث ۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۳۷۵ھ

۲۰۔ مالک بن انس، امام ۔ مؤطا امام مالک ۔ مصر: المطبعۃ الاولی، ۱۳۰۰ھ

۲۱۔ المسلم بن حجاج القشیری، ابوالحسین، الجامع الصحیح معروف صحیح مسلم ۔ مصر: مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء

۲۲۔ محمد ابوبکر غازی پوری ۔ محدثین کی قوت حفظ تاریخ کی روشنی میں ۔ غازی پور: المکتبہ الاثریہ، ۱۹۸۰ء

۲۳۔ محمد بدر عالم میرٹھی ۔ ترجمان السنۃ ۔ دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۳۶۷ھ

۲۴۔ نیموی، محمد بن علی المعروف بہ ظہیر احسن ۔ آثار السنن ۔ عظیم آباد: احسن المطابع، ۱۳۲۱ھ

فقہ

۲۵۔ بنوری، مولانا محمد یوسف ۔ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلہ والمحاریب ۔ القاہرہ: مطبعۃ العلوم، ۱۹۳۹ھ

۲۶۔ بھٹی، محمد اسحاق ۔ برصغیر پاک وہند میں علم فقہ ۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۳ء

۲۷۔ بھٹی، محمد اسحاق ۔ فقہائے پاک وہند ۔ لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۲ء

۲۸۔ شافعی، محمد بن ادریس ۔ کتاب الام ۔ مصر (ازہر): مکتبہ الازہریہ، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء

۲۹۔ طحاوی، امام ابوجعفر ۔ طحاوی ۔ حیدرآباد دکن، دائرۃ المعارف النظامیہ، ۱۳۳۳ھ

۳۰۔ مولوی عبدالاول جونپوری، فقہ اسلامی ۔ کتابیات وشخصیات ۔ ملتان: مکتبہ غوثیہ، ۱۴۰۱ھ

۳۱۔ عذرا بٹ ۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے پاک وہند کے فقہاء کی علمی خدمات ۔ لاہور: غیر مطبوعہ

مقالہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

۳۲۔ ابن قدامہ، موفق الدین عبداللہ (م ۶۳۰ھ)۔ المغنی۔ مصر: مطبعۃ المنار، ۱۳۴۷ھ

۳۳۔ المرغینانی، برھان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر (م۔ ۵۹۳ھ)۔ الھدایہ۔ کراچی: کلام کمپنی، ۱۳۸۱ھ

۳۴۔ نسفی، عبداللہ بن احمد۔ کنزالدقائق۔ دہلی: المطبع المجتبائی، ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء

تعلیم

۳۵۔ احمد میاں، مولانا، روئداد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ بجنور: مدینہ پریس، ۱۳۵۱ھ

۳۶۔ چغتائی، ڈاکٹر محمد عبداللہ، قیام دارالعلوم دیوبند، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۴۰۰ھ

۳۷۔ رفیق، سعید احمد، مسلمانوں کا نظام تعلیم، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، ۱۹۸۲ء

۳۸۔ شہابی، انتظام اللہ، اسلامی نظام تعلیم کا چودہ سالہ مرقع، کراچی: جناح لائبریری سوسائٹی، ۱۹۶۱ء

۳۹۔ گیلانی، مناظر احسن، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۸۱ء

۴۰۔ محمد ابراہیم حافظ رپورٹ: دربارۂ تحقیق معاملات دارالعلوم، دیوبند: مطبع قاسمی، ۱۹۲۸ء

۴۱۔ ندوی، ابوالحسنات، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۷۵ء

۴۲۔ نعمانی، محمد منظور، دارالعلوم کا قضیہ، دیوبند: ۱۹۸۲ء

۴۳۔ ہاشمی، سید محمد متین، تحریک جامعہ محمدی، جھنگ: شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ محمدی، ۱۲۹۳ھ

تاریخ

۴۴۔ ابن بطوطہ سفرنامہ ابن بطوطہ مترجمہ اردو از رئیس احمد جعفری کراچی: نفیس؛ اکیڈمی، ۱۹۶۱ء

۴۵۔ ابن حوقل، ابوالقاسم النصیبی، سفرنامہ ابن حوقل لیدن: مطبعہ بریل، ۱۹۴۸ء

۴۶۔ ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ، لبنان (بیروت): دارالکتب بیروت، ۱۳۷۶ھ

۴۷۔ ابوالظفر ندوی، تاریخ سندھ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۳۶۶ھ

۴۸۔ ابوالفداء اسماعیل بن علی، تاریخ ابوالفداء مترجمہ اردو از مولوی کریم الدین امرتسر: مطبع افغانی، ۱۹۰۱ء

۴۹۔ ابوالفضل، شیخ آئین اکبری، لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۳۹ء

۵۰۔ احمد خان سرسید، رسالہ اسباب بغاوت ہند کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء

۵۱۔ احمد شفیع چوہدری۔ تحریک پاکستان۔ لاہور: سٹینڈرڈ بک ہاوس، ۱۹۷۸

۵۲۔ بدایونی، عبدالقادر۔ منتخب التواریخ، کلکتہ: ۱۸۶۹ء

۵۳۔ برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی حیدر آباد دکن: دائرۃ المعارف نظامیہ، ۱۹۳۸ء

۵۴۔ بشیر الدین احمد مولوی۔ واقعات دارالحکومت دہلی، آگرہ: شمس مشین پریس، ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء

۵۵۔ بلاذری، احمد بن یحیٰی، فتوح البلدان، لائیڈن: مطبع ڈفویہ، ۱۹۶۶ء

۵۶۔ پروین روزینہ، جمعیت العلماء ہند، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق، ۱۹۸۰ء

۵۷۔ چغتائی، ڈاکٹر محمد عبداللہ، شاہی مسجد لاہور، لاہور: کتاب خانہ فورس، ۱۹۷۲ء

۵۸۔ خیر آبادی فضل حق، محمد، الثورہ الہندیہ، مترجمہ اردو مع مقدمہ از محمد عبدالشاہد لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۷۸ء

۵۹۔ ذکاء اللہ، منشی، تاریخ ہندوستان، دہلی: شمس المطابع، ۱۸۹۷ء

۶۰۔ الرامہرمزی، بزرگ بن شہریار، عجائب ہند، لائیڈن: ۱۸۶۶ء

۶۱۔ سعید نفیسی، تاریخ تمدن ساسانی، تہران: ۱۳۳۱ھ

۶۲۔ صابر آفاقی ڈاکٹر، جلوۂ کشمیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء

۶۳۔ ظہور الحق، قاضی، نگارستان کشمیر، دہلی: جید پریس، ۱۳۵۲ھ

۶۴۔ عبداللہ، یوسف علی، عہد انگریزی میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ کراچی: کریم سنز، ۱۹۶۷ء

۶۵۔ عزیز احمد، اسلام پاکستان میں، لندن: ۱۹۶۹ء

۶۶۔ عفیف، شمس الدین، تاریخ فیروز شاہی مترجمہ اردو از ہلال احمد زبیری، حیدر آباد دکن: دارالترجمہ عثمانیہ، ۱۹۳۸ء

۶۷۔ عمر فروخ، عبقریۃ العرب، بیروت: المکتبہ العلمیہ ۱۹۵۲ء

۶۸۔ فرشتہ، محمد بن قاسم، تاریخ اقوام کشمیر لاہور: ظفر برادرز، ۱۹۳۰ء

۷۰۔ قریشی، اشتیاق احمد، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ مترجمہ اردو از ہلال زبیری کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

۷۱۔ قریشی، محمد عبداللہ آئینہ کشمیر، لاہور: آئینہ ادب، س۔ ن۔

۷۲۔ کوفی، محمد بن علی بن حامد، چچ نامہ، حیدر آباد دکن: مجلس مخطوطات فارسیہ، ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء

۷۳۔ کھویہامی، غلام حسن، تاریخ حسن، سری نگر: ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، ڈیپارٹمنٹ جموں و کشمیر، ۱۹۵۴ء

۷۴۔ محمد اکرم، شیخ، آب کوثر لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۹ء

۷۵۔ محمد اکرم، شیخ، رود کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۵ء

۷۶۔ محمد اکرم، شیخ، موج کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۹ء

۷۷۔ محمد رضا خان، تاریخ مسلمانان عالم، لاہور: مرکزی کتب خانہ، ۱۹۷۲ء

۷۸۔ منگلوری، طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل لاہور: جہاد الکتبی، ۱۹۴۵ء

۷۹۔ منہاج سراج، قاضی، طبقات ناصری، ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۵۷ء

۸۰۔ ندوی، سید سلیمان، عرب و ہند کے تعلقات، کراچی: کریم سنز، ۱۹۷۶ء۔

سوانح

۸۱۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، لکھنؤ: س۔ن۔

۸۲۔ آزاد، محمد حسین، تذکرہ علماء الہ آباد: ادارہ کتابستان، س۔ ن۔

۸۳۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، تہذیب التہذیب، حیدر آباد دکن، دائرۃ المعارف النظامیہ، ۱۳۲۵ھ

۸۴۔ ابوزہرہ، پروفیسر، امام ابن تیمیہ، مترجمہ اردو از نائب حسین نقوی، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۶۸ء

۸۵۔ اختر راہی، تذکرہ علمائے پنجاب۔ (۱۴۰۰۔۱۴۰۱ھ)۔ مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۸۱ء

۸۶۔ ارشد، عبدالرشید، بیس بڑے مسلمان، لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۶۹ء

۸۷۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسین، حیات طیبہ (مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے حالات زندگی)۔ لاہور: القادر ناشران کتب اسلامی، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۴ء

۸۸۔ انور، محمد انوار الحسن تجلیات عثمانی ملتان: ادارہ نشر المعارف، ۱۹۵۷ء

۸۹۔ انور، شیخ نذر محمد، مشاہیر ہند، لاہور: اسلامیہ سٹیم پریس، ۱۹۱۹ء

۹۰۔ انوری، مولانا محمد، انوار انوری فیصل آباد: خود مؤلف، ۱۳۸۷ھ

۹۱۔ انوری، مولانا محمد، ملفوظات حضرت رائے پوری، فیصل آباد: مؤلف خود، ۱۳۸۳ھ

۹۲۔ بجنوری، احمد رضا، نطق انور، بجنور: مکتبہ ناشر العلوم، س ۔ ن ۔

۹۳۔ بخاری، محمد اکبر شاہ، اکابر علماء دیوبند، لاہور: ادارہ اسلامیات، س۔ن

۹۴۔ بدایونی، عبدالقادر، تاریخ علماء ہند، لکھنؤ: نولکشور، س۔ن۔

۹۵۔ برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ کا خاندان، لاہور: مجلس اشاعت اسلام، ۱۹۷۶ء

۹۶۔ بنوری، مولانا محمد یوسف، نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ العصر انور، کراچی: مجلس علمی، ۱۹۵۵ء

۹۷۔ بہاری، ظفر الدین، حیات اعلیٰ حضرت (احمد رضا خان بریلوی) کراچی: مکتبہ رضویہ، ۱۹۵۵ء

۹۸۔ ثمر، عبدالکریم، نفوس قدسیہ، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء

۹۹۔ جہلمی، فقیر محمد، حدائق الحنفیہ مرتبہ خورشید احمد خان لاہور: مکتبہ حسن سہیل، ۱۹۰۶ء

۱۰۰۔ دہلوی عبدالحق محدث، شیخ، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار دہلی: مکتبہ مجتبائی، ۱۳۳۲ھ

۱۰۱۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد دکن: دائرۃ معارف نظامیہ، ۱۳۰۹ھ

۱۰۲۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، انفاس العارفین مع الجزء اللطیف اردو ترجمہ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۳۹۴ھ

۱۰۳۔ شرف قادری عبدالحکیم، تذکرہ علماء اہل سنت، لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۷۶ء

۱۰۴۔ شہابی، انتظام اللہ، اسوۃ الصالحین، تذکرۃ الکاملین، کراچی: ایم۔ ایچ کمپنی، ۱۹۶۳ء

۱۰۵۔ صارم، عبدالصمد، سیرت انور شاہ کشمیری، لاہور: ایم۔ ثناء اللہ خان اینڈ سنز، ۱۹۶۱ء

۱۰۶۔ طباطبائی، غلام حسین، سیر المتاخرین، لکھنؤ: نولکشور، ۱۳۱۴ھ

۱۰۷۔ عبدالاول جونپوری، مولوی، وفیات المشاہیر، جون پور: جارو پریس، ۱۲۲۴ھ

۱۰۸۔ عبدالحئی، مولانا، نزہۃ الخواطر، کراچی: اصح المطابع، ۱۹۷۶ء

۱۰۹۔ عبدالرحمان، جامی نفحات الانس من حضرت القدس، لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۱۵ء

۱۱۰۔ عزیز الرحمان، مفتی، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنور: زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء

۱۱۱۔ غلام علی ہیر، مآثر الکرام (سرو آزاد) لاہور: مطبع مشائخ، ۱۹۱۳ء

۱۱۲۔ فوق، محمد الدین مشاہیر کشمیر، لاہور: ظفر برادرس، ۱۹۳۴ء

۱۱۳۔ قادری، رفعت شمیم، تاریخ علوم اسلامیہ در برصغیر پاک وہند (۱۹۰۰۔۱۹۴۷ء) لاہور: غیر مطبوعہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۴۷ء

۱۱۴۔ قاسمی، حبیب الرحمان، علمائے دیوبند اور علم حدیث، دیوبند: مطبع قاسمی، ۱۳۹۹ھ

۱۱۵۔ قریشی، محمد اقبال، مولانا انور شاہ کشمیری کے علوم و معارف، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۸۰ء

۱۱۶۔ قیصر، محمد ازہر، حیات انور، دیوبند: نسیم اختر شاہ منزل، ۱۹۷۷ء

۱۱۷۔ الکتبی، محمد بن شاکر، فوات الوفیات والذیل علیھا، لبنان (بیروت): دار صادر، ۱۹۷۳ء

۱۱۸۔ کحالہ، عمر رضا، معجم مصنفین تراجم مصنفی الکتب العربیہ، لبنان (بیروت): مکتبۃ المثنیٰ، س۔ن۔

۱۱۹۔ کوندو، عبدالرحمان، الانور دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۸ء

۱۲۰۔ گیلانی، مناظر احسن، تذکرہ شاہ ولی اللہ، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

۱۲۱۔ گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، دیوبند: نیشنل پریس، ۱۳۷۵ھ

۱۲۲۔ مبارک پوری، قاضی اطہر، رجال السند والہند، بمبئی: ادارہ البلاغ، ۱۹۵۸ء

۱۲۳۔ مدنی، حسین احمد، نقش حیات، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۹ء

۱۲۴۔ محبوب رضوی، سید، تاریخ دارالعلوم دیوبند، دیوبند: ادارہ اہتمام دارالعلوم، ۱۳۹۷ھ

۱۲۵۔ محمد رضوان اللہ ڈاکٹر، مولانا انور شاہ کشمیری، حیات اور علمی کارنامے علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۴ء

۱۲۶۔ محمد شاہد، سید، مظاہر علوم سہارنپور، سہارنپور: کتب خانہ اشاعت العلوم، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۴ء

۱۲۷۔ محمد شفیع مفتی، نقوش و تاثرات، کراچی: ایچ۔ایم۔سعید کمپنی، ۱۹۶۰ء

۱۲۸۔ محمد طیب، قاری، تاریخ دارالعلوم دیوبند، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۲ء

۱۲۹۔ محمد میاں، مولانا، علماء اوران کے مجاہدانہ کارنامے، رحیم یار خان: مکتبہ شیخ الاسلام، س۔ ن۔

۱۳۰۔ محمد میاں، مولانا، علمائے حق، مرادآباد: کتب خانہ محمودیہ، ۱۹۴۶ء

۱۳۱۔ محمد میاں، مولانا، علمائے ہند کا شاندار ماضی، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۶ء

۱۳۲۔ مسعودی، انظر شاہ، نقش دوام، دیوبند: شاہ بکڈپو، ۱۳۹۰ھ

۱۳۳۔ ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، س۔ن۔

۱۳۴۔ ندوی، سید سلیمان، یاد رفتگان، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۳ء

۱۳۵۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، اسلام آباد: دارالمصنفین، ۱۹۵۲ء

۱۳۶۔ نوراللہ، سید، تاریخ تعلیم ہند، کراچی: ساؤتھ ایشین پبلشرز، ۱۹۷۳ء

نگارشاتِ علامہ کشمیری

۱۳۷۔ کشمیری، محمد انور شاہ، مشکلات القرآن مرتبہ داؤد اکبر اصلاحی مع مقدمہ از مولانا محمد یوسف بنوری، مالیگاؤں: علمی پریس، ۱۹۳۷ء
۱۳۸۔ کشمیری، محمد انور شاہ، اکفار الملحدین فی ضرورت الدین، کراچی: مجلس علمی، ۱۳۹۸ھ
۱۳۹۔ کشمیری، محمد انور شاہ، انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد مرتبہ مولانا محمد صدیق نجیب آبادی، دہلی: جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۷ء
۱۴۰۔ کشمیری، محمد انور شاہ، بسط الیدین لنیل الفرقدین، بجنور: مدینہ پریس، ۱۳۵۱ھ
۱۴۱۔ کشمیری، محمد انور شاہ، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح مع مقدمہ ومرتبہ از عبدالفتاح ابوغدہ، ملتان: مجلس تحفظ ختم نبوت، ۱۳۸۵ھ
۱۴۲۔ کشمیری، محمد انور شاہ، خاتم النبیین مترجمہ اردو از مولانا محمد یوسف لدھیانوی مع مقدمہ از مولانا محمد یوسف بنوری، ملتان: مجلس تحفظ ختم نبوت، ۱۳۹۷ھ
۱۴۳۔ کشمیری، محمد انور شاہ، خاتمہ الکتاب فی مسئلۃ ام الکتاب، دہلی: دارالعلوم پریس، ۱۳۲۰ھ
۱۴۴۔ کشمیری، محمد انور شاہ، ضرب الخاتم علی حدوث العالم، کراچی: مجلس علمی، ۱۳۹۲ھ
۱۴۵۔ کشمیری، محمد انور شاہ، العرف الشذی علی جامع الترمذی مرتبہ مولانا محمد چراغ، دیوبند: مکتبۂ رحمانیہ، ۱۳۴۹ھ
۱۴۶۔ کشمیری، محمد انور شاہ، عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام مع مقدمہ از محمد یوسف بنوری، کراچی: مجلس علمی، ۱۳۸۰ھ
۱۴۷۔ کشمیری، محمد انور شاہ، فصل الخطاب فی مسئلۃ اُم الکتاب، دہلی: ہلالی سٹیم پریس، ۱۳۴۷ھ
۱۴۸۔ کشمیری، محمد انور شاہ، فیض الباری علی صحیح البخاری مرتبہ مولانا محمد بدر عالم میرٹھی مع مقدمہ مولانا محمد یوسف بنوری، لاہور: المطبعۃ الاسلامیہ، ۱۳۹۸ھ
۱۴۹۔ کشمیری، محمد انور شاہ، کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر، دہلی: محبوب المطابع، ۱۳۵۲ھ
۱۵۰۔ کشمیری، محمد انور شاہ، گنجینۂ اسرار، لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۹ء
۱۵۱۔ کشمیری، محمد انور شاہ، مرقاۃ الطارم لحدوث العالم، بجنور: مدینہ پریس، ۱۳۵۱ھ

اقبالیات

۱۵۲۔ چشتی، یوسف سلیم، شرح ارمغان حجاز، دہلی: پبلشنگ ہاوس، ۱۹۷۲ء
۱۵۳۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر اقبال اور کشمیر، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء
۱۵۴۔ عطاء اللہ، شیخ، اقبال نامہ، لاہور: 1951ء
۱۵۵۔ قدوسی، اعجاز الحق، اقبال اور علمائے پاک و ہند، لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۱۹۷۷ء
۱۵۶۔ قرشی، افضل حق، اقبال کے ممدوح علماء۔ لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء
۱۵۷۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، ارمغان حجاز، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۷۸ء
۱۵۸۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، پیام مشرق، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۷۸ء
۱۵۹۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، ضرب کلیم، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۷۷ء
۱۶۰۔ ندوی، ابوالحسن علی، روائع اقبال، دمشق دار الفکر الغربی، ۱۹۶۰ء

مختلفات

۱۶۱۔ ابن الندیم، الفہرست، مصر: المکتبہ التجارتہ، ۱۳۴۸ھ
۱۶۲۔ اختر حسین، فیصلہ مقدمہ بہاول پور، سیالکوٹ: محفل ارشادیہ، ۱۹۷۳ء
۱۶۳۔ اولیری، ڈی، فلسفہ اسلام مترجمہ اردو از احسان احمد، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۶ء
۱۶۴۔ البستانی بطرس، دائرۃ المعارف، تہران: مؤسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان، ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء
۱۶۵۔ زبیر احمد، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ مترجمہ اردو از شاہد حسین لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۳ء
۱۶۶۔ زکی مبارک، الدکتور، الاخلاق عند الغزالی، مصر: المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۹۲۴ء
۱۶۷۔ جلبانی، غلام حسین، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، حیدر آباد دکن: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۷۵ء
۱۶۸۔ سالک، عبد المجید، مسلم ثقافت ہندوستان میں لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۷ء
۱۶۹۔ سکرودروی، محمد ادریس، شرح صلاح النقاب من جساستہ الفنجاب، الانور دیوبند: مطبع قاسمی، ۱۳۴۳ھ

۱۷۰۔ سکسینہ، بابورام، تاریخ اردو ادب (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری) ۔لکھنؤ: اشاعت دوم، س۔ن۔
۱۷۱۔ شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، حیدرآباد سندھ: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء
۱۷۲۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ (اردو ترجمہ از عبدالخالق حقانی) کراچی: قرآن محل، ۱۹۸۳ء
۱۷۳۔ عبداللہ حیدری، علماء دیوبند اور اردو ادب، دیوبند: مطبع قاسمی، س۔ن۔
۱۷۴۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک لاہور: مجلس اشاعت قرآن، ۱۹۷۶ء
۱۷۵۔ گیلانی، مناظر احسن، الدین القیم، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۳۷ء
۱۷۶۔ مجدد الف ثانی، احمد سرہندی، مکتوبات دفتر اول لاہور: نور کمپنی، س۔ن
۱۷۷۔ محمد ابراہیم، صوفی، خزینۂ معرفت، شرقپور: مکتبہ حضرت میاں صاحب، س۔ن۔
۱۷۸۔ محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی افکار لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۷۹ء
۱۷۹۔ محمد عبداللہ، مولانا، بارگاہ رسالت اور بزرگان دیوبند، بھکر: سیرت کمیٹی، ۱۳۹۱ھ
۱۸۰۔ محمد عیسیٰ، ملفوظات وکمالات اشرفیہ، کراچی: مکتبہ تھانوی، س۔ن۔
۱۸۱۔ محمد کریم بخش، جزاء الاحسان، لاہور: مکلیگن پریس، ۱۳۵۲ھ
۱۸۲۔ مقریزی، تقی الدین علامہ، کتاب الخطط، مصر: مطبعۃ النیل، ۱۳۲۶ھ
۱۸۳۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، آئینہ حقیقت نما، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۵۸ء
۱۸۴۔ نفیس الحسینی، سید، حکایت مہر و وفا، لاہور: انجمن ارشاد المسلمین، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء
۱۸۵۔ وجدی، محمد فرید دائرۃ المعارف، مصر: (ازہر) دائرۃ المعارف القرآن العشرین، ۱۳۸۶ھ
۱۸۶۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، مرتبہ دانش گاہ پنجاب، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء
۱۸۷۔ تجلیات انور (مجموعہ مقالات یوم انور) سری نگر: آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف، ۱۹۷۹ء
۱۸۸۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند عربی ادب ۱۲۷۱ تا ۱۹۷۲ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء
۱۸۹۔ روئداد آسٹریلین مسجد (قلمی) لاہور: ۳۳۔۱۹۳۰ء
۱۹۰۔ روئداد مدرسہ امینیہ، دہلی: ۱۳۱۵ھ
۱۹۱۔ فتویٰ تکفیر قادیان، مظفر گڑھ: مصطفائی پریس، ۱۳۳۶ھ

۱۹۲۔ اشتہار دارالکتب ڈابھیل، جید برقی پریس، ۱۳۵۰ھ

مضامین و مقالات

۱۔ آروری، شمس تبریز خان، مولانا انور شاہ کشمیری کے افکار و خیالات، دارالعلوم، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۷ء، دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۶۷ء

۲۔ انوری، محمد مولانا، محدث عصر انور شاہ کی باتیں، الحق رجب المرجب ۱۳۹۷ھ/نومبر ۱۹۶۷ء

۳۔ کمالات انوری، دارالعلوم جولائی، اگست، نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء

۴۔ بخاری، محمد فاروق ڈاکٹر، علوم عقلیہ میں مولانا انور شاہ کشمیری کی بصیرت برھان، مئی، جون ۱۹۸۱ء، دہلی: ماہنامہ برھان، ۱۹۸۱ء

۵۔ چشتی، عبدالحلیم، امام العصر علامہ انور شاہ، معارف، ستمبر ۱۹۶۷ء، اعظم گڑھ: ماہنامہ معارف، ۱۹۶۷ء

۶۔ دہلوی، احمد سعید، آج ہم نے مکمل لائبریری کو سپرد خاک کر دیا، دارالعلوم جولائی ۱۹۶۶ء دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۶۶ء

۷۔ صدیقی، بختیار حسین، برصغیر کے اسلامی مدارس اور معاشرے پر ان کے اثرات، دارالعلوم مئی ۱۹۷۰ء، دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۷۰ء

۸۔ غلام محمد، اسلامی درس گاہیں المعارف جنوری ۱۹۸۰ء، لاہور: ماہنامہ المعارف ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۶ء

۹۔ کشمیری، محمد انور شاہ، حقیقت عید، الحق، مارچ ۱۹۶۶ء، اکوڑہ خٹک: ماہنامہ الحق، ۱۹۶۶ء

۱۰۔ مربعہ نعتیہ شاعری انوار العلوم، دسمبر ۱۹۵۲ء، لاہور: ماہنامہ انوار العلوم جامعہ اشرفیہ، ۱۹۵۲ء

۱۱۔ مرثیہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم، دارالعلوم، نومبر ۱۹۶۵ء، دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۶۵ء

۱۲۔ کفایت اللہ، مفتی، مشاہیر دیوبند، بینات، مارچ ۱۹۶۷ء، ماہنامہ بینات، ۱۹۶۷ء

۱۳۔ گیلانی، مناظر احسن، احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، دارالعلوم، اگست ۱۹۵۲ء، دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۵۲ء

۱۴۔ لدھیانوی، عبدالواسع، حضرت انور شاہ کشمیری دارالعلوم، مارچ ۱۹۶۱ء

۱۵۔ لدھیانوی ، محمد یوسف، اردو ترجمہ مقدمہ عقیدۃ الاسلام، بینات ، ربیع الثانی تا شعبان المعظم ۱۳۸۷ھ، کراچی :ماہنامہ بینات،۱۳۸۷ھ

۱۶۔ محمد شفیع، مفتی، حضرت علامہ انور شاہ اور فتنۂ قادیانیت، دارالعلوم، جولائی ۱۹۵۳ء دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم،۱۹۵۳ء

۱۷۔ ندوی، سید سلیمان، مقالات، ہندوستان میں علم حدیث، معارف اکتوبر یا دسمبر، ۱۹۲۸ء، اعظم گڑھ : ماہنامہ معارف، ۱۹۲۸ء

۱۸۔ نسیم احمد، مفتی، ہندوستان میں علم حدیث انیسویں، بیسویں صدی میں برھان مئی ۱۹۸۱ء، دہلی: ماہنامہ برھان، ۱۹۸۱ء

۱۹۔ نعمانی، محمد منظور، حضرت انور شاہ، الفرقان، ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ، لکھنؤ: ماہنامہ الفرقان، ۱۳۷۳ھ

۲۰۔ واصف، حفیظ الرحمان، مولانا انور شاہ صاحب، البلاغ تعلیمی نمبر، ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء بمبئی: ماہنامہ البلاغ، ۱۹۵۵ء

۲۱۔ حضرت مفتی صاحب اور شاہ صاحب، دارالعلوم، اگست ۱۹۶۶ء، دیوبند: ماہنامہ دارالعلوم، ۱۹۶۶ء

جرائد و مجلّات

۱۔ الابقاء، مواعظ مولانا تھانوی، اگست، کراچی: مکتبہ تھانوی، ۱۹۸۴ء

۲۔ الرشید، دارالعلوم دیوبند نمبر، صفر ربیع الاول ۱۳۹۶ھ، ساہیوال، ماہنامہ الرشید۔

۳۔ مدنی اور اقبال نمبر، شوال، ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ، ساہیوال، ماہنامہ الرشید۔

۴۔ بینات، علامہ بنوری نمبر، محرم الحرام تا ربیع الاول ۱۳۹۸ھ، کراچی، ماہنامہ بینات

۵۔ الجامعہ، شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ، جامعہ محمدی جھنگ، ماہنامہ الجامعہ۔

۶۔ القاسم، ضمیمہ، شعبان المعظم ۱۳۴۶ھ دیوبند، ماہنامہ القاسم۔

۶۔۷۔ القاسم، ضمیمہ، شعبان المعظم ۱۳۴۶ھ دیوبند، ماہنامہ القاسم۔

۸۔ قومی ڈائجسٹ، قادیانیت نمبر، جولائی ۱۹۷۴ء، لاہور، ماہنامہ قومی ڈائجسٹ

۹۔ استقلال، دسمبر ۱۹۳۶ء دیوبند، ہفتہ وار استقلال ۱۹۳۶ء

۱۰۔ الہلال، ۱۹۸۱ء لاہور، الہلال اکیڈمی ۱۹۸۱ء

۱۱۔ مہاجر، ۲۵؍جمادی الاخری ۱۳۴۶ھ، دیوبند، ہفتہ وار مہاجر ۱۹۲۶ء
۴؍رجب ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۹؍دسمبر ۱۹۲۷ء دیوبند، ہفتہ وار مہاجر ۱۹۲۷ء
۱۳؍رجب ۱۳۴۶ھ مطابق ۷؍جنوری ۱۹۲۸ء دیوبند، ہفتہ وار مہاجر ۱۹۲۸ء
۲۳؍قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۴؍مئی ۱۹۲۸ء دیوبند، ہفتہ وار مہاجر ۱۹۲۸ء
سلطان العلوم نمبر ۳؍اگست ۱۹۲۸ء

۱۲۔ الداعی (عربی) مارچ؍اپریل ۱۹۸۰ء، دیوبند، پندرہ روزہ الداعی۔

۱۳۔ نقوش، شخصیات نمبر، مدیر محمد طفیل، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء

۱۴۔ سہ روزہ ہمدرد، ۱۴؍جنوری ۱۹۲۸ء دہلی، ۱۹۲۸ء

۱۵۔ الجمعیۃ، ۲۹؍شعبان ۱۳۵۱ھ/۲۱ دسمبر ۱۹۳۳ء دہلی، الجمعیۃ۔ ۱۹۳۳ء

۱۶۔ انقلاب، ۲۶؍دسمبر ۱۹۲۷ء لاہور، روزنامہ انقلاب، ۱۹۲۷ء

۱۷۔ تعبیر، ۲۶؍نومبر ۱۹۶۳ء، راولپنڈی، روزنامہ تعبیر

۱۸۔ الجمعیۃ، دارالعلوم دیوبند نمبر، ۲۶؍مارچ ۱۹۸۰ء، دہلی روزنامہ الجمعیۃ۔

۱۹۔ زمیندار، ۹؍رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ، لاہور، روزنامہ زمیندار ۱۳۴۵ھ

انٹرویوز

مذکورہ بالا کتابی مصادر کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں اور متعلقین میں سے ابھی بہت سے حضرات باحیات ہیں جن میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کر کے بالمشافہ معلومات حاصل کی ہیں جو مقالہ ہٰذا میں اپنے اپنے مقام پر درج ہیں۔ اب ان مصادر کے نام، پتہ اور ملاقات کی تاریخ ذیل میں لکھی جاتی ہے:

۱۔ مولانا محمد طاسین، ناظم مجلس علمی کراچی جولائی ۱۹۸۱ء

۲۔ مولانا محمد عبداللہ ملتانی، سینئر گریڈ خطیب محکمہ اوقاف لاہور، ۸/ اگست ۱۹۸۲ء

۳۔ مولانا محمد نافع، جامعہ محمدی شریف جھنگ، ۲۷/ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

۴۔ مولانا احمد رضا بجنوری
(مولانا موصوف ان دنوں پاکستان آئے تھے) جامعہ مدنیہ لاہور دسمبر ۱۹۸۱ء

۵۔ قاری محمد طیب قاسمی

(قاری صاحب بھی اس سال لاہور آئے تھے) سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند ، جامعہ اشرفیہ لاہور، دسمبر ۱۹۸۰ء

۶۔ حافظ سید محمد نعمان، سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹/ اگست ۱۹۸۱ء۔ نعمان منزل، ۱۱۔ دلکش پارک، لاہور۔

۷۔ مکتوب مولانا محمد چراغ، مہتمم جامعہ اسلامیہ، گوجرانوالہ ۷/ اکتوبر ۱۹۸۱ء

ENGLISH BOOKS

1	Ambedkar, B.R.	Thouthts on Pakistan	Bombay, 1941
2	Arnold, Sir, Thomas W.	Preaching of Islam	Lahore, 1956
3	Bolts, William	Consideration on Indian Affairs	London, 1775
4	Bogart, E.I. & Kemmerer, D.L.	Economic History of the American People	New York, 1930
5	Elliot, Sir Henry, M.&Dowson, John	The History of India as told by its own Historians	London, 1867
6	Henry, J. Pricep	Amirood Daoylah Muhammad Amir Khan	Calcutta, 1832

7	Hunter, W.W.	Our Indian Musalmans	Calcutta, 1945
8	Ishtiaq Hussain Qureshi	The Administration of the Sultanate of Delhi	Karachi, 1958
9	khan Qadir Hussain	South Indian Musalmans	Madras, 1910
10	Marshman, Johan Clark	Abridgement of the History of India	Serampur, 1873
11	Muir, Sir William	The Muhammadan, Controversy and other Indian Articles	Edinburgh, 1897
12	Nelson, J.H.	The Madura, Country	Madras, 1868
13	Russel, William Howard	My Indian Mutiny Diary	London, 1957
14	Savarkor, V.D.	The Indian War of Independence	London, 1909
15	Sen, Sorendar, Nath	Eighteen Fifty seven	Delhi, 1952
16	Sharp, H.	Selections from Educational, Record	Calcutta, 1920

17	Saleeman	Rambles and Recollections	London, 1840
18	Smith, R. Bosworth	Lifeof Lord Lawrence	Serampur, 1873
19	Temple Sir, Richard	Men and Events of my Time in India	London, 1934
20	Thompson, Edward & Garatt, G.T.	Rise and Fullfilment of Britsh Rule in India	London, 1934
21	Thorton, Edward	History of British India	London, 1843
22	Wilson, Horace Hayman	History of British India	London, 1858
23	Yousaf Ali	A Cultural History of India during the British Period	Bombay, 1940
24		District Census Report Sargodha	P.1-11-December, 1961